مارچ 2021
کرن
www.pklibrary.com

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 840/- روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 18,000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ——— 20,500 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

واٹس ایپ

0317 2266944

کرن کتاب

مارچ 2021

جلد 42 شمارہ 12

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

سال کا وہ دن، جس سے کوئی خوشی وابستہ ہو، وہ ہماری یادداشت میں محفوظ رہتا ہے۔ ہر سال جب وہ دن اور مہینہ آتا ہے تو دل میں خوشی کا احساس ابھرتا ہے۔ اگر یہ خوشی صرف اپنی ذات تک محدود ہو تو صرف ایک خوش گوار احساس ہوتا ہے لیکن اس خوشی سے بہت سارے لوگوں کی خوشیاں وابستہ ہوں تو اس کا رنگ ہی اور ہوتا ہے۔ کامیابی، سرشاری اور طمانیت......

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ کرن نے ایک اور سال کی مسافت کامیابی کے ساتھ طے کرلی ہے۔

چار دہائیاں پہلے ایسا ہی موسم بہار تھا جب بہاروں کے سارے رنگ سمیٹے کرن کا پہلا شمارہ آیا تھا۔

محمود ریاض صاحب نے خواتین ڈائجسٹ کے بعد کرن کا اجرا کیا تو اس وقت خواتین کے کئی پرچے شائع ہو رہے تھے اور وہ قارئین میں مقبول بھی تھے۔ ان پرچوں کے درمیان ایک نئے پرچے کے لیے اپنی جگہ بنانا آسان نہیں تھا لیکن محمود بابر فیصل کی کاوشوں سے کرن نے بہت جلد اپنی جگہ بنالی۔

کرن کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس نے نئی لکھنے والیوں کو متعارف کرایا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ آج وہ مصنفین جو ایک نمایاں مقام اور شناخت رکھتی ہیں، انہوں نے اپنے تحریری سفر کا آغاز کرن سے ہی کیا تھا۔

آج کرن کامیابی کے جس مقام پر ہے، اس میں بہت سارے لوگوں کی محنتیں اور کاوشیں شامل ہیں۔ ہم اپنی مصنفین کے ممنون ہیں، ان کی بہترین تحریروں سے کرن کو ایک منفرد مقام ملا۔

محمود ریاض صاحب، محمود بابر فیصل اور ہماری بہت سی مصنفین جو اب اس دنیا میں نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

ہم قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا۔ کرن ان کا پرچہ ہے اور اس کی کامیابی پر وہ بجا طور پر مبارک باد کی حق دار ہیں۔

مارچ کے مہینے سے ایک اور تابناک دن کی یاد وابستہ ہے۔ 23 مارچ 1940ء وہ تاریخی دن جب قرارداد پاکستان پیش کی گئی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ اس نظریہ کی سچائی کی گواہی بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات ہیں۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے، آمین۔

اس شمارے میں

☆ ''موسم یاد کا کوئی جھونکا'' کرن کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے دلچسپ سوالات۔

☆ اداکارہ ''حبا عزیز ناگی'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''۔ ☆ اس ماہ مسکان نور کے ''مقابل ہے آئینہ''۔

☆ ''دامن سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول۔ ☆ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا''۔

''رنگ خوب صورت ہے'' نگہت سیما کا مکمل ناول۔ ☆ فرح بخاری کے مکمل ناول ''کنار خواب جو'' کی آخری قسط۔

☆ ''جنہیں راستے میں خبر ہوئی'' نازیہ کنول نازی کا ناولٹ۔

☆ منعم ملک کا ناولٹ ''اسی کلینیکس خراب''۔ ☆ ''کاش'' ام ہانی کا ناولٹ۔

☆ میمونہ صدف، عندلیب زہرا، ام اقصیٰ، عذرا فردوس، فہمیدہ فرید خان، تہمینہ عباسی اور نور شال کی افسانے اور مستقل سلسلے۔

☆ ''کرن کتاب'' کا خصوصی شمارہ۔ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر شاہین رشید کا سروے۔

رنگ، خوشبو، صبا اور ہوا روشنی
میرے اللہ کی ہے عطا روشنی

میری مٹی کو وہ جس نے کندن کیا
وہ مرا مہربان وہ سدا روشنی

میری مشکل کو آسان جس نے کیا
ورد تھا یا حکیم کا یا روشنی

شکر کرنے کی توفیق ہو جائے گر
مجھ کو سب میں بھی مالک دکھا روشنی

یہ کرم ہے ترا کہ ہوئی نامود
اپنی رحمت سے گل کی بڑھا روشنی

سباس گل

وہ وقت کہ جب جاگی محبت سینے میں
سر جھکایا تو ہے دیکھا دل تو تھا مدینے میں

اے کاتبِ تقدیر جبیں پہ لکھ دے میری
ماح و مجتبیٰؐ ہو مسفر لحد میں

سر جاؤ ہیں مومن گستاخ نبیؐ سن لے
باقی ہے جہاں جب تک عاشق رسولؐ ہیں اس میں

خاک تو ہوں، سیاہ کار بھی ہوں، ہو نگاہ کرم
کچھ نہ بچے گا ورنہ زندگی کے سفینے میں

کیا خزینے، کیا نگینے، کیا مدفن ہو رہے زد
ٹپک پڑے جو آنسو عشقِ نبیؐ میں

اور ان آنسوؤں کو حقیر نہ سمجھو اے بندو
سدرۃ المنتہیٰ کا مقام ہے اس میں

راؤ سمیرا ایاز

موسمِ یاد کا کوئی جھونکا

ادارہ

کبھی یادیں، کبھی باتیں، کبھی پچھلی ملاقاتیں
بہت کچھ یاد آتا ہے تیرے اک یاد آنے سے

بقول اے حمید کے
"جس طرح پھول مرجھا جاتا ہے مگر اس کی خوشبو نہیں مرجھاتی اسی طرح یادیں بھی زندہ ہیں۔"
خوش گوار یادیں انسان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہ یادیں انمول ہوتی ہیں۔ اور یادوں میں ماضی کے گزرے لمحے صدیاں بن جاتے ہیں اور وہ صدیاں ماضی کے ان ہی دریچوں میں روشن دیوں کی طرح ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔
جب بھی تنہائی میں آپ گزرے وقت کو سوچنے بیٹھیں تو کچھ خاص لمحے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔
کرن کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے قارئین سے انہی گزرے لمحات سے متعلق کچھ سوال کیے ہیں۔ آیے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

دل میں امنگ ار ارادہ کوئی تو ہو
بے کیف زندگی میں تماشا کوئی تو ہو

1۔ کیا آپ سالگرہ مناتی ہیں یا تقریب، بہر ملاقات کے لیے دوستوں، رشتہ داروں کو مدعو کرتی ہیں؟
2۔ اپنی یا اپنی کسی دوست کی سالگرہ کا احوال، جس کو آپ بھول نہیں پائیں۔ اس کا مینو کیا تھا یہ بھی بتایے؟
3۔ اس سال آپ کو کرن کی کون سی تحریر پسند آئی۔ آپ اپنی پسندیدہ مصنفہ کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟
4۔ "کرن" کی وہ کون سی تحریریں جو آپ کو ہمیشہ یاد رہیں گی؟

بشریٰ یامین ملک...... دریا خان ضلع بھکر
1۔ جی میں سالگرہ مناتی ہوں۔ کیک کھلا کر سب سے گفٹ وصولتی ہوں۔ گھر میں عاصمہ لازمی گفٹ دیتی ہے گروپ فیلوز میں جو عزت سے دے تو ٹھیک ورنہ ذلیل وخوار کر کے اور شرم دلا دلا کر نکلوا لیتی ہوں ہاہاہا۔ پچھلی سالگرہ پہ عاصمہ نے مجھے کیک، باڈی اسپرے اور سلور ایئر رنگز گفٹ کیے تھے۔ آمنہ اور ثوبیہ تو ہیں ہی بے شرم (گفٹ جو نہیں دیتیں) محمد علی میرا لاڈلا، اکلوتا بھائی، اس نے مجھے گولڈ کے ٹاپس اینڈ واکس گفٹ کیے تھے۔ ثوبیہ منور نے بلیک اور اسکن کھسے، بلیک ٹی مگ اور پرفیوم گفٹ کیا تھا

انشاء نے لڑیوں والے ایئر رنگز اور عیشاء فاطمہ نے ریڈ کلر کی ڈائری گفٹ کی تھی۔ باقی لوگ کالج بند ہونے کی وجہ سے بچ گئے تھے (آخر کب تک؟ نکلوانے تو ہیں میں نے) ویسے میں نے ٹریٹ بھی دینی ہے (ہائے میرے پیسے میں رکھے۔ نوٹ کانپنے اور ڈانسنے (مطلب ناچنے) شروع ہو چکے ہیں جب کالج والی فرینڈز سے گھر پر ملنے کو دل چاہے تو انہیں مدعو کر لیتی ہوں۔ بہت یادگار اور مزیدار ہوتا ہے وہ دن، رشتہ دار تو آتے ہی رہتے ہیں۔ الحمدللہ، جو نہیں آتے انہیں شادیوں پہ بلا لیتے ہیں ہاہاہا۔

2۔ میری سالگرہ کا احوال، جب میں سیونتھ کلاس میں تھی (یہ بات پانچ سال پرانی ہے) تو ہوا کچھ یوں کہ کلاس روم میں اطلاع آئی بشریٰ یامین ملک کی سسٹرز آئی ہیں۔ کلاس انچارج نے کہا بھیج دیں انہیں کلاس میں "میری سسٹرز آمنہ اور ثوبیہ ہمراہ کیک کلاس روم میں انٹر ہوئیں اور ٹیچر کو بتایا "آج بشریٰ کی برتھ ڈے ہے اور یہ کیک اس کی کلاس فیلوز اور آپ کے لیے۔ ٹیچر نے مسکرا کر اور تھینک یو بول کر کیک لیا پھر سسٹرز کے جانے کے بعد وائٹ بورڈ پہ مارکر سے "ہیپی برتھ ڈے بشریٰ! اینڈ بیسٹ وشز فاریو" لکھا۔ پھر کیک کے پیسز کیے مجھے اور میری کلاس فیلوز کو دیے اور ایک پیس خود کھایا۔ سب لوگوں نے مجھے برتھ ڈے وش کیا میں اس وقت بہت خوش تھی ہمارے پرنسپل کی بیٹی نے مجھے پنک ٹشو فلا گفٹ کیا تھا یہ سالگرہ میرے لیے ناقابل فراموش ہے۔ یہ لکھنا تو بھول گئی کہ کیک میں نے کاٹا تھا۔ پیسز ٹیچر نے کیے تھے۔

دوسری سالگرہ کا احوال ہماری گروپ فیلو عیشاء فاطمہ کا لکھنا چاہوں گی جو میری فرینڈ بھی ہے۔ یہ سالگرہ ہم نے ڈیڑھ ماہ پہلے کالج میں منائی تھی۔ آپ لوگ جانتے تو ہوں گے کہ ایک فرینڈ کی ایسے موقع پر باقی فرینڈز کیا درگت بناتے ہیں، ایسا ہی ہوا ہم لوگوں نے فرمائشیں کرنا شروع کر دیں۔ سب سے آگے ثوبیہ تھی جو برگر سے کم پر آمادہ نہیں تھی۔ ہم گروپ فیلوز آٹھ ہیں مطلب آٹھ لڑکیوں پر مشتمل ایک گروپ ہے۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے فراخ دل عیشاء سوچ میں پڑ چکی تھی وہ اس لیے کیونکہ کینٹین والی آنٹی سے بول کر آرڈر پہ منگوانے سے ڈبل قیمت پے کرنا پڑتی، تازہ کی کوئی گارنٹی بھی نہیں تھی۔ اگر وہ صبح صبح آٹھ برگر تیار کروا کے لاتی تو کون صبح برگر بنا رہا ہوتا ہے۔ اس کی تاویلیں کوئی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے ثوبیہ کو شرم دلائی۔ "یار! اپنی طرف اور اپنے پیٹ کو دیکھنا بند کرو اور کوئی ایسی ڈش بتاؤ جو عیشاء گھر سے تیار کروا کر لا سکے۔" لیکن اس کا یہی جواب۔ "برگر یا پھر کچھ نہیں۔" عیشاء کا موڈ ہی آف ہو گیا اس نے حامی بھر لی اگلے دن ہم کالج آئے زنگر برگر و چلی گارلک ساس انجوائے کیا اور کوک کو بہت مس کیا۔ لیکن اظہار کرنے سے پرہیز بھی ورنہ عیشاء صحیح معنوں میں تپی ہو جاتی، ہاہاہا۔ یہ سالگرہ بہت یادگار ہے تھوڑی سی کڑوی اور بہت زیادہ میٹھی سی۔ اللہ تعالیٰ عیشاء کو ایسی بہت سی سالگرہ منانی نصیب کرے (آمین) اور ہمیں زنگر برگر ہاہاہا۔

3۔ اس سال مجھے کرن میں ساگر کنارے، جفت ساز، روپ کے شیدائی، بالو شے پھر اسی رہ گزر پر، آدم و حوا اور تیری راہ میری منزل" بہت پسند آئیں۔ سب سے پہلے میں مسکان احزم سے کہنا چاہتی ہوں کہ کوئی مزیدار ناول کرن کے لیے لکھیں پلیز......"ام طیفور" آپ بہت کیوٹ رائٹر ہیں (اور میں بھی بہت کیوٹ ہوں ہاہاہا) تو آپ اپنی کیوٹ سی ریڈر کے لیے پانچ چھ اقساط پر مشتمل مزاحیہ ناول لکھیں اور مجھے اپنی تعریف کرنے کا موقع دیں۔ منعم ملک! آپ صرف مجھ سے دو سال بڑی ہیں ایج میں آپ کا مشاہدہ، تحریر کی پختگی اور انداز تحریر سے بالکل نہیں لگتا کہ آپ محض بیس سالہ لڑکی ہیں بہت اعلیٰ اینڈ بیسٹ آف لک، ہمیشہ پہلے سے بڑھ کر زبردست لکھنے کا مشن جاری رکھیے گا۔ نگہت سیما! آپ کئی سالوں سے لکھ رہی ہیں لیکن......بہترین لکھ رہی ہیں۔ میں نے آپ کو بہت کم پڑھا ہے لیکن پھر بھی آپ کی فین ہوں۔ ایمل رضا! آپ ہر ٹاپک کی گہرائی میں جا کر یہ ثابت کر دیتی ہیں کہ آپ بہت منجھی ہوئی رائٹر ہیں آپ کو بھی بہت کم پڑھا لیکن کیا خوب لکھتی ہیں آپ۔ حزل سلیم! آپ بہت اچھی حس مزاح کی مالکہ ہیں ہمارے لیے ہمیشہ مزاح لکھتی رہیے گا کیونکہ کسی کو ہنسانا بہت بڑی بات ہے۔ ام اقصیٰ! آپ بہت اچھی افسانہ نگار ہیں۔ میمونہ صدف! وہ

دن دور نہیں جب ریڈرز آپ کا نام رسالے میں دیکھ کر رسالہ خریدنے پر مجبور ہو جایا کریں گے اور ہر خط میں آپ کی کہانی پر کمنٹ ہوا کرے گا۔ سدرۃ المنتہیٰ جیلانی! میں جانتی ہوں دل توڑنا بہت بری بات ہے لیکن ...... آپ کو جب بھی پڑھنا شروع کرتی ہوں بے تحاشا بوریت محسوس ہوتی ہے اور میں وہ کہانی مکمل نہیں کر پاتی پلیز اپنے انداز تحریر میں دلچسپی پیدا کریں۔ اگر آپ کو برا لگے تو کان پکڑ کر ابھی سوری کر لیتی ہوں ایم سوری سدرہ آسیہ مرزا! آپ بہت حقیقت پسند لگی ہیں مجھے، آپ کا انداز تحریر بہت پیارا اور دل موہ لینے والا ہے بالکل آپ کی طرح (اور میری طرح بھی ہاہاہا) بھئی مذاق کرنا میری عادت ہے برا مت مانیے گا۔

4۔ کرن کی وہ تمام تحریریں مجھے یاد رہیں گی جن کا ذکر میں نے سوال نمبر تین کے جواب میں دیا ہے۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

1۔ میں اپنی سالگرہ نہیں مناتی۔ اور نہ ہی ایسی کوئی تقریب آئی کہ دوستوں رشتے داروں کو مدعو کروں۔ ویسے چھوٹی موٹی خوشیوں کو سلیبریٹ کرنا چاہئیں۔ میں ذرا سڑی ہوئی ہوں۔ (ہاہاہا)۔ اس لیے تقریبات سے چڑ ہے۔ مطلب ہلا گلہ نہیں پسند۔ ہمہ وقت کتابوں میں سر دیے رکھنا زیادہ پسند ہے۔ سالگرہ منانے کے لیے جو خرچا ہوگا اس سے زیادہ اچھا یہ نہیں کہ ان پیسوں کا ناول لے کر پڑھ لوں؟ بتایئے گا ضرور۔

2۔ اپنی سالگرہ کا احوال یاد ہے اور سناتی بھی ہوں۔ (بی۔ ایس آنرز) کے تیسرے سمسٹر میں سب دوستوں نے سرپرائز دیا تھا مجھے۔ 20 نومبر کو مجھے کہا کہ نے بالوں کا اچھا سا اسٹائل بنا کر آنا ہے، پیچھے سے بال کھول کر آنا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگلے دن 21 نومبر ہے تو یہ لوگ کچھ کریں گی۔ میرے بال لمبے ہیں اور ہمارے گروپ میں موجود سب کی کمزوری (ہاہاہا) مطلب ان سب کو بہت پسند تھے میرے بال۔ ایک دو کلاس لینے کے بعد سب لوگ غائب ہو گئیں۔ میں بھی ساتھ ہی جانے لگی تھی مجھے سب کہتیں تم ادھر ہی رکو کلاس میں۔ ہم لوگ چار پانچ لڑکیاں ہیں، فروا، عمارہ، رضیہ، ثمرین سب کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی تھیں اور ردا آئی۔ ٹی ڈپارٹمنٹ کی۔ ردا آئی میرے پاس کہتی چلو فلاں روم میں اور کہتی تھوڑی لپ اسٹک بھی لگا لو (ہاہاہا) میں نے کہا پاگل ہو گئی ہو۔ کہتی لگاؤ۔ جب ہم روم میں داخل ہوئے۔ تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اتنا انتظام۔ دروازہ کھولا تو اوپر سے پھول گرے اندر غبارے ہی غبارے اور پھول ہی پھول۔ پھر سب نے کیک کھلایا گفٹ دیے۔ وہ دن آج بھی نہیں بھولتا۔ پہلی دفعہ اور آخری دفعہ منائی تھی سالگرہ۔ (سو بہت مزا آیا) مینو میں بریانی، رشین سلاد، شوارما، کوک، قلفہ (عمارہ بہت مزے کا قلفہ بنایا تھا آپ کی ماما نے) اور گفٹ بھی سب کے بہت پیارے تھے۔ ایک دفعہ پھر آپ لوگوں کا بھرپور شکریہ۔ وہ دن یادگار تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ (ردا تمہیں شادی کی بہت مبارکباد)

3۔ اس سال کرن کی بہت ساری تحریریں ایسی ہیں جو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ میرا خیال ہے (3) اور (4) کا جواب ایک ساتھ ہی دے دوں۔ آپ کیا کہتی ہیں؟ 'شام رنگ سیاہ، ساگر کنارے، کنار خواب جو، کچھ لمحے ہم پر قرض تھے سدرہ حیات۔ ہوائیں رخ بدل گئیں، میرے ہم نفس میرے ہم نوا، روپ کے شیدائی، ہجر اشارہ رہ جاتا ہے، بالو شے یہ سب کہانیاں اس سال بہت پسند آئیں اور ایمل رضا پسندیدہ مصنفہ ہیں ان سے ملاقات ضرور کرنا چاہوں گی اور ان کے نام پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ہمیشہ ان کا مثبت استعمال کیجیے گا اور اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ترقی دے۔ ڈان ایڈم جیسا ایک اور ناول لے کر جلدی سے آجائیں اور مجھے بھی اپنی شاگردی میں لے لیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے کوئی چھوٹا موٹا افسانہ لکھنے کو۔ دماغ میں آئیڈیاز بہت ہیں بس لکھنا نہیں آتا۔ بتایئے ضرور شاگردی میں لے رہیں ہیں یا نہیں؟

4۔ کرن کی وہ کہانیاں جو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ایسی بہت سی کہانیاں ہیں نام لکھنے بیٹھوں تو صفحات بھر جائیں۔ ساگر کنارے شام رنگ سیاہ، ہوائیں رخ بدل گئیں۔ میرے ہم نفس میرے ہم نوا۔ بالو شے، روپ کے شیدائی، یہ تحریر مجھے مدتوں یاد رہے گی۔ بہت بہت اچھا

لکھا ہے منعم ملک نے بہت زیادہ۔ تعریف کے لیے الفاظ کم۔ (کانچ سے سائبان) ہائم اور روداب بھی ایسے کردار ہیں جو انمٹ نقوش چھوڑ گئے ذہن پر۔ کنار خواب جو...... یہ ہیں اس سال کی وہ تحریریں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔

فہمیدہ جاوید......ملتان

1۔ میں نے اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی اور سچ کہوں تو ابھی بھی مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں کب اور کون سے مہینے میں پیدا ہوئی تھی۔ دراصل ہمارے بچپن کے دنوں میں یعنی 1980ء کے وقت سالگرہ کا اتنا رواج نہ تھا۔ ہمارے گھر یا رشتہ داروں میں اور ہم گھر والوں میں سے اس کے متعلق کسی کو کوئی علم نہ ہوتا تھا کہ کب جنم دن ہے اور اس طرح نہ ہی دوستوں سے اس موضوع پر بات ہوتی تھی نہ کوئی تقریب ہوتی تھی۔ کبھی سوچ ہی نہیں آئی یہ سالگرہ بھی ہوتی ہے۔ وہ تو اب شادی کے بعد یعنی 1997ء کے بعد پتا چلا سال آ کر سالگرہ بھی مناتے ہیں لوگ۔ مگر مجھے شروع ہی سے دلچسپی نہیں تھی اس میں تو میری تو سالگرہ ابھی تک نہ ہوئی نہ میں نے کبھی خواہش کی۔ ہاں یہ ایک یاد ہے کہ ابو مجھے کبھی ایک روپے کا سکہ دیتے تھے تو وہ دن خوشی کا موج و مستی کا دن ہوتا تھا اور کبھی ابو کوئی پسندیدہ چیز لا کر دیتے اور کہتے تھے کہ ''چل لے فہمیدہ۔ آج تو اتنے سال کی ہوگئی'' تو بس ابو کو شاید معلوم ہوتا ہو مگر اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا اور نہ میری خواہش تھی۔ ہاں اب بڑا بیٹا جنید ماشاء اللہ ہر میری خوشی کا خیال رکھتا ہے (خدا کرے اچھا لیکچرار بنے کہ یونیورسٹی میں ٹیچنگ کی فیلڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بڑا محنتی اور خیال رکھتا ہے میرا تو۔ پڑھائی کے ساتھ کمپیوٹر جاب بھی کرتا ہے تو وہ کچھ عرصے سے وہ گھر میں سب کی سالگرہ پر کیک لاتا ہے۔ تقریب ابھی تک ہوئی نہیں مگر بیٹے نے کہا ہے کہ کچھ ٹائم بعد آپ اور پیا کی ویڈنگ اینی ورسری کی تقریب کریں گے۔ اور میں خوش ہو جاتی ہوں۔ میرے خیال سے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہمیں (مختصر کر کے) منانی چاہئیں کہ یہ محبت بھرے خوشیوں والے لمحے یادگار رہ جاتے ہیں اور جب یاد کرتے ہیں تو ہمارے چہروں پر مسکراہٹ کی وجہ بن جاتے ہیں۔

2۔ پیاری بہنوں میری سالگرہ تو ہوئی نہیں ابھی تک اور ہاں دوستوں کی بھی اس دور میں سالگرہ نہیں ہوئی تو کوئی احوال نہیں ہے میرے دماغ کے کسی بھی کونے میں۔ ہاں، اس ''پانی والے کیک'' کا ذکر کروں گی کہ بیٹی جیا کی سالگرہ پر جنید کیک لایا پائن ایپل والا اچھا اور مہنگا اور فریج میں کیک کو لا کر رکھ دیا۔ جولائی کا مہینہ تھا اور لائٹ چلی گئی تو فریج کی چھت سے جمی ہوئی برف اتنی ساری پگھل کر کیک پر گر گئی اور کیک پانی والا بن گیا مگر پھر بھی ہم نے اسی کیک سے جیا کی سالگرہ کی اور پھر کیک کو نچوڑ نچوڑ کر کھایا کہ پانی بھرا ہوا تھا مگر پھر بھی ٹیسٹ آیا تھا زیادہ فرق نہ پڑا تھا ہاہاہا۔ اب میری سالگرہ ہوئی تو اگلے سال سناؤں گی احوال کرن والیوں کو اہم اہم۔

3۔ ویسے تو کرن کی تمام تحریریں اچھی رہی ہیں اور تمام ہی ذوق و شوق سے پڑھیں مگر نگہت جی کا ناول ہوائیں رخ بدل گئیں، نگہت سیما کی جنت ساز...... میں پیٹی میں سے 2020ء کے کرن لا کر دیکھ کر بتاتی ہوں ایک منٹ...... ہاں تو کنار خواب جو، اے مسیحا دل کے، صف دوستاں، ندامت، بالوشے، اف یہ موسم، چابی کی گڑیا، صفائی مہم، مہوا کا پیڑ، اپنے لوگ، جاہل، بیسن کی روٹی، غیر ضروری بچے، افسانہ، دیس میں نکلا چاند، مغرب کے بعد، رضیہ بٹ، سوز عشق، سیماب، انسان صفت، کردار اور نیلم پری، یہ تمام بہت زیادہ پسند آئے۔ ویسے تو بہت ساری ہیں پسندیدہ رائٹرز مگر نگہت سیما صاحبہ میری پسندیدہ ترین ہیں اور کرن کے توسط سے ان کو کہنا چاہوں گی کہ نگہت آپا آپ سے تحریروں کا ساتھ بڑا پرانا ہے ''مجھے یاد ہے ذرا ذرا'' میں آپ کی شرکت اور بچپن کی آپ کی تمام یادیں......وہ بھائیوں کو اپنے دوپٹے کی ساڑھی پہنا کر دوسرے بھائی سے شادی کروانا اور پہاڑی علاقے میں آپ کے بھائی کا آپ کے خراب بال بنانا ابھی تک تمام یاد ہیں وہ نگہت سیما۔ اب جلدی سے آپ کسی طویل قسط وار تاریخی ناول کے ساتھ آجاؤ اور آپ کی تمام تحریریں ہماری پسند ہیں۔ خدا آپ تمام رائٹرز کو آباد و شاد رکھے۔

4۔ نگہت عبداللہ، نگہت سیما اور آسیہ مرزا کے سلسلے وار ناولز، شام رنگ سیاہ، خالہ سالا اور اوپر والا، رمز حب، سیماب، مجبور نشین، کونج، نین تارا اور کوکب، بیلا، بالو شے، مجھے جینے کا حق دو، کردار اور بھی طویل لسٹ ہے خیر بہت یادگار تحریریں کرن ہر ماہ لانے کی کوشش کرتا ہے اور تحریریں ہمیں یاد بھی رہیں گی۔

صبا راجپوت ...... سدو جا سندھ

1۔ جی! سالگرہ تو ہر سال مناتی ہو الحمدللہ، ہر بار سوچتی ہو اس بار نہیں مناؤں گی پر بھائی کو یاد ہوتی ہے اور وہ اور بہن سب ارینج کر دیتی ہیں۔ نہیں ایسا کوئی سین نہیں ہے صرف گھر والے ہی ہوتے ہیں۔ بہن کی سالگرہ پر ایک مرتبہ سب محلے والے اور خاندان بھر کی دعوت کی سب نے کھا پی کر بعد میں کہا "ہمیں تو کچھ ملا ہی نہیں" تب سے بس خود سیلیبریٹ کرتے ہیں۔

2۔ میرا 18 برتھ ڈے میرے لیے خاص تھا۔ خاص کچھ تھا نہیں وہی عام دن کی طرح تھا۔ بھائی سمجھ رہے کیک ابو لے آئیں گے ادھر ابو سمجھ رہے تھے بھائی لائیں گے۔ دونوں ہی سمجھ نہیں پا رہے تھے کیک لا کون رہا ہے۔ ایک دوسرے کو بلا رہے تھے تم مت لانا میں لا رہا ہوں اور میں کھانا بنانے میں مصروف۔ پھر اسی فقیرنی والی حالت میں کیک کاٹا اور مجھے لگتا تھا 18 سال کے بڑے بڑے ہو جاتے ہیں زندگی ہی بدل جاتی ہے واقعی بدل گئی پہلے صرف پریشان ہوتی تھی اور اب ڈپریشن ہاہاہا۔ مینیو میں کیک تو ہوتا ہی ہے کڑاہی چرغہ، چکن شوارما، برگر......

3۔ اس سال تو آسیہ مرزا کا ناول پسند آیا اور آ رہا ہے 2020ء میں زیادہ پڑھ ہی نہیں پائی میری پسندیدہ رائیٹر سمیرا حمید ہیں جن کو کم پڑھا پر جو پڑھا وہ دل کو ہی نہیں بلکہ میری روح کو چھوتی ہیں۔ میں کیا بولوں اتنا کچھ ہے بولنے کو آپ مجھے بہت پسند ہو اتنا کہ اگر آپ لڑکا ہوتے تو میں آپ کو اللہ پاک سے مانگ لیتی۔ آپ مولانا جلال الدین اور شمس تبریز کے سول میٹ لگتے ہو۔ اللہ پاک کے لیے ویسا ہی لکھتی ہیں۔ روحانیت ہے آپ کے لفظوں میں اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ اللہ پاک کے لیے اسپیشل ہو۔ اب جلد آجائیں پلیز اینڈ آئی لو یو آپی۔

4۔ آئی تھنک مجبور نشیمن اور کسی اجنبی سے دیار میں ایک تو میں نے درمیان سے پڑھی، پر دونوں ہی بہت اچھی تھیں۔

حور العین اقبال ...... کراچی

1۔ شادی سے پہلے بہت ہی کم سالگرہ منائی شادی کے بعد دونوں برتھ ڈے میرے میاں نے سیلیبریٹ کیں پہلی سالگرہ بڑے جوش و خروش سے منانے کی تیاری تھی مگر وائے رے قسمت مجھے چکن پاکس نکل آئے اور میاں کا گفٹ کیا ہوا نیکلس بھی پہن کر نہ دیکھ سکی۔

2۔ 21 جنوری 2020ء منگل کے دن میری پیاری سی چھوٹی سی کزن مریم کی سولہویں سالگرہ تھی بلیک کلر کے اسکرٹ میں وہ خوب ہی چہکتی پھر رہی تھی اس کی مما (میری حنا آپی) نے بڑا مزے کا مینیو ترتیب دے رکھا تھا، فرائیڈ رائس ود شاشلک نگٹس، گولا کباب کولڈ ڈرنک کھانے کے ساتھ انصاف اور سب لوگوں کے ساتھ گپ شپ کرتے تقریب زبردست رہی۔ مگر کیا ہے کہ یاد رہ جانے کی وجہ بڑی تکلیف دہ ہے کیونکہ یہ ہماری چھوٹی سی مریم کی آخری سالگرہ ثابت ہوئی ٹھیک ڈیڑھ مہینے بعد وہ ہمارے ہاتھوں سے یوں چلی گئی کہ اب تک یقین نہیں آتا۔ مریم، فرخ ماموں، حنا آپی، نانی اماں، نورین مامی، افشین مامی اور تین شہزادوں کے ساتھ یہ ہماری آخری تقریب تھی۔ سالگرہ کے اختتام پر ماموں مجھے گھر چھوڑنے گئے تو میں نے ماموں سے کہا گھر چلیں چائے پلاتی ہوں کہنے لگے "نہیں۔ اگلی بار آؤں گا" مگر پھر وہ اس دنیا سے ہی چلے گئے۔

3۔ نومبر 2020ء کے شمارے میں شامل منعم ملک کا ناول "روپ کے شیدائی" بہترین ناول تھا شریعت کے خلاف چلنے والوں کے لیے ایک عبرت ناک سبق۔ پیغام بھی ہے کہ پیاری منعم ملک اسی طرح اچھے اچھے ناولز لکھتی رہیں۔

4۔ سعدیہ راجپوت کی "عشق آتش" بھلائے نہیں بھولتی کوئی جادو سا چھایا ہوا لگتا ہے اس کو پڑھ کر۔

شہرین اسلم ...... چوک شاہدرہ بہاولپور

1۔ کیا کہا سالگرہ مناتی ہوں! تو جناب بچپن میں تو کبھی نہیں منائی گئی سالگرہ کیونکہ ہمارے یہاں سالگرہ وغیرہ کا رواج نہیں تھا (مگر ماہ بدولت) جب سے بڑے ہوئے تو ہم نے خود نے منانی اسٹارٹ کردی مگر 2010ء سے باقاعدہ فرینڈ کے ساتھ سیلبریٹ کی۔ ہاں جی، مجھے اچھا لگتا ہے کوئی تقریب میلاد وغیرہ ہو سب دوست رشتہ دار اکٹھے ہوں۔

2۔ جناب کیا کچھ یاد آ گیا اس سوال سے ویسے تو ہر سالگرہ ہی یادگار ہے کیوں میری فرینڈز ساتھ ہوتی ہیں مگر 2011ء اور 2019ء کی سالگرہ یادگار ہیں۔ 2011ء میں جناب ہوا کچھ یوں کہ میری برتھ ڈے کا دن تھا اور کسی نے وش تک نہیں کیا۔ میں نے بھی غصے میں کسی کے سامنے کوئی ذکر نہیں کیا پورا دن ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے گزر گیا۔ شام میں میری سسٹر نے کہا کہ ساتھ ہمسائے میں آنٹی ہیں وہ بلا رہی ہیں۔ میں وہاں چلی گئی تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد مجھے بلوایا گیا روم کا دروازہ بند تھا جیسے ہی دروازہ کھولا خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ ماموں اور سسٹرز نے مل کر سرپرائز پلان کیا تھا ساتھ فرینڈز کو انوائٹ کیا تھا۔ خوشی خوشی کیک کٹنگ کیا ساتھ میں کسٹرڈ، چنا چاٹ، نمکو، کولڈ ڈرنک تھی، پارٹی اڑا کر فرینڈ کو رخصت کر کے بیٹھے تھے کہ میری اکلوتے انکل کیک سمیت حاضر۔ بس پھر کیا تھا جناب ہم تھے اس وقت ہواؤں میں۔ سسٹرز نے کھینچ کر اتارا کیونکہ سب نے کیک جو کھانا تھا۔ کبھی نہیں بھول سکتی میں یہ یادگار دن اور دوسری 2019ء کی برتھ ڈے ہے کیونکہ ہم سب فرینڈ ساتھ تھیں اور کوئی پیا دیس نہیں سدھاری تھی۔ بہت انجوائے کیا ہم نے مینو میں چکن بریانی، شامی کباب، دہی بڑے، کسٹرڈ، نمکو، چھالیہ کولڈ ڈرنک، کیک سسٹر نازش کی طرف سے گفٹ تھا گھر پر انجوائے کرنے کے بعد پھر ہم لوگ قریبی پارک گئے وہاں پھر سے کولڈ ڈرنک پی جھولے جھولے غرض بہت شاندار برتھ ڈے تھی کیونکہ فوزیہ، انعم، عاصمہ، بشریٰ، سعدیہ، آمنہ، شہیلا ہم سب ساتھ تھے۔ مگر اب انعم، فوزیہ، عاصمہ آپ لوگ اپنے سسرال ہو (تھینکس میری برتھ ڈے یادگار بنانے کے لیے) لو یو آل فرینڈز۔

3۔ کرن کی تمام تحریریں ہی تقریباً ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مگر "روپ کے شیدائی" بہت پسند آئی۔ اچھا میسج دیا مصنفہ نے آج کل کی نوجوان نسل کو۔ بوائے فرینڈ منگیتر کی محبت کچھ نہیں، اصل محبت نکاح کے بعد والی ہے۔ جو جائز اور شرعی ہے۔ "چونچ مارتے کوئے" اور بھی ہیں۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" اس وقت یہی یاد ہیں۔ "جس تن لاگے" افسانہ بھی پسند آیا۔ "دیس میں نکلا ہوگا" چاند قرۃ العین ہاشمی صاحبہ ویلڈن۔ مصباح علی سید، مصباح نوشین، نبیلہ عزیز، نبیلہ ابر راجہ، منعم ملک، جی فرزانہ کھرل صاحبہ آپ سب میری موسٹ فیوریٹ ہو۔ اللہ آپ کے قلم کو مزید ترقی دے۔ آپ ہمارے لیے اسی طرح سبق آموز اصلاحی ناول لکھتی رہیں جن رائٹرز کے نام یاد نہیں رہے (ان سے معذرت)۔

4۔ ساڈا چڑیاں دا چنبا، ساگر کنارے، کانچ سے سائبان، بیلا، روپ کے شیدائی، علیزے، دل آور، زری والی اسٹوری کا نام یاد نہیں آ رہا۔ غرض ایسی بہت سی تحریریں ناولز ہیں مگر اسپیشلی ان تحریروں کو میں نہیں بھولی ہمیشہ یاد رہیں گی۔

ساجدہ جاوید سندیلو ...... ٹنڈو محمد خان

(1) گھر پر پارٹی وغیرہ تو نہیں کرتے تھے مگر اسکولوں میں سب وش کرتے تھے تو ان کو پارٹی دینا تو بنتا میرا برتھ ڈے 30 جولائی ہے۔ اسکول کی لاسٹ چھٹیاں...... جیسے ہی اگست پر اسکول جاتی سب فرینڈز گفٹ لیے حاضر ہوتیں مگر میرے لیے تو ہر فرینڈ منہ کھولے بیٹھی رہتی کہ ساجدہ "ابرار الحق" کا نیا البم آیا ہے ٹریٹ دو۔

(2) میری بیسٹ فرینڈ "رابیل" کی سالگرہ ایک مرتبہ ہم سب فرینڈز نے مل کر منائی وہ بھی "رابیل" کو بنا بتائے۔ جب بھی رابیل کی سالگرہ ہوتی وہ کیک لے کر آتی۔ لیکن اس بار ہم ساری فرینڈ نے رابیل کو سرپرائز کیا تھا۔ مینو کیا تھا...... ہر دوست اپنے گھر سے کچھ بنا کر آئی تھی۔ کوئی چھولے، پکوڑے، نمکو، جوس، سموسے، دہی بھلے میں نے سب کو آئس کریم کھلائی۔ رابیل کی سالگرہ پر یہ فائدہ ہوا اس دن ہماری ٹیچر نے ہمیں سپورٹ

کیا کیونکہ وہ کلاس کی مانیٹر کے ساتھ ٹیچر کی بھی فیورٹ تھی۔

(3) یہ کیا لکھ دیا۔ کرن کی تو ساری رائٹرز لاجواب لکھتی ہیں۔ مگر میں یہ سوچ میں پڑ گئی۔ ام طیفور، ایمل رضا، فرح بخاری، مصباح علی سید، آسیہ مرزا، مہوش افتخار...... یار کس کس کا نام لکھوں، سب ہی بیسٹ رائٹر ہیں مگر کنفیوز ہو گئے۔ مگر جواب تو دینا پڑے گا......؟ یہ سب رائٹرز میری فیوریٹ ہیں۔ کسی کا دل بھی نہیں توڑ سکتی۔ ''او آپاں تسی گریٹ ہو، بلے بلے'' ہمیشہ ایسے ہی سب کا دل جیتتی رہنا۔ آپ لوگوں کی وجہ سے ہی پاکستان کا نام روشن ہے ایسے ہی سب کے دلوں پر راج کرنا۔

(4) سارے کرن لے کر بیٹھی ہوں۔ وہ تحریریں جو کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ وہ یہ ہیں۔ اوپر جو رائٹرز ہیں ان کی تحریروں کو چھوڑ کر یہ ''بابل، کردار، سدرہ آن ڈیٹ، ہوائیں رخ بدل گئیں، آپو، ندامت شناسائی، پریت بدلے ریت، تیری دیدی میری عید، جس تن لاگے، دیس میں نکلا ہوگا چاند، ماں جی، سوز عشق، ہوئے جو تم مہرباں، دادا، پوتی اور وہ، مہوا کا پٹر، جفت ساز، پھول کھلنے لگے، ہیں راہوں میں، حماقت، راہ دشوار سہی'' وغیرہ وغیرہ۔ یار کرن والوں! اس بار کافی مشکل میں ڈالا ہے قارئین کو۔

صفیہ مہر...... رحیم یار خان

1۔ میں ویسے سالگرہ دل سے منانے کی قائل نہیں لیکن زمانے کی بدلتی رت نے ہمیں بھی کافی تبدیل کیا۔ اب جب میری سالگرہ ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کاش میں بھی اہتمام کر سکتی، دراصل ہمارے ہاں باقاعدہ سالگرہ منانے کا رواج نہیں لیکن بھانجیوں اور بھتیجیوں کی سالگرہ دل سے مناتی ہوں۔ خوشی سے شرکت کرتی ہوں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو مدعو کرنا مجھے بہت پسند ہے۔ میں زندہ دل لڑکی ہوں۔ ہلا گلا پسند ہے مجھے۔ ہمارا ننھیال کافی دور ہے ہم سے، تو اکثر سب خالاؤں اور خالا زاد چچا زاد کزنوں کو مدعو کر کے تقریبات کے علاوہ بھی خوش ہوتی ہوں اور اپنے گھر۔ زندگی بھی خوشی کا نام ہے اور بھی خوشی رشتہ داروں اور دوستوں کے سنگ ہی ملتی ہے۔

2۔ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ سالگرہ نہیں مناتی تو میری دوستیں بھی سالگرہ منانے سے محروم رہتی ہیں (گاؤں میں ایسے چونچلے کم لوگ کرتے ہیں) لیکن اپنی اکلوتی بھتیجی کی سالگرہ کا احوال لکھ رہی ہوں۔ 15 سال کی عمر میں خود اس نے کہا، میں چاہے کچھ بھی ہو سالگرہ کا اہتمام کر کے رہوں گی۔ بھابھی اس کی ضد سے ہار گئیں تو ہمارے چھوٹے والے بھائی شہیر اس کا کیک لے کر آئے' ساتھ ہی ہم بہن بھائیوں کے کمبائن گفٹ بھی اسے دینے کو (پیاری سینری تھی جواب تک اس کے کمرے میں آویزاں ہے) تو شام کو بھابھی نے سب کو انوائٹ کیا، ہمیں اور بھتیجی کے ننھیال والوں کو (جو ہمارے تایا کا خاندان ہے) سب بن سنور کر پہنچ گئے۔ بھتیجی پیاری سی فراک میں خوشی سے کھلتی بہت پیاری لگ رہی تھی (اللہ اسے ایسے تاعمر خوش رکھے) ہم نے اسے گلے لگایا، کیک تیار تھا بس ہمارا ہی انتظار تھا۔ کیک والی میز کے گرد سب جمع ہو گئے۔ بھتیجی نے ہنستے ہوئے کیک کاٹا۔ ہم سب نے ہپی برتھ ڈے ٹو یو گا کر تالیاں بجائیں۔ پھر قطار میں سب کو کیک کھلایا، بہت انجوائے کیا ہم نے۔ بعد میں بھابھی نے مینو میں بریانی، ٹھنڈی کوک آخر میں میٹھے میں کھویا والا زردہ اور چائے کا اہتمام عمدہ طریقے سے کیا۔ سب خاندان والوں کے ساتھ مل کر بیٹھ کر مزا آیا۔ اب ہر سال اس کی سالگرہ کا سب اہتمام کرتے ہیں۔ دراصل بھتیجے بہت ہیں لیکن بھتیجی اکلوتی ہونے کی بنا پر سب کو بے حد پیاری ہے۔ ہر بار اس کی سالگرہ یاد بن جاتی ہے۔

3۔ مجھے اس سال کرن میں جو تحریر پسند آئی ''ساگر کنارے'' ام طیفور کی تھی لیکن ایمل رضا کی ''شام رنگ سیاہ'' بھی دل کے تار چھو لینے والی تحریر تھی۔ دونوں مجھے پسند تھیں۔ ''ایمل رضا'' میں یہ کہوں گی پلیز ''ایمل جی' شام رنگ سیاہ میں جبران کو نہیں مارتے اتنا اچھا انسان مرنے کے لیے تھوڑی ہوتا ہے۔ پھر دوسرا پیغام سمیرا احمد کو دوں گی پلیز سمیرا جی، اپنی تحریروں کے سنگ جلدی جلدی انٹری دیا کریں۔''

4۔ ویسے کرن اکثر دلچسپ اور اصلاحی تحریریں دیتا رہتا ہے مگر جو ہمارے ذہن کے کینوس پر ہمیشہ یاد رہیں گی

وہ پہلی تحریر ہے سعدیہ راجپوت کی ''عشق آتش'' کرن سے متعارف کا سبب بھی یہی تحریر تھی اور بہت دلعزیز اسٹوری تھی اس کے بعد نبیلہ عزیز کی ''دردل'' تا عمر یاد رہنے والی اسٹوری ہے۔ پھر تنزیلہ ریاض کی ''رلینزل'' ایک مختلف تحریر لگی، پھر میری پسندیدہ اور یاد رہنے والی ایک اور تحریر ہے ''مجھورنشیمن'' مصباح علی سید کی تحریر ہے۔ ''کرن میرا پسندیدہ رسالہ ہے اس کی روایت ہے کہ یہ ہمیں ہر سال دل پر نقش رہنے والی تحریر عطا کر جاتا ہے۔ تھینک یو کرن، ہمارے ذہنوں کو اپنی کرنوں سے ایسے منور کرتے رہنا۔''

زرتاشیہ نعمان......ملتان

کیجیے دعوت کہ بہانہ ہے ملاقات کا
ہو ٹرائفل بریانی اور ساتھ تڑکا کباب کا

جی...... جناب مجھے دعوتیں کرنے کا بہت شوق ہے۔ کبھی سارا کھانا خود ہی بناتی ہوں اور گھر والوں یا سہیلیوں کی دعوت کرتی ہوں۔ کبھی ون ڈش کا پروگرام بنتا ہے تو ہر سہیلی کے ذمے ایک ڈش ہوتی ہے اور پھر کسی ایک کے گھر مل بیٹھتے ہیں...... مگر اس کورونا نے یہ سب فی الحال خواب ہی کر دیا ہے۔ اللہ کرم کرے اور اس وباء کا خاتمہ ہو جائے۔ آمین۔

2۔ ''جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے
سب نے یہ شور مچایا ہے
سالگرہ کا دن آیا ہے''

اف...... آپ کے اس سوال سے مجھے اپنی بچپن کی وہ تمام سالگرہ یاد آ گئیں جو میری امی ہم بہنوں کی بڑے ذوق و شوق سے منایا کرتی تھیں۔ امی خود ہی سب کو سالگرہ کی دعوت کے سندیسے دیتیں لینڈ لائن پہ، جن میں فیملی فرینڈز، اسکول کی سہیلیاں، کچھ ہمسائے بھی مدعو ہوتے تھے۔ سالگرہ کا مینو...... کیک، دہی بڑے، پکوڑے، فروٹ چاٹ اور خاص آنٹی والے سموسوں کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہماری ایک آنٹی تھیں خیر سے ابھی بھی ہیں۔ ان کے گھر کے پاس سموسے بہت مزے کے ملتے تھے تو ہر سالگرہ پہ سموسے وہ لاتی تھیں۔ خوب ہلا، گلا ہوتا تھا۔ خوب سارے گفٹس ملتے تھے۔ اللہ پاک میری امی کو سلامت رکھے کہ ہم سب بہنوں کی خوشیاں ان کی دعاؤں سے وابستہ ہیں (آمین)۔

3۔ گلدستہ گل دے کر احباب پوچھتے ہیں
بتاؤ ذرا دیکھ کر کون سی کلی حسین ہے

بڑا ہی مشکل سوال ہے یہ...... یقین مانیں ''ماہنامہ کرن'' کی کوئی نہ کوئی تحریر ہر ماہ دل میں گھر کر جاتی ہے۔ مگر آپ نے سوال پوچھا ہے تو جواب تو دینا ہوگا۔ اس سال کی میری پسندیدہ تحریر ایک نہیں، دو ہیں اور دونوں ہی ''منعم ملک'' کی ہیں۔ فروری 2020 میں شائع ہونے والا مکمل ناول ''پھر اسی راہ گزر پر'' اور دوسرا ناولٹ اس کلے میں خواب'' یہ جولائی 2020 میں شائع ہوا تھا۔ ''منعم ملک'' کو پڑھا تو وہ میری پسندیدہ رائٹر کی فہرست میں بھی شامل ہو گئیں۔ ان کو بس یہ پیغام دینا چاہوں گی کہ ''جناب آپ جب بھی لکھتی ہیں، کمال لکھتی ہیں۔ اللہ آپ کو مزید لکھتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ ''ماہنامہ کرن'' کو اپنی تحاریر سے چار چاند لگاتی رہیں (آمین) اینڈ...... ''بیسٹ آف لک''

4۔ ''کنار خواب جو'' جب یہ ناول اختتام پذیر ہوگا تو یقیناً یہ مجھے یاد رہے گا۔ ''منعم ملک'' کا ناول ''روپ کے شیدائی''۔

بشریٰ رضوان...... چوک شاہدرہ بہاولپور

1۔ جی ہاں مناتی ہوں۔ ہماری ساری فیملی اپنی برتھ ڈے اور اپنے بچوں کی برتھ ڈے لازمی سیلیبریٹ کرتے ہیں، اینیورسری بھی۔ یہ موقع ہوتا ہے سب مل کر آپس میں گفتگو کریں، ٹائم نکال کر چھوٹی بڑی خوشیاں منائیں کیونکہ آج کل زندگی بڑوں سمیت بچوں کی بھی بہت مصروف ہو گئی۔ درس قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ سب کو بلاتے ہیں، دوستوں رشتے داروں کو تاکہ آپس میں سب کچھ خوشیاں اور خوش گوار گھنٹے ساتھ گزار سکیں ورنہ آج کی مصروف زندگی میں کسی کے پاس ٹائم نہیں ہوتا ملنے کا یا ایک دوسرے کے گھر جانے کا۔ ہم ہی نہیں سب لوگ شاید تقریب میں ایک دوسرے سے ملنے کی امید لے کر جاتے ہیں کہ فلاں کزن کو دیکھے کافی ٹائم ہوا، شادی کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوگی تو اس بہانے وہاں مل لیں

گے۔ حال احوال معلوم کرلیں گے پھر پتا نہیں ملنا ہو یا نہ ہو کیونکہ آج کل زندگی کا بھی اعتبار نہیں، کب ساتھ چھوڑ جائے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اچھی یادوں کا سبب بنتی ہیں۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں کب موت آئے۔

2۔ اپنی سالگرہ بہت اچھے سے یاد ہے۔ ویسے سب دوست سالگرہ مناتی ہیں۔ ہم اکٹھے ہو کر تحائف دینا لینا ہوتا رہتا ہے۔ اپنی یہ سالگرہ اس لیے یاد ہے کہ یہ میرے چاچو نے سیلیبریٹ کی تھی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کو جنت میں اعلا مقام نصیب فرمائے، آمین۔ اٹھارہ مارچ رات گیارہ بجنے پر امی نے مجھے اٹھایا کیونکہ میں سو رہی تھی۔ جلدی سونے کی عادی ہوں اور صبح جلدی جاگتی ہوں، اس لیے سونا بھی جلدی پڑتا ہے۔ امی نے جگایا اور کہا کہ تایا ابو بلا رہے ہیں۔ بیٹھک میں چلو، میں گئی تو لائٹ بند تھی۔ اچانک لائٹ جلائی چاچو اور چاچی نے کہا کہ ہیپی برتھ ڈے۔ باقی سب بھی موجود تھے۔ کیک کاٹا پھر سب کو کھلایا، سب نے گفٹ بھی دیے۔ سسٹرز نے چوڑیاں گفٹ کیں، چھوٹی پھپھو نے ایئر رنگ دیے۔ چاچو اور چاچی نے بریسلٹ گفٹ کیا۔ بڑے چاچو اور چاچی نے پیسے دیے اور تائی امی اور تایا ابو نے بھی پیسے دیے۔ امی نے سوٹ گفٹ کیا، اس طرح رات دیر سے سوئی۔ پھر اگلے دن انیس مارچ میری سالگرہ کے دن میں اسکول سے گھر گئی تو امی نے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ بریانی، قورمہ، چنا چاٹ، دہی بھلے، کولڈ ڈرنک، کیک اور کسٹرڈ تھا۔ میری فرینڈز آئیں۔ کلثوم نے سوٹ گفٹ کیا۔ وہ ہر سال مجھے سوٹ ہی گفٹ کرتی ہے۔ شہرین نے مگ گفٹ کیا، بہت ہی خوب صورت تھا۔ آمنہ نے اسٹالر گفٹ کیا۔ سارہ، مہوش، نائلہ نے ڈیکوریشن پیس گفٹ کیا۔ نازش نے باڈی اسپرے دیا۔ میری چھوٹی کزن ارم اینڈ ایشال نے چاکلیٹ گفٹ کیں۔ اچھے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا، سب نے انجوائے کیا۔ میم اور حمیرا نے آکر سرپرائز دیا۔ گفٹ میں میم نے سوٹ اور حمیرا نے رنگ دیا۔ اس کے بعد کرن آئی، اچانک اتنی خوشی ہوئی اس کا آنا ہی کسی تحفہ سے کم نہیں مگر اس نے اتنی خوب صورت شال گفٹ کی، رات دس بجے وہ آئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کھانا کھایا کیونکہ وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ میں اس کے لیے اداس تھی۔ خان پور شادی ہوئی ہے اس کی۔ امید نہیں تھی کہ آئے گی میری برتھ ڈے پر مگر آگئی، خوشی ہوئی یوں اس دن کا اہتمام بہت زبردست تھا۔

3۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں، شام رنگ سیاہ، ساگر کنارے، بیلا، کانچ سے سائباں“ یہ سب بہت پسند آئے اور سمیرا جی کے لیے پیغام یہ ہے کہ پلیز اچھے سے سبق آموز ناول کے ہمراہ انٹری دیں، انتظار ہے۔ ایمل رضا جی آپ بھی کوئی ناول شروع کردیں۔ منشا محسن سے درخواست ہے کہ مصروف زندگی سے تھوڑا وقت نکال کر ”بیلا“ جیسا ایک ناول لکھ دیجیے۔ قسط وار۔ باقی آپ سب کے لیے دعائیں۔

4۔ ”چونچ مارتے کوے، آخری کنارے پر، بابل، ملن سے ذرا پہلے، چورنی، اژدھے اور ایک کا نام ذہن میں نہیں آرہا مگر کہانی پوری یاد ہے۔ جذب، حنبل ذکاء، روائبہ، ایشال اذلان والا یہ موسٹ فیورٹ تھے اور یاد بھی ہیں اور رہیں گے۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

1۔ آسان سا جواب ہے آج تک بھی سالگرہ نہیں منائی دوستوں رشتہ داروں کو مدعو کرنے کا کیا سوال ہے۔

2۔ ہم اس زمانے کی پیداوار ہیں جب یہ چونچلے نہیں ہوتے تھے۔ اپنی کسی دوست کا تو نہیں لیکن اپنی ایک کولیگ کے بھتیجے کی نئی سالگرہ ہم نے اٹینڈ کی ہیں۔ وہ رمضان کے آخری عشرے میں اسلامی تاریخ کے حساب سے سالگرہ مناتی تھیں۔ سب روزہ دار ہوتے تھے، رمضان شریف میں تقریبات کم ہوئی ہیں۔ سب شوق سے اس سالگرہ کا انتظار کرتے تھے۔ سب باوضو عصر کے ٹائم پہنچ جاتے، تھوڑی سی گپ شپ کے بعد مغرب ہوتی، روزہ کھل جاتا۔ پہلے ایک ٹیبل روزہ داروں کے لیے لگتی۔ کھجوریں، شربت وغیرہ سے روزہ افطار کیا جاتا تھا پھر ایک کمرے میں جائے نمازیں بچھا کر سب نماز مغرب ادا کرتے فارغ ہو کر بوفے سسٹم میں سالگرہ کے لوازمات لگا دیے جاتے۔ چنا چاٹ، فروٹ، گول گپے، دہی بلے،

فروٹ چاٹ، برفی، رس گلے، گلاب جامن......اس کے بعد پلاؤ اور روٹی سالن، قورمہ بھی ہوتا تھا اور سب چیزیں وافر مقدار میں ہوتی تھیں۔ بچے کی مووی بنتی، تحفے تحائف دیے جاتے۔ بڑا سا کیک کاٹا جاتا یعنی کے شاندار فنکشن ہوتا، مزا آجاتا تھا۔ اب ماشاء اللہ وہ بچہ جوان ہوگیا تو وہ سلسلہ منسوخ ہوگیا۔ ایک اور سالگرہ یادگار تھی جو کہ میرے کزن بہنوئی کی منائی گئی۔ تقریباً وہ ستر سال کے بزرگ تھے، ایک بار ان کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ انہوں نے بطور مذاق کہا کہ ہماری تو کوئی سالگرہ نہیں مناتا، بس جی بہو، بیٹے، بیٹیاں سب سالگرہ منانے کے لیے سیریس ہوگئے۔ چند ماہ بعد ان کا یوم پیدائش تھا۔ سب زور شور سے تیاریوں میں مصروف ہوگئے، وہ منع بھی کرتے رہے کہ صرف مذاق تھا۔ بھاری بھرکم کیک تیار کروایا گیا۔ ستر موم بتیاں لی گئیں، ٹیبل سجائی گئی، ایک دیگ چاولوں کی پکوائی۔ دوسرے تمام لوازمات جو سالگرہ میں ہوتے ہیں، وہ تیار کیے گئے۔ پکوڑے، سموسے، دہی بھلے، فروٹ چاٹ سب چیزیں سیٹ کر کے تمام فیملی اکٹھی ہوگئی اور ابا جان کو بلا کر کیک کٹوایا گیا۔ خوب تالیاں بجائیں، خوب ہلا گلا کیا۔ وہ بزرگ بھی بچوں کی خوشی میں خوش ہوکر ہنستے مسکراتے اور بچوں کو دعائیں دیتے رہے۔ پھر بہو بیٹوں، بیٹیوں نے انہیں کپڑے جوڑے دیگر چیزیں گفٹ کیں۔ اس پیاری سالگرہ میں ہم بھی شامل تھے۔ سب نے سوچا ان شاء اللہ آئندہ بھی یہ خوشی کا دن منائیں گے لیکن افسوس وہ دن آنے سے پہلے وہ راہی ملک عدم ہوگئے۔

3۔ کرن پڑھتے مدتوں ہوگئیں۔ کئی تحریریں تھیں جو دل کو چھو گئیں۔ تینوں رسالے پڑھتے ہیں بعض دفعہ یہ بھول جاتا ہے یہ کہانی کس رسالے میں شائع ہوئی تھی لیکن دل کے نہاں خانے میں رہتی ہے۔ فرح بھٹو کی "اے مسیحا دل کے" کے بعد شبانہ شوکت کی "عزم وفا"۔ ایمل رضا کی "شام رنگ سیاہ" مدتوں یاد رہیں گی۔ قرۃ العین سکندر کا "ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے" پسندیدہ ترین کہانی ہے۔ پسندیدہ مصنفہ کی زمرے میں تو کئی آتی ہیں ان کو پیغام کیا بلکہ دعا دیتی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اور

پیغام یہ دینا ہے، آپ کی شادیاں ہوجائیں، گھر بسائیں خوش رہیں لیکن ہمیں نہ بھول جائیں۔

4۔ کافی عرصہ تک تحریریں یاد رہتی ہیں پھر جیسے جیسے ماہ وسال گزرتے ہیں۔ نئی نئی تحریریں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

اقصیٰ شہزادی......ڈھوک اعوان سکھر، بلال آباد

1۔ ہماری زندگی میں تو اتنی چپ ہے کہ لگتا ہی نہیں زندگی کا ہے بھی کہ نہیں۔ اور سالگرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ میرے بھائی جیلی تو اس جہاں میں خوش رکھے۔ میں بھائی کو کہتی کہ میری سالگرہ آنے والی ہے تو کوئی تحفہ دینا۔ ایسے ہی سالگرہ گزر جاتی ہے اور کوئی وش بھی نہیں کرتا۔ تو میرا بھائی کہتا کہ ہاں صرف تمہاری ہی سالگرہ آتی ہے۔ میری تو کبھی آئی ہی نہیں۔ مجھے وش کرتی ہو کبھی۔ آہ وہ ہی دن اچھے تھے۔

2۔ ہم نہ اپنی سالگرہ مناتے ہیں اور نہ کسی دوست کی سالگرہ کا واقعہ یاد ہے۔ ہاں پہلی دفعہ اپنی دوست اقرا کو وش کیا تھا رسالے کے ذریعے۔

3۔ یہ سال اتنا برا گزرا ہے کیا بتاؤں؟ کورونا کی وجہ سے مہینوں کے رسالے ہی نہیں ملے۔ لیکن جو لیے ہیں ان کے بتاتی ہوں۔ "کچھ لمحے ہم پر قرض تھے۔" جنوری 2020 میں یہ کہانی بہت اچھی لگی اس کی رائٹر سدرہ حیات بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سادہ لفظوں میں ان کی ہر کہانی ہی مجھے اچھی لگتی ہے۔ سدرہ آپ ہر مہینے کرن میں کچھ نہ کچھ لکھا کریں اور پلیز ایک مکمل ناول بھی لکھیں "کنار خواب جو" ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ فرح بخاری آپ یونہی اچھا اچھا لکھتی رہیں۔ اللہ آپ کو ہر قدم پر کامیابیاں دیں۔ آمین۔ 2019 میں "ساگر کنارے" اور "شام رنگ سیاہ" بہت خوب صورت ناول تھے مجھے یہ کبھی نہیں بھولیں گے۔ ام طیفور پلیز کچھ اور بھی لکھیں کرن کے لیے۔ آپ کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ مزاح سے بھرپور، بندہ کچھ دیر کے لیے ہر غم بھول جاتا ہے۔

4۔ کرن کی کئی ایسی کہانیاں ہیں جو کبھی نہیں بھولیں گی۔ "جادو بستی" ایمل رضا کی یہ کہانی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کے علاوہ "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا یہ

ناولٹ بھی کبھی نہیں بھولے گا۔ "ساگر کنارے" بہت اچھا ناول تھا۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں "شام رنگ سیاہ، کنار خواب جو" مصباح علی سید کا ناول تھا۔ نام نہیں یاد آرہا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ہیں۔ کرن سارے کا سارا ہی بیسٹ ہوتا ہے۔

ثناء شہزاد...... کراچی

1۔ میں سالگرہ نہایت سادہ طریقے سے مناتی ہوں۔ بس بھائی کیک لے آتے ہیں۔ امی گھر میں بریانی بنا لیتی ہیں اور سب گھر والے گفٹ دے دیتے ہیں اور اس طرح میں اپنی سالگرہ ہر سال سیلیبریٹ کرتی ہوں۔ کسی کو خاص طور پر انوائٹ نہیں کرتی اور نہ ہی کسی دوست کو بلاتی ہوں۔ بس ایک نوشین ہے، جو میری سالگرہ پر بہت کچھ کرنا چاہتی ہے۔

2۔ اپنی ایک سالگرہ پر میں نے خوب اہتمام کیا تھا اور اس سالگرہ پر اپنی پھپھو، تائی، چاچیوں کو انوائٹ بھی کیا تھا۔ اس دوران میری دو کزنز کی شادی بھی ہوئی تھی۔ انہیں بھی ہم نے انوائٹ کیا تھا اور میری وہ دونوں کزنز میرے لیے گفٹ کے ساتھ ساتھ برتھ ڈے کیک بھی لائی تھیں۔ اور برتھ ڈے کے مینوں میں وہی کچھ تھا جو عموماً ہوتا ہے۔ نمکو، کولڈ ڈرنک، چائے اور کھانے میں بریانی، قورمہ کباب، سلاد رائتہ تھا۔ وہ برتھ ڈے میں ابھی تک نہیں بھولی، سب نے مجھے بہت پیارے پیارے گفٹ دیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک برتھ ڈے ابھی دو سال پہلے بہت یادگار گزری۔ تب ہوا کچھ یوں کہ ایک کیک تو میرے بھائی نے پہلے سے لا کر فریج میں رکھ دیا تھا اور ایک کیک میرے ماموں اور کزنز میرے لیے لائی تھیں۔ رات بارہ بجے سے پہلے اچانک خرم ممانی، عظیم ممانی، ہانی شہوار اور ماہ نور نے آکر مجھے سرپرائز دیا اور میں نے دو دو کیک ایک ساتھ کاٹے، بہت زیادہ مزا آیا تھا اچانک کی تو خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔

3۔ کرن میں جتنی بھی کہانیاں شائع ہوتی ہیں مجھے سب ہی بہت اچھی لگتی ہیں کیونکہ ان کہانیوں میں مقصد واضح ہوتا ہے۔ بہت کم کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو مجھے پسند نہ آئیں۔ آپ لوگ سب میرے تبصرے پڑھتی ہیں ہر کہانی کی میں تعریف ہی کرتی ہوں اور کچھ کہانیاں تو ایسی ہوتی ہیں دل سے بے ساختہ واہ واہ، بہت زبردست، کمال لاجواب...... جیسے الفاظ نکلتے ہیں اور وہ کہانیاں سالوں ہمارے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں۔ پچھلے سال کی بھی تقریباً سب ہی کہانیاں بہت اچھی تھیں جن میں سے کچھ کے نام میں بتا دیتی ہوں۔ "کچھ لمحے ہم پر قرض تھے" سدرہ حیات کا اور "بادلوں کے سائے" عنبرین ولی کا "پھر اسی راہ گزر پر" منعم ملک کی اور "نازک آبگینہ ہوں میں" نظیر فاطمہ۔ "زندگی یہ سفر میں ہے" میمونہ صدف "پیکر وفا" صدف آصف وہ نگہت سیما کا ناول "جفت ساز" صدف ریحان گیلانی کا "اے دل بے خبر" اور نوشین فیاض کا "پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں"، "شناسائی" سدرۃ المنتہیٰ۔ فرح بھٹو "اے مسیحا دل"۔ "بالوشے" منعم ملک۔ "پریت بدلے ریت" گل ارباب۔ "تیری راہ ہے میری منزل" مسکان احزم، قرۃ العین سکندر کی "ہجرا اثاثہ رہ جاتا ہے" اور "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" فوزیہ احسان رانا۔ اکتوبر میں "دیس میں نکلا ہوگا چاند" قرۃ العین خرم ہاشمی "سوز عشق" کوثر ناز۔ نومبر میں "روپ کے شیدائی" منعم ملک اور "بچھڑنا بھی ضروری تھا" عطیہ خالد کی "میرے چارہ گر" نوشین فیاض اور "جو گاہک پھولوں جیسا ہو" شبانہ شوکت کی۔ لیجیے جناب ہم نے پورے ایک سال کے کرن نکال کے آپ کو اپنی پسندیدہ کہانیاں بتا دیں۔ افسانے بھی بہت سارے بہت اچھے لگے مگر میرا جواب بہت لمبا ہو جائے گا اگر میں افسانوں کا لکھنے بیٹھ گئی۔

4۔ کرن کی یہ کچھ کہانیاں ہیں جو مجھے بہت پسند آئیں اور میں چاہتی ہوں یہ سب ایسی ہی اچھی اچھی کہانیاں ہمارے لیے لکھتی رہیں۔ تیسرے سوال کے جواب میں میں نے جن رائٹرز کی کہانیوں کو پسند کیا ہے وہ سب میری فیورٹ مصنفہ ہیں اور چاہتی ہوں وہ سب اسی طرح ہمارے ذوق کی تسکین کا ذریعہ بنی رہیں۔

اس کے علاوہ ساگر کنارے ام طیفور، میرے ہم نفس میرے ہم نوا، آسیہ مرزا، کنار خواب جو فرح بخاری، ہوائیں رخ بدل گئیں نگہت عبداللہ، کانچ سے سائبان مصباح علی سید۔

☆☆

سالگرہ نمبر

میری بھی سنیئے

حبا عزیز ناگی

شاہین رشید

1 ''میرا نام؟''
''حبہ عزیز ناگی...... ناگی ہماری کاسٹ ہے۔''
2 ''میں پیدا ہوئی؟''
''7 فروری 1991ء میں اور میری مادری زبان اردو ہے۔ اور میرا ستارہ ''دلو'' ہے۔''
3 ''بہن بھائی / آپ کا نمبر؟''
''میں آپ کو بتاؤں کہ ہم گھر میں کل سات افراد ہیں۔ میرے والد محترم کا انتقال ہو چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں انہیں اپنی فیملی سے الگ نہیں کرتی، کیونکہ وہ ہر وقت مجھے لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ ویسے ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر دوسرا ہے۔ تین چھوٹے بھائی ہیں اور ایک بڑی بہن ہیں۔''
4 ''تعلیم؟''
''میں نے اے سی سی اے کیا ہے...... یقیناً آپ کا اگلا سوال ہوگا کہ شادی ہوئی کہ نہیں تو میں ہی اس کا جواب دے دیتی ہوں کہ ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔''
5 ''میں اکثر سوچتی ہوں کہ؟''
''جب میں چھوٹی تھی تو سب پیار کے بہت سے ناموں سے پکارتے تھے...... مگر اب صرف لوگ ''حبہ'' ہی کہتے ہیں۔''
6 ''میں بننا تو چاہتی تھی؟''
''پینٹر یا پائلٹ۔ مگر بن گئی آرٹسٹ۔ چلو آرٹسٹ تو ہوں، بھلے پینٹر نہیں تو کیا اداکارہ تو ہوں جو ہر روپ دھار کر ناظرین کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔''

7 ''شوبز میں کیسے آئی؟''
''بالکل اتفاقیہ...... میرے بہت سے احباب کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں مگر مجھے کیمرے کے آگے کام ملا...... جو میرے لیے نیک شگون یا بابرکت ثابت ہوا۔ گھر والے بھی خوش ہوئے۔''

8 ''میری آج کل کی مصروفیات؟''
''ابھی حال ہی میں شارٹ فلم مکمل کی ہے اور پھر اس کا OST شوٹ ہوا اور فی الحال اپنی فیملی کے ساتھ لاہور میں انجوائے کر رہی ہوں۔''

9 ''میں اچھا پکا لیتی ہوں؟''
''اچار گوشت اور شملہ مرچ۔'' قہقہہ۔

10 ''محبت کا کیا پیمانہ ہے؟''
''کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ محبت اپنا اظہار خود کروا دیتی ہے اور انسان کے رویے بتا دیتے ہیں کہ کون کس سے سچی محبت کرتا ہے۔''

11 ''میرے بیگ میں ہر وقت کیا کیا ہوتا ہے؟''
''ہر چیز جس کی ایک انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔''

12 ''شادی میں اس لیے جاتی ہوں کہ؟''
''کہ رسمیں انجوائے کرسکوں، خاص طور پر ڈھولکی اور دودھ پلائی کی رسم۔''

13 ''پریشانی ہوتی ہے؟''
''کسی کو تکلیف میں دیکھ کر...... کیونکہ ہم کسی کی تکلیف، پریشانی کو دور نہیں کر سکتے۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ ان کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔''

14 ''ایک برائی جو مجھ میں ہے؟''
''وہ یہ کہ میں غصے کی بہت تیز ہوں اور اس پر قابو پانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

15 ''موبائل فون رحمت یا زحمت؟''
''رحمت ہے مگر کبھی کبھی زحمت بھی بن جاتا ہے۔ جب بھی سروس بند ہوتی ہے تو بہت سکون ملتا ہے۔''

16 ''تعریف کے کون سے الفاظ خوشی دیتے ہیں؟''
''تم بہت اچھی بچی ہو، ہمیشہ ایسی ہی رہنا، سب کا خیال رکھنا۔''

17 ''کبھی ڈھیر سارا پیسہ مل جائے تو؟''
''تو اپنے پر بالکل بھی خرچ نہیں کروں گی بلکہ غریب بچوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کروں گی۔ مجھ سے غریب بچوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔''

18 ''گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟''
''جھوٹ نہیں بولوں گی، میرا ہی غصہ بہت تیز ہے اپنے ہی غصے سے ڈر لگتا ہے۔''

19 ''کن چیزوں پر خرچ کرتی ہوں؟''
''ایک آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ خرچ کپڑوں اور میک اپ پر ہوتا ہے۔ باقی گھر کی آرائش کا بھی بہت شوق ہے تو اس پر بھی خرچ ہوتا ہے۔''

20 ''فارغ اوقات میں کیا کرنے کو دل چاہتا ہے؟''

''چہل قدمی کرنے کو یا پھر تھوڑا سا آرام کرنے کو......اور میں ایسا ضرور کرتی ہوں۔''

21 ''بھوک میں میری کیفیت؟''

''پہلے تو صبر کرتی ہوں کہ ابھی مل جائے گا۔ مگر جب زیادہ دیر ہو جائے تو پھر ''پانی'' پی لیتی ہوں۔ یعنی صبر کے گھونٹ اور سچ میں پانی پینے سے بہت حد تک بھوک کم ہو جاتی ہے۔''

22 ''میں ڈر جاتی ہوں؟''

''جب کوئی تیز آواز میں مجھے گہری نیند سے اٹھا دے تو۔''

23 ''گیمز آوٹ ڈور پسند ہیں یا انڈور؟''

''مجھے تو ان ڈور سے زیادہ آوٹ ڈور پسند ہیں اور میں نے کھیلے بھی بہت ہیں۔ اور سب مل کر کھیلا کرتے تھے۔ اب تو پہلے جیسا زمانہ ہی نہیں رہا۔''

24 ''کھلونوں سے کھیلی؟''

''نہیں، نہیں بالکل نہیں۔''

25 ''پاکستان سے بھاگنا چاہتی ہوں؟''

''ہرگز نہیں......بالکل نہیں کیونکہ پاکستان سے اچھا کوئی ملک ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اگر کوئی دوسرا ملک شہریت کی آفر بھی دے گا تو نہیں لوں گی......کبھی نہیں۔''

26 ''مجھے نفرت ہے؟''

''بہت سی باتوں سے نفرت ہے۔ خاص طور پر جو لوگ نگیٹو سوچ رکھتے ہیں ان لوگوں سے۔''

27 ''غصے کے وقت ردعمل؟''

''دل تو چاہتا ہے کہ خوب بولوں لیکن بڑے صبر سے خاموش رہتی ہوں۔''

28 ''بچپن کی ایک بری عادت؟''

قہقہہ......''کان پکڑتی ہوں دوسروں کے۔''

29 ''محبت اندھی ہوتی ہے؟''

قہقہہ......''ابھی تک کسی سے ہوئی نہیں۔ جب ہوگی تو بتاؤں گی کہ اندھی ہے۔ گونگی ہے یا بہری ہے۔''

30 ''خوشی اور غم میں میری کیفیت؟''

''مجھے رونا آتا ہے دونوں کیفیات میں۔''

31 ''مجھے مزا آتا ہے؟''

''محنت کر کے کمانے میں...... قسمت میں کیا لکھا ہے کچھ پتا نہیں ...... اس لیے اپنا نصیب خود ڈھونڈنا پڑتا ہے۔''

32 ''ایک تہوار جو شوق سے مناتی ہوں؟''

''ایک نہیں...... سب تہوار شوق سے مناتی ہوں کیونکہ ہر تہوار کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے۔ جسے منانے میں مزہ آتا ہے۔''

33 ''میری تھکن اترتی ہے؟''

''ایک پیالی گرما گرم چائے مل جائے تو ساری تھکن اتر جاتی ہے۔''

34 ''کھانے کے ساتھ کیا ہونا ضروری ہے؟''

''پانی...... باقی تو سب کچھ ہوتا ہی ہے۔''

35 ''گھر میں کھانے کی بہترین جگہ؟''

''میرا اپنا بیڈ...... بہت مزا آتا ہے۔''

36 ''کس کو منانا مشکل ہے؟''

''سب کو...... گھر والے ناراض ہو جائیں تو پھر تو بہت ہی مشکل سے مانتے ہیں۔''

37 ''بڑی ہنسی آتی ہے جب؟''

''جب مجھ سے ملتے ہی میرے ڈرامے کا اینڈ پوچھتے ہیں۔ مگر میں نہیں بتاتی کہ بتا دیا تو پھر سسپنس ختم ہو جائے گا۔''

38 ''گھر سے نکلتے وقت؟''

''موبائل ...... سن گلاسز اور سردی ہو تو شال لے کر نکلتی ہوں۔''

39 ''بہت سست ہوں؟''

''کسی کے بھی ایس ایم ایس کے جواب دینے میں۔ پتا نہیں کیوں۔''

40 ''آج کی فکر زیادہ ہے یا کل کی؟''

''جو آج ہے وہ ہی آج ہے۔ باقی میں نے تو اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑا ہوا ہے۔''

41 ''کون سے جملے جو تکلیف دیتے ہیں؟''

''مجھے نہ نصیحت بری لگتی ہے نہ عام باتیں...... البتہ مجھے لوگوں کے طنزیہ جملے بہت تکلیف دیتے ہیں۔''

42 ''چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہوں؟''

''زیادہ تر سو کر یا پھر فیملی کے ساتھ نکل جاتی ہوں۔''

43 ''اپنی کمائی سے میں نے خریدا؟''

''ایک اپارٹمنٹ۔ بہت خواہش تھی کہ اپنا اپارٹمنٹ ہو...... سو وہ خواہش پوری کر لی۔''

44 ''میرے پسندیدہ کھانے دیسی یا بدیسی؟''

''مجھے ہر طرح کے دیسی بدیسی کھانے پسند ہیں کیونکہ میں فوڈ لور Lover ہوں۔''

45 ''پاکستان کتنا پسند ہے؟''

''پسند کیا؟ ہمارا اپنا ملک ہے۔ ہماری پہچان، ہماری شناخت ہے بس ہم اس کی مٹی سے مخلص نہیں ہیں۔ اگر لوگ مخلص ہو جائیں تو اس سے اچھا ملک کوئی ہے ہی نہیں۔''

46 ''شاپنگ کے لیے کم سے کم کتنے پیسے لے جاتی ہوں؟''

''ہاہاہا...... کیا سوال کر لیا...... بھلا شاپنگ کے لیے کون پیسے کم لیتا ہے۔''

47 ''کس ملک جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں؟''

''پیرا گوئے۔''

48 ''بات دل میں رکھتی ہوں؟''

''کسی کا راز ہو تو دل میں رکھتی ہوں۔ کوئی عام سی بات ہو تو کہہ دیتی ہوں۔ ورنہ خاموشی اختیار کرتی ہوں۔ ویسے خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ کوئی ہم پر بھروسا کر کے ہی بات کرتا ہے۔''

49 ''شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟''

''یہ منحصر ہے کہ آپ نے کیا خریدنا ہے۔ اسی لحاظ سے پھر جگہ کا انتخاب کرتی ہوں۔''

50 ''آئینہ کہتا ہے؟''

''اپنے چہرے کا خیال رکھا کرو......''

☆☆

مقابل ہے آئینہ

مُسکان نورُ

ادارہ

س ''اصلی نام کیا ہے۔ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج ''اصلی نام مسکان نور ہے اور پیار کا نام گڑیا شہزادی۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ کہتا ہے۔ معصوم صورت ہو، خوب صورت ہو اور بولتی بھی معصوم ہو۔ یہ صرف آئینہ ہی نہیں کہتا میرے بہن بھائی بھی کہتے ہیں۔''

س ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''حسین لڑکیاں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں تو یہی دعا کرتی اللہ تعالیٰ لڑکیوں کے نصیب اچھے کریں۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے گی؟''

ج ''تو لے لیں میرے پرس سے تلاشی۔ میرے پرس سے خزانہ تو نہیں نکلے گا جو مجھے فکر ہوگی۔ (مسکراہٹ)۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''بہت زیادہ، اوف!''

س ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج ''مہمان بہت اچھے لگتے ہیں۔ خاص کر آنٹیاں، دادیاں اور پھر لڑکیاں وہ بھی میری عمر کی ہو تو مزا آجاتا ہے۔''

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''کھانے سب پسند ہے وہ بھی جو مجھے نہیں پسند اور وہ بھی جو مجھے پسند ہے۔ مطلب شکر کر کے کھا لیتی ہوں۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''پسندیدہ شاعر علامہ اقبال ہی بیسٹ تھے اور رہیں گے۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''نہیں بھئی، میں بالکل بھی لڑاکا نہیں ہوں۔ میں تو لڑکی ہوں اور لڑکیاں تو بہت صابر شاکر ہوتی ہے۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہے؟''

ج ''وہ لوگ جو اپنی زبان سے دوسروں کے دل نہ دکھائے۔ جو دوسروں کے لیے اچھا سوچیں۔''

س ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو ڈراموں کی شوقین خواتین کو سکون آجاتا خاص کر میری امی جان کو۔ ہاہاہا''

س ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟''

ج ''نہ بابا نہ...... یہ بہت بڑی ذمے داری ہے، میں تو کبھی نہ لوں۔''

س ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج ''اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا بہترین وقت تو ہر وقت ہوتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں...... ہم جب چاہے اپنے پیارے رب کو یاد کر سکتے ہیں۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''میں کفایت شعار ہوں۔ لیکن جب ضروری چیزیں خریدنی پڑ جائے تو فضول خرچ بن جاتی ہوں۔''

س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج ''ہاں بھی اور نہیں بھی۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج ''ہاں ہوتا ہے نا، جیسا میرا نام ہے مسکان، ویسے ہی میرے چہرے پر بے وجہ مسکان آ جاتی ہے۔''

س ''سنسان رستہ ہو اور کتا آپ کے پیچھے لگ جائے؟''

ج ''کتا تو میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ اس وقت میں نماز پڑھ کر تسبیح پڑھ رہی تھی۔ میں تو بری طرح سے ڈر گئی تھی لیکن شکر ہے وہ ادھر ادھر دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔''

س ''آپ کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج ''اپنے پیارے پاک اہل بیت کی جنہوں نے ہمیں مصیبت میں صبر کرنا سکھایا اور دکھ میں بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا سکھایا۔''

س ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج ''ڈرامے دیکھتی ہوں لیکن وہ جو دل کو اچھے لگیں۔''

س ''پچھلے سال کی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا؟''

ج ''پچھلے سال کی کامیابی تو کوئی نہیں۔ بس یہ کہ میرے خط شائع ہوئے اور آپی نے سالگرہ کی مبارک باد کے ساتھ دعائیں دیں۔ جس کے لیے میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔ نومبر میں میری سالگرہ ہوتی ہے۔ تھینک یو پیاری مدیرہ آپی۔''

س ''حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟''

ج ''حقیقی خوشی ڈائجسٹ کے آنے پر اور خط شائع ہونے پر ملتی ہے۔''

وہ دن عید کے جیسا لگتا ہے
جب ڈائجسٹ ہاتھ میں آتا ہے

س ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟''

ج ''میری کوئی دوست نہیں ہے، بس قارئین بہنوں کو ہی اپنی دوستیں مانتی ہوں۔''

س ''آپ کی بہت قیمتی ملکیت؟''

ج ''میرے گھر والوں سے محبت اور بی بی زینبؑ بنت علیؑ سے محبت۔''

س ''اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟''

ج ''کیا کیا بتاؤں، بس صبر کرتی ہوں۔ اور صبر کرنے میں ہی مزا ہے اور شکر کرنے میں ہی سکون ہے۔''

س ''کون سا کام کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج ''میں دنیا کی پروا نہیں کرتی۔''

س ''آپ کی نظر میں محبت؟''

ج ''وہ محبت جو جائز رشتوں سے کی جائے وہ محبت بہت اچھی ہے۔''

س ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟''

ج ''خوشی تو ہوتی ہے لیکن میں شرما جاتی ہوں اپنی تعریف سن کر۔''

س ''مستقبل کی منصوبہ بندی؟''

ج ''رائٹر بننے کا بہت شوق ہے اور ایک اچھی رائٹر بننے کے لیے بہت زیادہ مطالعہ کرتی ہوں۔''

س ''کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟''

ج ''مجھے بی بی زینبؑ بہت یاد رہتی ہے۔''

س ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''

ج ''میں نے زندگی سے یہی سیکھا۔ یہ دنیا فانی ہے اور فانی دنیا سے کوئی بھی امید لگانا نا سمجھی ہے صرف اپنی آخرت سنوارنے کی فکر کریں یہی عقل مندی ہے۔''

س ''کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟''

ج ''اگر ہم خوش رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں خواہشات کم کرنا ہوں گی۔''

س ''کوئی آخری بات؟''

ج ''یہی کہ ماشاء اللہ کہنے کی عادت ڈال لیں کیونکہ نظر تو برحق ہے۔''

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم 70/- روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030" کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔ فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے۔

کسی بھی معلومات اور آرڈر کے لیے اس نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں۔

سالگرہ نمبر

مہوش افتخار

دامنِ سحاب

طیبہ کو آٹھ سال، دو ماہ اور تین دن بعد اس وقت اپنا گھر چھوڑنا پڑا جب ان کے ساتھ ان کا ہم سفر نہ رہا۔ نام نہاد اپنوں نے ان کی کم عمری کو بہانہ بنا کر ان کا مشترکہ سسرال میں رہنا غیر مناسب قرار دیا۔ ان کے بھائی خلیل غوری اپنی بہن اور بھانجی حیا کو اپنے گھر لے آئے۔

گردیزی ہاؤس میں شاہ مخدوم گردیزی اپنے دو بیٹوں حاتم گردیزی اور سبحان گردیزی اور بہوئیں زینب اور منیرہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی "گردیزی کنسٹرکٹرز" کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق ایک بڑے زمین دار گھرانے سے ہے۔

حاتم گردیزی کے دو بیٹے جرار اور ہادی اور ایک بیٹی خولہ ہے جبکہ سبحان گردیزی کی ایک بیٹی سلوٹی ہے۔

زینب کو اپنے بیٹے جرار کے مغرورانہ انداز سخت ناپسند ہیں۔ وہ اپنے دادا کا بے حد لاڈلا ہے بلکہ عادت و اطوار میں بھی ان ہی کا پرتو ہے۔

pklibrary.com

عباس چچا کے بیٹے نصر نے جو منیرہ کا بھائی ہے، اپنے سالوں کے ساتھ مل کر شاہ مخدوم گردیزی کے آموں کے باغات پر قبضہ کرلیا ہے۔ شاہ مخدوم گردیزی نے اپنے بیٹوں کو عدالتی کارروائی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔
شکیل غوری کے بے ہوش ہونے پر طیبہ ان کو ہاسپٹل لے کر گئیں تو ڈاکٹر نے بتایا کہ خلیل غوری کو برین ٹیومر ہے

چوتھی قسط

"دیکھ لو طیبہ۔ تم حاتم کو پہچان بھی نہیں سکیں اور اسے تمہارا نام تک یاد ہے۔" خلیل صاحب مسکرا کر بولے۔ طیبہ بے اختیار شرمندہ ہو گئیں۔
"ایسی بات نہیں ہے بھائی۔" انہوں نے گڑبڑا کر نظریں اٹھائیں۔ "میں تو انہیں یوں اچانک سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔" ان کی بات پر خلیل صاحب نے تائید میں سر ہلایا۔
"یہ تو تم نے صحیح کہا۔ حیران تو ہم دونوں بھی جی بھر کر ہوئے ہیں۔" انہوں نے چمکتی نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ حاتم گردیزی دھیرے سے مسکرا دیے۔
"پتا ہے۔" وہ اشتیاق سے بہن کی جانب پلٹے۔
"میں جونہی ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے نکلا سیدھا اس سے آٹکرایا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو یہ آگے نکل جاتا اور ہماری ملاقات کبھی نہ ہو پاتی۔" ان کی بات پر طیبہ کے لبوں پر اک پھیکی سی مسکراہٹ آٹھہری۔ سارا کھیل لمحوں کا ہی تو ہوتا ہے۔ اک ذرا سی دیر سویر اور قسمت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔
"شاید آج ہمارا ملنا اوپر کہیں طے تھا۔" حاتم صاحب کی ٹھہری ہوئی آواز طیبہ سماعتوں سے ٹکرائی تو ان کی نگاہیں بے اختیار ان کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ مگر وہ خلیل صاحب کی طرف متوجہ تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر ان کا جائزہ لینے لگیں۔
سرخ وسفید رنگت پر چمکتے کالے بال آج بھی اتنے ہی گھنے تھے جتنے کہ پہلے تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر تا حال کسی گہری لکیر کا شائبہ تک نہ تھا۔ کھڑی ناک، گہری سیاہ آنکھیں اور بھرے بھرے سے لب۔ وہ بالکل بھی نہ بدلے تھے۔ یقیناً وقت ان کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آیا تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کی شخصیت میں وقار اور ٹھہراؤ کے چار چاند لگا گیا تھا تو بے جا نہ تھا۔ ان کی آن، بان اور شان آج بھی انہیں قسمت کا دھنی بتا رہی تھی۔ طیبہ بے اختیار اپنی نظریں جھکا گئیں۔
"شاید نہیں یقیناً...... جب ہی تو آج گیارہ سال بعد نہ تو آگے نکلا اور نہ میں پیچھے رہا۔" خلیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔
"گیارہ نہیں ساڑھے گیارہ سال بعد۔" حاتم گردیزی نے دھیرے سے تصیح کی تو جہاں خلیل صاحب نے حیرت سے انہیں دیکھا وہیں طیبہ نے چونک کر پلکیں اٹھائیں۔
"تو کیا وقت انگلیوں پر گن رہا تھا؟" انہوں نے خوش گوار لہجے میں انہیں چھیڑا۔
"انگلیوں کا تو پتا نہیں مگر دل پر ضرور لکھا تھا۔" اک اچٹتی نظر طیبہ پر ڈالتے ہوئے وہ اپنے دوست کی جانب دیکھ کر ملول سا مسکرائے۔
اک سنسناہٹ سی طیبہ کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ گھبرا کر نظروں کا زاویہ بدل گئیں۔
"کیا کہنے ہیں تیرے۔ اگر اتنی ہی محبت تھی تو اتنے سال ملنے کیوں نہیں آیا؟" خلیل صاحب نے مان بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔

''آیا تھا مگر تم لوگ وہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔''
ان کی بات پہ اک سایہ سا طیبہ کے چہرے پر لہرا گیا۔
''ہاں، ہم بیا کی شادی کے بعد نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔'' خلیل صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ حاتم گردیزی کی نظریں بے اختیار طیبہ پر جا ٹھہریں۔
''آپ کے ہسبینڈ کیسے ہیں طیبہ؟'' انہوں نے اچانک سوال کیا تو طیبہ کے ساتھ ساتھ خلیل غوری بھی ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ مگر صرف ایک پل کو۔ اگلے ہی لمحے طیبہ نے سرعت سے خود کو سنبھالا۔
''اللہ کا شکر ہے، بالکل ٹھیک ہیں۔'' ان کی جانب دیکھتی وہ ہموار لہجے میں بولیں۔ خلیل صاحب نے بے حد حیرت سے اپنی بہن کو دیکھا۔ جو ان کی نظروں کو خود پر محسوس کرنے کے باوجود انجان بن گئیں۔
''اچھی بات ہے۔ اللہ پاک آپ کو اپنے گھر میں شاد و آباد رکھے۔'' حاتم گردیزی دل کی گہرائی سے بولے۔ طیبہ رسما مسکرا دیں۔
''آمین۔ بھائی! میرے خیال میں اب چلنا چاہیے، بہت دیر ہو گئی ہے۔'' وہ یک لخت خلیل صاحب کی جانب پلٹیں جو انہیں فہمائشی نظروں سے دیکھتے حاتم صاحب کی جانب پلٹے۔
''اچھا حاتم! اجازت دے۔'' وہ مسکرائے تو انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے لگا لیا۔
''بہت اچھا لگا تم لوگوں سے مل کر۔ ہم جلد ہی ان شاء اللہ دوبارہ ملیں گے۔ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر اور ایڈریس لکھوا دے۔''
ان سے الگ ہوتے ہوئے حاتم گردیزی نے جیب سے کاغذ اور قلم نکالا۔ خلیل غوری با خوشی انہیں گھر کا فون نمبر اور پتا لکھوانے لگے۔ بدلے میں انہوں نے بھی اپنا کارڈ خلیل صاحب کو تھما دیا۔ طیبہ ڈوبتے دل کے ساتھ اس سارے تبادلے کو دیکھتی رہیں۔
خلیل صاحب سے مصافحے کے بعد حاتم گردیزی ان کی جانب پلٹے تو وہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے دھیمے لہجے میں الوداعی کلمات کہتے ہوئے بھائی کے پیچھے چل دیں۔
ان کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ یہ یک لخت کیا ہوا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ چپ چاپ سی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ خلیل صاحب نے بھی خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
''تم نے حاتم سے جھوٹ کیوں بولا؟'' دروازہ بند کر کے وہ ان کی طرف پلٹے۔
طیبہ جو اس ساری صورت حال پر پہلے ہی جھنجلائی ہوئی تھیں چیخ سی گئیں۔
''اس لیے کہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی ذاتی زندگی عیاں کرنا مجھے مناسب نہیں لگا۔'' ان کی بات پر خلیل غوری نے تعجب سے انہیں دیکھا۔
''کمال ہے۔ آج سے پہلے تو کبھی کسی کے سامنے تمہیں یہ حقیقت غیر مناسب نہیں لگی۔'' ان کی بات پر طیبہ نے بے اختیار اک گہری سانس لی۔
''بندے بندے میں فرق ہوتا ہے بھائی۔ ہر کسی کی ترس بھری نظریں برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔'' وہ دل گرفتگی سے بولیں۔ خلیل صاحب بھی ایک لمحے کو چپ ہو گئے۔
''اور اب جو وہ گھر آئے گا تو؟'' انہوں نے لحظہ بھر رک کر سوال کیا۔ طیبہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔
''تو کیا؟ ہم انہیں ہر بات کا جواب دینے کے پابند نہیں۔'' خلیل صاحب نے انہیں بے بسی سے دیکھا۔
''ایسے نہیں ہوتا بیا۔ وہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔''

"جی۔ میں آپ کو یہی سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"
نروٹھے پن سے کہتے ہوئے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں تو خلیل غوری لاچارگی سے نفی میں سر ہلاتے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے۔

☆☆☆

بلیک چادر میں لپٹا وجود دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ حاتم گردیزی، ارد گرد سے بے خبر ایک ٹک اسے خود سے دور جاتا دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چلتے چلتے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی وہ بھی جیسے خود میں لوٹ آئے تھے۔
کیا ہوا تھا یہ؟ کیسے ہوا تھا یہ؟ وہ سمجھنے سے قاصر سے تھے۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ ایک لمحہ وہ لوگوں سے بھری اس راہداری میں زندگی کے جھمیلے نپٹاتے آگے بڑھ رہے تھے اور اگلے ہی پل جیسے ساری دنیا رک گئی تھی۔ حیات ان کے ماضی کے دامن کی سب سے خوب صورت یاد اپنی بانہوں میں سمیٹے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ کسی بت کی مانند کھڑے دیکھتے رہ گئے تھے۔
کتنی عجیب بات تھی کہ جب غم ہجر کو سہتے دل کی تڑپ اور اس کی بے قراری اپنے عروج پر تھی تو یہ چہرہ صفحۂ ہستی سے ایسے غائب ہوا تھا کہ وہ اس کی ایک جھلک کو ترس گئے تھے۔ اور اب جبکہ وقت کی گردش اور زندگی کے تقاضوں نے انہیں اپنا درد بھلانے اور آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا تو وہ بنا کسی کوشش کے ان کے سامنے یوں لا کھڑا کر دیا گیا تھا جیسے کبھی کھویا ہی نہ ہو۔ واقعی، قسمت انسان کے ساتھ کبھی کبھی بہت زیادتی کر جاتی ہے۔ آپ پہلے ہی جن معمولات میں اپنی بے بسی کی آخری حد کو پہنچے ہوتے ہیں یہ ان ہی سے آپ کی آزمائش کا سامان کر دیتی ہے۔
بے اختیار ان کی خالی نگاہیں اپنے ہاتھ میں تھمے کاغذ کے اس بے جان ٹکڑے پر آ ٹھہری تھیں جہاں اس در کا پتا لکھا تھا جس کے کبھی وہ شیدا تھے، مگر اب جس کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا۔ ان کے اندر سے اک ہوک سی اٹھی تھی جوان کے لبوں پر اک درد بھری مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم!

بوجھل دل کے ساتھ انہوں نے ہاتھ میں تھما کاغذ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور اک گہری سانس لیتے ہوئے باہر کی جانب چل پڑے جہاں کاروبار زندگی اپنی تمام تر مصروفیات کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

منیرہ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں لاؤنج کے پردے لگوا رہی تھیں جو دھوبی سے دھل کر اور استری ہو کر آئے تھے۔ تب ہی زینب تیار ہو کر شانوں کے گرد چادر پھیلاتے ہوئے ہاتھ میں پرس لیے وہاں چلی آئی تھیں۔ وہ ملازم اور ڈرائیور کے ہمراہ مہینے بھر کا راشن لینے بازار جا رہی تھیں۔
"منیرہ! کل جو سودے کی لسٹ بنائی تھی وہ کہاں رکھی ہے؟" انہوں نے دیورانی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"کچن میں پڑی ہے۔ بلکہ آپ ٹھہریں میں لے کر آتی ہوں۔" وہ پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ زینب ملازم کو پکارنے لگیں۔
"جی بی بی۔" وہ مؤدب سا داخلی دروازے سے اندر چلا آیا۔
"رفیق نے گاڑی نکالی ہے؟" انہوں نے پرس کھول کر اندر رکھے پیسے چیک کیے۔

”جی۔“

”چلو پھر جا کر باہر رکھیں آموں کی دونوں پیٹیاں بھی گاڑی میں رکھواؤ، مجھے انہیں احمد چچا کے گھر دینا ہے۔“ ان کی بات پر ملازم اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ تب ہی منیرہ ہاتھ میں لسٹ لیے چلی آئیں۔

”یہ لیں بھابھی۔ اور اگر ٹائم ملے تو ٹیلر سے میرے کپڑے بھی اٹھا لیجیے گا۔ دو تین دن سے تیار پڑے ہیں۔“

”کوشش کروں گی مگر مجھے احمد چچا کی طرف بھی جانا ہے۔ آم بھی پہنچا آؤں گی اور چچی جان سے بھی مل لوں گی۔ احمد چچا بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے لسٹ لیتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔ منیرہ نے سن کر تحمل سے اثبات میں سر ہلایا۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ زیادہ ضروری کام ہے۔ میں کل خود ٹیلر کی طرف چلی جاؤں گی۔“ وہ رسان سے بولیں۔

زینب دھیرے سے مسکرا دیں۔ تب ہی شاہ مخدوم نک سک سے درست اپنے کمرے سے نکلے۔ لیکن جونہی ان کی نظر لاؤنج کے وسط میں کھڑی دونوں بہوؤں سے ٹکرائی وہ اپنی جگہ پر رک گئے۔

”کہیں جا رہی ہو بہو؟“ زینب کو تیار دیکھ کر انہوں نے سوال کیا۔

”جی بازار جا رہی ہوں۔“ ان کی بات پہ وہ پل بھر کو خاموش ہو گئے۔

”کیا لینے جانا ہے؟“ اگلے ہی لمحے انہوں نے عجیب سا سوال کیا تو زینب کے ساتھ ساتھ منیرہ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔ آج سے پہلے تو کبھی انہوں نے ایسی باز پرس نہ کی تھی۔

”راشن لینے جا رہی ہوں آغا جان۔“ زینب اپنی حیرت پسِ پشت ڈالتے ہوئے بولیں تو شاہ صاحب کے چہرے کے تاثرات یک لخت ڈھیلے پڑ گئے۔

”اچھا، اچھا جاؤ۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے فون کی جانب بڑھ گئے۔ زینب نے الجھ کر منیرہ کو دیکھا جو ناسمجھی کے عالم میں کندھے اچکا گئیں۔

زینب نے دزدیدہ نگاہوں سے سسر کو دیکھتے ہوئے گلا کھنکارا۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں آغا جان؟“ ان کے سوال پر شاہ صاحب نے نظریں اٹھائیں۔

”ہاں۔ میں اور احمد ہمارے ایک مشترکہ دوست کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ تذبذب سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر منیرہ کو دیکھا اور جب کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تو اک گہری سانس لیتے ہوئے نکلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”اچھا آغا جان، میں جا رہی ہوں۔“

”جاؤ، اللہ کی امان میں دیا۔“ وہ صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے بولے۔

زینب سر جھٹکتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

شاپنگ ختم کر کے احمد چچا کی طرف آتے آتے انہیں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ باہر کھڑے چوکیدار نے ان کی گاڑی کو دیکھا تو بنا کسی تامل کے گیٹ وا کر دیا۔ ڈرائیور سبک رفتاری سے گاڑی دوڑاتا اندر پورچ میں لے گیا۔

وہ ملازم سے آموں کی پیٹیاں نیچے اتروا رہی تھیں جب داخلی دروازہ کھول کر احمد عباس باہر چلے آئے۔

”اخاہ! میری بیٹی آئی ہے۔“ زینب کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ پرتپاک انداز میں ان کی جانب بڑھے تو وہ مسکرا دیں۔

"السلام علیکم چچا جان۔"
"وعلیکم السلام۔ بھئی یہ آج تم کیسے راستہ بھول گئیں؟" ان کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے انہوں نے محبت سے استفسار کیا۔ زینب کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
"دیکھ لیں۔ کبھی کبھی ہم بھی راہ بھٹک ہی جاتے ہیں۔" وہ شرارت سے بولیں۔ احمد عباس قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔
"بہت خوب! بس یونہی بھٹکتی بھٹکاتی اکثر آجایا کرو۔" وہ خوش دلی سے بولے تو زینب ہنس پڑیں۔
احمد چچا کی حلیم فطرت اور بذلہ سنجی ہی تو انہیں ہر دل عزیز بناتی تھی۔ ان کے اور آقا جان کے مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ وہ جتنے نرم خو اور ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے آقا جان اتنی ہی سنجیدہ اور سخت طبیعت رکھتے تھے۔ ایسے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریبی اور عزیز دوست کیسے تھے وہ سب ہی آج تک سمجھ نہ پائے تھے۔
"یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔" انہوں نے پیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔
"ارے واہ۔ میں آج ہی سوچ رہا تھا کہ تمہارے کھڑوس سسر کو فون کر کے پوچھوں گا کہ میرے آم کہاں ہیں؟" وہ مسکرا کر بولے تو زینب جو اپنے دھیان میں تھیں، مسکرا دیں۔
"فون کی کیا ضرورت تھی آپ ان کے ساتھ ہی تو تھے۔"
"میں آج کہاں اس کے ساتھ تھا بھئی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تو زینب کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی۔
"کیوں آپ لوگ آج اپنے دوست کی عیادت کے لیے نہیں گئے کیا؟"
"کون سا دوست...... کیسی عیادت؟" انہوں نے حیرت سے زینب کو دیکھا۔ "لگتا ہے میری بیٹی کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائے۔ زینب بری طرح چونک گئیں۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے سرعت سے خود کو سنبھالا۔
"جی جی......" انہوں نے خفت سے سرخ پڑتا چہرہ جھکاتے ہوئے گلا کھنکارا۔ "مجھے ہی یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل میں آقا جان منیرہ سے کچھ کہہ رہے تھے میں چونکہ کچن میں تھی اس لیے آدھی ادھوری بات سے یہی سمجھی کہ شاید وہ اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے ہیں۔ خیر، آپ سنائیں چچی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے اوٹ پٹانگ سا بہانہ بناتے ہوئے بات بدلی تو احمد صاحب کا دھیان بھی بٹ گیا۔
"پہلے سے بہتر ہے اب۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔" وہ انہیں ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھے۔ زینب لب بھینچے ان کے ساتھ چل دیں۔
پھر وہ جتنی دیر احمد چچا کے گھر رہیں ان کا دماغ ایک ہی نقطے کے گرد گھومتا رہا۔ آخر آقا جان نے ان دونوں سے غلط بیانی کیوں کی تھی؟

☆☆☆

منیرہ نے ملازمہ سے لاؤنج کی سیٹنگ کروانے کے بعد ایک نظر پورے لاؤنج پر ڈالی تھی اور مطمئن ہو کر اسے فریج سے سبزی اور قیمہ نکالنے کا کہہ کر خود شاور لینے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ زینب کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ آج اکیلی ہی کوکنگ کرنے والی تھیں اس لیے ان کا ارادہ ذرا جلدی کام شروع کرنے کا تھا۔ ویسے بھی آقا جان دوپہر کے کھانے تک اپنی واپسی کا کہہ گئے تھے اور آج انہوں نے خاص طور پر اپنے لیے قیمے بھرے کریلوں کی فرمائش کی تھی اس لیے منیرہ کا سارا دھیان فٹافٹ باقی کے کام نپٹا کر کچن میں پہنچنے پر تھا۔ وہ الماری کھولے اپنے کپڑے نکال رہی تھیں جب دروازہ بجا کر ملازمہ ہاتھ میں کارڈلیس لیے اندر چلی آئی تھی۔

''بی بی جی! آپ کا فون ہے۔'' منیرہ کی سوالیہ نظروں پر اس نے فون ان کی طرف بڑھایا۔
''کون ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''پتا نہیں جی۔ انہوں نے آپ کا پوچھا تو میں فون آپ کے پاس لے آئی۔'' منیرہ نے فون لیتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔
''ہیلو۔'' ایک ہاتھ سے کارڈلیس تھامے انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ہینگ کیا ہوا سوٹ نکالنا چاہا تھا لیکن جونہی مخاطب کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی ان کا ہاتھ اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔
''کیسی ہے چھوٹی؟'' لائن پر چھا جانے والی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے نصر گردیزی نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی شیرینی سموتے ہوئے گم گشتہ انداز میں بہن کو پکارا تو منیرہ کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ ان کا وجود یک لخت جل اٹھا۔
''کیوں فون کیا ہے؟'' اپنے کھولتے دماغ کو بمشکل تمام قابو کرتے ہوئے انہوں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔
نصر گردیزی مسکرا دیا۔
''کیوں میں تجھ سے حال احوال کے لیے فون نہیں کر سکتا کیا؟'' محبت سے کہتے ہوئے اس نے مان بھرے انداز میں پوچھا تو فون پر منیرہ کی گرفت سخت ہو گئی۔
''نہیں۔ کیونکہ آپ نے پہلے بھی کبھی یہ زحمت نہیں اور آج بھی اس ڈھکوسلے کی ضرورت نہیں۔ اپنے مطلب کی بات کریں اور فون بند کریں۔''
''یہ تو کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہے؟'' جواباً اس کی تپی ہوئی آواز آئی تو اک بے یقین سی مسکراہٹ منیرہ کے لبوں پر آ کر غائب ہو گئی۔ وہ بے اختیار پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
''حد ختم ہے بھائی جی۔ یعنی آپ نے اپنے سالوں کے پیچھے لگ کر یہاں میرے باپ کی برسوں کی کمائی ہوئی عزت، ان کے رشتے، میری زندگی، میری گرہستی سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں آپ سے بات کیسے کر رہی ہوں؟'' مارے غضب کے ان کا پورا جسم کانپ اٹھا تھا۔ ''آپ کو اپنے کیے پر ذرا سی بھی شرمندگی ہے؟ ذرا سا بھی احساس ہے کہ آپ نے اپنے ماں باپ، اپنی بہن کو کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ کتنا درد دیا ہے ہمیں؟'' ان کی آواز بے اختیار بھرا آئی تو لحظہ بھر کو فون پر خاموشی چھا گئی۔
''اتنی بڑی بات نہیں ہے یہ۔ تو نے ایویں اس سارے معاملے کو دل پر لگا لیا ہے۔'' نصر گردیزی گلا کھنکارتے ہوئے کھسیانی سی آواز میں بولا۔ منیرہ نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔
''صحیح کہہ رہے ہیں، بالکل بھی بڑی بات نہیں ہے یہ...... اپنے تایا کی زمینیں ہڑپنا، ان کی اولاد کو دھمکیاں دینا، ان سے کروڑوں روپے کا تاوان مانگنا، کچھ بھی تو بڑا نہیں ہے ان میں سے۔''
''زیادہ باتیں نہ بنا۔'' اس نے بدمزگی سے انہیں ٹوکا۔ ''تایا جی اور ان کی اولاد کے لیے کچھ بھی نہیں ہیں یہ دو کروڑ۔ ان کے خزانے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے یہ رقم۔''
اس کی بات پر منیرہ کا غصہ سوا ہو گیا۔
''ان کے خزانے سے آپ کا کیا لینا دینا ہے؟'' انہوں نے سرخ چہرے کے ساتھ سوال کیا۔ ''آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے بھائی جی، جو آپ نے یہ چور رستے اختیار کر لیے ہیں؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں خود کو، ابا جی کی تربیت کو رسوا کرنے پر تل گئے ہیں آپ؟ ہمارے خاندان کا نام، ہمارے باپ دادا کی عزت عدالتوں میں رلنے کو آ گئی بھائی جی...... کچھ تو خدا کا خوف کریں۔'' بے بسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے انہوں نے

جیسے دہائی دی تھی۔
"ہاں تو یہ بات اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں سمجھاتی تو؟ کیوں نہیں سبحان سے کہتی کہ وہ اس تصفیے کے لیے مان جائے؟" وہ بھڑک کر بولا۔
منیرہ کا دل چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ لیں۔ ان کی کوئی بات اس شخص پر اثر ہی نہیں کی تھی۔
"میری ایک بات کان کھول کر سن لے منیرہ! سبحان اور حاتم چاہے جتنی بھی خوش فہمیاں کیوں نہ پال لیں، ملک دلاور انہیں یہ کیس کبھی بھی اتنی آسانی سے جیتنے نہیں دے گا۔ اور بالفرض اگر وہ جیت بھی گئے تو انہیں یہ جیت اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہونے دے گا۔ وہ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن بندہ ہے۔ اب اس سے ہاتھ ملانا ہے یا زندگی بھر کی دشمنی مول لینی ہے یہ تم لوگوں کا فیصلہ ہے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر ڈالا۔
ساکت بیٹھی منیرہ کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ پورا کمرہ ان کی سسکیوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے بھائی جان......! آپ جب سے ہاسپٹل سے آئے ہیں خاصے چپ چپ سے ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"
سبحان گردیزی چند اہم دستاویزات لیے حاتم صاحب کے آفس میں آئے بیٹھے تھے۔ لیکن ان کی بے دھیانی نے بہت جلد سبحان صاحب کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ان کی اس کھوئی کھوئی سی کیفیت کو دوپہر سے محسوس کر رہے تھے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں تھا۔ لیکن اس وقت وہ خود کو پوچھنے سے روک نہ سکے تھے۔
ان کی بات پر حاتم صاحب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا قلم بیزاری سے ٹیبل پر اچھال دیا۔
"کوئی بات نہیں ہوئی یار۔"
"پھر آپ اتنے گم صم سے کیوں ہیں؟" سبحان صاحب نے الجھ کر انہیں دیکھا۔
حاتم گردیزی خاموش نظروں سے بھائی کا چہرہ دیکھنے لگے۔ خلیل غوری سے ان کی دوستی تو ان کے چھوٹے بھائی کے علم میں تھی لیکن وہ طیبہ کو پسند کرتے تھے اس بات کا ذکر انہوں نے کبھی ان سے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صرف انہیں اتنا بتا رکھا تھا کہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اور بات تھی کہ ان کے بھائی نے انہیں تنگ کرنے کو اس لڑکی کا فرضی نام "اوس" رکھ چھوڑا تھا۔ کیونکہ وہ واحد لڑکی تھی جو ان کے مزاج دار اور بے حد بجیلے بھائی کے دل پر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ برسنے والی اوس کی مانند اتری تھی اور انہیں محبت کے نرم و شفاف جذبے سے آشنا کر گئی تھی۔
انہیں آج بھی یاد تھا کہ سبحان صاحب نے اس لڑکی کا نام پتا جاننے کے لیے کیسے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا مگر انہوں نے بھی کسی طور بھائی کو ہاتھ پکڑا کے نہ دیا تھا۔ وہ اس کا نام تب تک کسی کے سامنے اپنی زباں پر نہیں لانا چاہتے تھے جب تک کہ وہ آقا جان سے اس بارے میں بات کر کے ان کی رضامندی نہ پا لیتے۔ ان کے لیے طیبہ کی عزت اس کا وقار ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔ ایسے میں جب تک ان کی دلی تمنائیں حقیقت بننے کی سند نہ پا لیتیں وہ اس کے متعلق لب کشائی کرنے والے تھے۔ مگر وائے ری قسمت کہ ہر آرزو، ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ اور وہ نام جسے وہ ببانگِ دہل سب کے سامنے لینا چاہتے تھے ان کے دل ہی میں چھپا رہ گیا تھا۔
"کیا ہوا بھائی جان! آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" انہیں ایک ٹک خود کو دیکھتا پا کر سبحان صاحب پریشانی سے

ان کی جانب جھکے تو حاتم گردیزی نے اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

''آج مجھے اوس ملی تھی۔'' چھت پر نگاہیں جمائے وہ آہستگی سے بولے۔

سبحان گردیزی جو پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے ایک لمحے کو الجھ سے گئے۔ ''اوس؟'' لیکن اگلے ہی لمحے ایک کوندا سا لپکا اور وہ ایک جھٹکے سے سیدھے ہو بیٹھے۔

''کب......؟ کہاں؟'' ان کے چہرے اور لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''ہاسپٹل میں۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد جب میں کاظمی صاحب کے آفس سے نکلا تب بس اچانک ہی ایک اتفاقیہ ٹکراؤ ہوا اور وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔'' وہ دھیرے سے بولے۔

سبحان صاحب خاموش ہو گئے۔

ان کی خاموشی پر حاتم صاحب نے سر اٹھایا اور انہیں اپنی جانب تکتا پا کر وہ پھیکا سا مسکراتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے۔

''اب تم کیوں گم صم ہو گئے ہو؟'' انہوں نے سبحان گردیزی کو ان کی بات لوٹائی تو وہ بے بسی سے شانوں کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گئے۔

''کیا کہوں؟''

''بس کچھ یہی کیفیت میری بھی ہے۔'' انہیں جتاتی نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنا سر ایک بار پھر کرسی پر ڈال دیا تو سبحان صاحب اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

''کیسی ہے وہ؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے دھیرے سے سوال کیا۔

حاتم گردیزی کے چہرے پر اک خواب ناک سا تاثر پھیل گیا۔

''بالکل پہلے جیسی۔ بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر خوب صورت ہو گئی ہے وہ...... وقت اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پایا یار۔'' ان کے لہجے میں عجیب سی یاسیت اور حسرت بول رہی تھی۔ سبحان گردیزی نا چاہتے ہوئے بھی اپنے بھائی کے لیے دل گرفتہ ہو گئے۔

''وقت نے تو جو بگاڑنا تھا وہ بگاڑ دیا بھائی جان۔'' وہ دکھ سے بولے۔

ان کی بات پر درد کی اک لہر حاتم گردیزی کے جسم و جاں میں سرایت کر گئی۔ بے اختیار انہوں نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

ان کا رنگ بدلتا چہرہ اور اذیت بھرے تاثرات سبحان صاحب کو اپنی غلطی کا احساس دلا گئے۔ وہ تیزی سے سیدھے ہوئے۔

''آئیں گھر چلتے ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''تم جاؤ۔''

''لیکن بھائی جان......''

''پلیز سبحان...... میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔'' وہ بنا سر اٹھائے آہستگی سے بولے۔

سبحان صاحب کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے اور پھر اک گہری سانس لیتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے باہر جاتے ہی اک کرب آمیز مسکراہٹ حاتم گردیزی کے لبوں پر پھیل گئی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے وہ۔ وقت نے جس اہم چیز کو بگاڑنا تھا وہ تو وہ بگاڑ ہی چکا تھا باقی سب تو ثانوی تھا۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا

کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا
اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے تا دیر اسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اتار لیا پھر اس کے ناز اٹھائیں کیا
اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو پھر دامنِ دل کو بچائیں

''دامنِ دل کو بچائیں کیا؟''
زیرِ لب دہراتے انہوں نے اپنی آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو بڑی بے حسی سے شہادت کی انگلی سے جھٹک ڈالا تھا۔

☆☆☆

چھوٹے مگر نفاست سے تراشیدہ لان میں اس پل مکمل خاموشی تھی۔ لاؤنج سے آتی خبروں کی آواز اور اندر کہیں اودھم مچاتے بچوں کا شور ماحول میں ہلکا ہلکا سا ارتعاش ضرور برپا کر رہا تھا مگر وہ جیسے سب سے بے نیاز اردگرد سے کٹی بیٹھی تھیں۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ان کی خالی نظریں آسمان پر چمکتے ستاروں پہ جمی تھیں۔ کہنے کو ان کا ذہن کسی ایک سوچ پر مرکوز نہ تھا مگر ہر سوچ گھوم پھر کر ایک ہی نقطے پر آجاتی تھی۔ حاتم گردیزی۔ وہ چاہ کر بھی انہیں ذہن سے جھٹک نہ پا رہی تھیں۔ بلکہ ان کی تو یہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ گیارہ سال بعد ہونے والی اس اچانک ملاقات کو حادثے کا نام دیتیں یا اتفاق کا۔ کیونکہ جو بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ ان کی زندگی میں الجھنوں کی پہلے کمی تھی کیا جو قسمت نے اس شخص کو بھی ایک نیا امتحان بنا کر ان کے سر مسلط کر دیا تھا۔

وہ حالات کی اس نئی کروٹ پہ سخت نالاں اور جھنجلائی ہوئی تھیں۔ حاتم گردیزی سے بڑھنے والے روابط اور ان کی اپنے گھر میں آمد و رفت کا سوچ کر ہی انہیں شدید کوفت ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں لیکن وہ اپنی زندگی کا ہر برا پہلو اس شخص سے چھپا لینا چاہتی تھیں۔ ہمدردی اور ترس سے انہیں ویسے ہی بہت چڑ تھی۔ ایسے میں اگر یہ دونوں چیزیں انہیں حاتم گردیزی کی آنکھوں میں اپنے لیے نظر آجاتیں تو شاید وہ اس اذیت کو کبھی برداشت نہ کر پاتیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ آج اپنے شوہر کی ذات کو بھی لے کر ان کے سامنے جھوٹ بھول گئی تھیں۔ حالانکہ بعد میں انہیں اپنی اس حرکت پر افسوس بھی ہوا تھا اور خود پہ ملال بھی۔ کیونکہ غلط بیانی کرنا ان بہن بھائی کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ مگر اس پل انا کہیں یا عزتِ نفس اس طرح عود کر آئی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اپنی زندگی کی اس تلخ ترین حقیقت کو اس شخص کے سامنے کہہ نہیں پائی تھیں۔ اور اب انہیں اس وقت کا سوچ کر ہی غصہ آرہا تھا جب ان کی زندگی کے دیگر مصائب کے ساتھ ساتھ اس زخم نے بھی کھل کر حاتم گردیزی کے سامنے آجانا تھا۔

پتا نہیں اوپر والے نے کیا سوچ کر یہ چال چلی تھی کیونکہ اب تو دلوں میں نہ ایک دوسرے کی آرزو رہی تھی اور نہ ہی آنکھوں میں اک دوجے کے خواب!

بلکہ ان کی آرزو تو انہوں نے اسی دن اپنے اندر سے اکھاڑ پھینکی تھی جس دن سکندر کے نکاح میں خود کو دیا تھا۔ وہ کم عمر ضرور تھیں مگر نادان نہیں تھیں۔ صحیح اور غلط کی تمیز ان کی تربیت میں شامل تھی۔ اور بددیانتی ان کے نزدیک ایک بے حد غلط عمل تھا۔ پھر چاہے وہ بددیانتی جذبوں میں کی جاتی یا سوچوں میں، انہیں یہ چوری کسی صورت منظور نہ تھی۔ جب ہی نکاح کے بعد انہوں نے اپنے ہر جذبے، ہر سوچ کو سکندر کی ذات تک محدود کر لیا تھا۔

آج بھی وہ اپنے اندر ان کے لیے کچھ محسوس نہیں کر رہی تھیں مگر اس اچانک ملاقات نے غیر ارادی طور پر

ان کے اندر ایک بے چینی سی پھیلا دی تھی یوں جیسے کسی پر سکون جھیل کے سینے میں اچانک سے پتھر پھینکنے پر لمحہ بھر کو ہی سہی لیکن ہلچل سی مچ گئی ہو۔

"آپ یہاں ہیں اور میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔"

اچانک ایک چھوٹی سی آواز ان کے پیچھے سے بلند ہوئی تو طیبہ اپنی تمام تر سوچوں کو جھٹکتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں۔ پلٹ کر دیکھنے پر ان کی نظریں اس چہرے سے جا ٹکرائیں جو ان کی ساری کلفتیں اپنے اندر سمیٹنے کا ہنر جانتا تھا۔ ان کے لب جیسے خود بخود مسکرا دیے۔

"آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟" اپنی لاڈلی کے خفا خفا سے تیوروں کو تکتے ہوئے انہوں نے محبت سے سوال کیا۔

"آپ مجھے نظر جو نہیں آ رہی تھیں۔" وہ معصومیت سے بولی تو طیبہ ہنس پڑیں۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنی بانہیں وا کیں تو جیا بھاگتی ہوئی ان میں آ سمائی۔ طیبہ نے بے اختیار اسے چومتے ہوئے اپنی گود میں بٹھالیا۔

"مما! آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟" اس کے سوال پہ طیبہ نے اک گہری سانس لی۔

"میرے سر میں درد ہو رہا تھا جانو اس لیے تھوڑی دیر کو یہاں آ گئی تھی۔" انہوں نے انگلیوں سے اس کے بال سنوارے۔

"مما! کہیں آپ کو بھی تو ماموں والی بیماری نہیں ہو گئی؟" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اچانک سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا تو طیبہ نے چونک کر اس کی پریشان صورت دیکھی۔

"آپ سے کس نے کہا میری جان کہ ماموں بیمار ہیں؟"

"بسیط بھائی نے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ماموں بہت سخت بیمار ہو گئے ہیں مگر وہ ہمیں بتاتے نہیں ہیں۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے پریشانی سے بولی تو طیبہ نے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔ ماموں بیمار ہوئے تھے مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ وہ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں دوا کھاتے ہیں، اس لیے اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ان کی تسلی پر اس کا پھول سا چہرہ کھل اٹھا۔

"تو کیا اب وہ اللہ میاں کے پاس نہیں جائیں گے؟" اس نے چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا تو طیبہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ بچے کون سا غم پال کر بیٹھ گئے تھے؟ دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے بامشکل تمام اپنی آنکھوں میں اترتی جلن کو پیچھے دھکیلا۔

"نہیں بیٹا! وہ اللہ میاں کے پاس نہیں جائیں گے۔"

"یا ہو۔" ان کی یقین دھیانی پر اس نے زور سے اک نعرہ بلند کیا۔ "میں ابھی ایلی کو بتا کر آتی ہوں۔" وہ ان کی گود سے اترتے ہوئے اندر کو بھاگی تو طیبہ کو لگا جیسے ان کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے بے اختیار سسک اٹھیں۔

"یا اللہ! میرے بچوں کے معصوم دلوں سے موت کا خوف نکال دے۔ میرے بھائی کا سایہ ان کے سروں پر، اس گھر پر قائم رکھنا یا رب۔ ہمیں ان کی بہت ضرورت ہے میرے مولا، بہت ضرورت ہے۔" اپنے اللہ کو پوری شدت سے پکارتے ہوئے ان کا روم روم ان ننھے فرشتوں کے لیے تڑپ اٹھا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میمونہ صدف

سہم زندگی

پرانا برگد اب بوڑھا ہوتا، اندر سے کھوکھل ہو چکا تھا پھر بھی پورے قد سے کھڑا تھا۔ دور دور تک اس کی پھیلی جٹیں بھی پیر فرتوت ہو کر سوکھ چکی تھیں۔ پتے جھڑنے لگے تھے۔ کبھی آندھی کا غبار آتا، جھکڑ چلتا تو جسم چھیدنے لگتا۔ پھر بوڑھا برگد گرد و نواح پہ نظر دوڑاتا۔ مُو تھا، مریم کا پنجہ اور سرکنڈے سر اٹھائے کھڑے، اسے عقیدت سے تکتے بھی تھے۔ سو بوڑھا برگد راز و نیاز کو اپنے تنے میں ہی سمیٹ لیتا۔ سب اکھڑتے جاتے تھے مگر وہ میدان کی ہریالی میں تنہا کھڑا تھا۔ وہ پورا نہیں مرتا تھا، روز چند اجزائے ترکیبی مرتے اور وہ روز اس مردہ حصے کے جنازے کو اکیلے اٹھاتا اور خود ہی دفناتا۔ عمل تناسخ سے گزرتا اور زندہ ہی رہتا۔ طائر آتے، بیٹھتے، آشیاں بناتے اور اڑ جاتے۔ اور وہ تنہا ہی رہتا۔ جانتا تھا جس روز زمین چھوڑے گا، اس روز طائر ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ کبھی کبھی وہ چلاتا کہ ہے کوئی جو مجھ سا شجر میرے بغل میں، میرے لیے، بسا دے۔ دیودار، اشوک، سفیدہ، پیپل، بھوج۔ اور وہاں اس کی آہ و فغان سننے والا کوئی نہ تھا۔

وہ بھی لرزاں وجود کے ساتھ بستر پہ پڑا اکی کساؤ کا شکار کھڑکی سے میدان میں لگے بوڑھے برگد کو انہی ملی جلی کیفیات سے تکتا رہتا تھا۔ دوست احباب سب چل بسے تھے اور جو رہ گئے وہ نہ چلنے جوگے نہ بلنے جوگے۔ حسرت ہی تھی کہ کوئی آئے، پاس بیٹھے، بولے چالے بھلے دو لفظ ہی سہی مگر بات تو کرے۔ ملازم آتے اور اس کی حاجت پوری کر کے چلے جاتے۔ وہ اسی کام کے لیے تو رکھے گئے تھے پھر اس بوڑھے کی دل جوئی میں وقت کیوں برباد کرتے۔ وہ بستر پہ پڑا اور اس ایک کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مارتا عزیز القدر کو ترس جاتا۔ قدرت نے تنہائی کی ایسی راج نیتی قائم کر ڈالی تھی کہ وہ بھی بوڑھے برگد کی مانند سارے راز و نیاز اندر ہی سموتا رہ جاتا تھا۔

☆☆☆

امانی ایک اکسیر گر کی اولاد تھا، بڑھاپے کی اکلوتی اولاد۔ باپ کی خواہش تھی کہ وہ اکسیر گر بنے اور ماں کی خواہش اسے افسر بنانے کی تھی۔ وہ نہ اکسیر گر بنا، نہ ہی افسر۔ وہ سخن گستر (شاعر) بن گیا۔ شعر کہنے لگا، داد سمیٹنے لگا۔ ہر آن مجمع اکٹھا کرتا اور محفل جمائے رکھنا ہی اس کا شوق ٹھہرا تھا۔ باپ نے نام امان اللہ رکھا تھا لیکن شاعر بنتے ہی وہ امان اللہ سے امانی بن گیا۔ ابا جی تب فوت ہوئے جب وہ نو برس کا تھا۔ بیوہ ماں لوگوں کے ہاں کھانے پکانے کا کام کرتی اور وہ سارا دن لوفروں کی طرح گلی گلی گھومتا شاعری میں کمال حاصل کرتا گیا۔ بارہ برس کا ہوا تو ماں بھی خون تھوکتے تھوکتے دنیا سے رخصت ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کی شاعری کا چرچا عام ہونے

لگا تھا کہ اتنی سی عمر میں وہ اتنے اعلا ذوق کی شاعری کرتا ہے۔ وہ اب کچھ ڈھنگ سے کمانے بھی لگا تھا لیکن جو کماتا اسی طرح یار دوستوں میں اڑا دیتا۔ جیب کبھی بھری ہوتی اور کبھی بالکل کنگلی۔

ان ہی دنوں جب اس کا شہرہ تھا تو خالہ جانی نے اس کا رشتہ اپنی رشتے کی بھتیجی سے طے کر ڈالا تھا۔ نوعمری میں ہی بیاہ رچا دیا گیا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی حالات تنگ ہونے لگے۔ وہ شوریدہ حال رہنے لگا۔ کتاب چھپتی تو معقول معاوضہ مل جاتا ورنہ سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتا رہتا اور پڑے پڑے شعر کہتا رہتا۔ اب مشاعروں میں بھی پہلے سا دم خم نہیں رہا تھا۔ نازی جو کبھی شوخ و شنگ لڑکی تھی، حالات کے سبب کملا کر رہ گئی تھی۔ نہ زیادہ پڑھی لکھی اور نہ ہی کسی ہنر میں ماہر کہ چار پیسے ہی کما لیتی۔

''گھر شعر و شاعری سے نہیں چلتا، کوئی ڈھنگ کا کام دھندا کرو کہ پیٹ بھرنے کو دو چار پیسے ہاتھ لگ سکیں۔'' وہ تنگ آ کر اسے سمجھانے بیٹھتی۔ خالی جیب مرد کی سب سے بڑی بدصورتی ہوتی ہے جیسے پھوہڑ پن عورت کی۔

''مجھے یہی سب آتا ہے۔'' وہ حقیقتاً یہی ہنر جانتا تھا۔

''جو نہیں آتا وہ سیکھا جا سکتا ہے۔''

''میں پرواز کرنا جانتا ہوں۔ سیکھ میری فطرت میں نہیں ہے۔ جو کام سیکھنے سے ہی ہو، وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں وہی کر سکتا ہوں جو بس میری فطرت میں رچا بسا ہے۔'' اس نے صاف جواب دیا۔

زندگی لایعنی ہونے لگی مگر امانی کو پروانہ تھی۔ وہ خود کو فنکار سمجھتا تھا اور شاعری کو حیات۔ اپنا فن چھوڑنا اسے کسی طور گوارا نہ تھا بھلے نوبت فاقوں تک جا پہنچی۔

''کاغذ کالے کرنا محنت کا کام نہیں، مشقت کرنا سیکھو گے تو گھر کی گاڑی چلا سکو گے۔'' نازی اس کے اشعار سن کر پھٹ پڑتی۔

''محنت کرتا ہوں بھلے مزدور نہیں ہوں۔ مزدوری تو ہر بندے کا کام ہے مگر شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو فطری ہنر ہے جو کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ شاعر ہوں، سڑک چھاپ نہیں کہ ایسے حقارت سے مخاطب کرو مجھے۔ ایک حلقے میں

نام ہے میرا۔ عزت ہے۔ بس تجھے قدر نہیں ہے۔"
"ایسی عزت اور نام کو دور سے سلام جو دو وقت کی روٹی نہ کھلا سکے۔ بیوی ہوں، معشوقہ نہیں کہ شعروں پہ داد دیتی جاؤں۔ بھوکے پیٹ سلانے والے شوہر کی قدر کوئی بیوی نہیں کرتی۔"
اپنے دونوں بیٹوں کو سینے سے لگائے وہ اپنے شوہر کو سمجھانے کی پوری کوشش کرتی جو اپنی بات سے ایک انچ نہیں ہلتا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سناتی اور ٹھیک ٹھاک سناتی کہ جب پیٹ خالی ہو، بچے بلکتے ہوں تو حقارت نفرت سب امڈنے ہی لگتا ہے۔
بڑھتی عمر الفاظ کا ذخیرہ گھٹانے لگی۔ وہ کیا سے کیا کہنے لگا تھا۔ مجمع چھٹتے چھٹتے بالکل گم ہو گیا۔ کبھی کبھار سجنے والی محافل ویران ہونے لگیں۔ ان دنوں ایک نئے شاعر میاں جی کا اس علاقے میں چرچا تھا۔ امانی اب کہیں پس منظر میں جا بیٹھا تھا۔ اسی کے مداح اب میاں جی کے گرد منڈلانے لگے۔ لوگ اب شاعری میں جدت چاہتے تھے اور امانی جدت پسند نہ تھا۔
"ایسی شاعری اب کوئی نہیں پڑھتا امانی جی۔ مفت میں چھپوانا ہے تو سو بسم اللہ۔" ناشر بڑی مطلبی قوم ہے۔ لکھاری کو کم دام دے کر اس کی تحریر سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ شاعر اور ادیب بھی گھر بار، بچوں والے ہوتے ہیں، انہیں بھی اپنا گھر چلانا ہوتا ہے جس کے لیے روپیہ درکار ہوتا ہے۔ نجانے سب یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں۔ کتابیں شائع ہونا بند ہو گئیں۔ سب آشنا یار پکھیرو بن کر پھر سے اڑ گئے جیسے...... انہی حالات میں نازی بھی ساتھ چھوڑ گئی، اس کا بھی اور زندگی کا بھی...... وہ بالکل اکیلا پڑ گیا تھا۔
اولاد تھی کہ اپنے اپنے گھروں کی ہوئی اور اسی میں خوش باش تھی۔ وہ اکیلے پن کا شکار ہوتے ہوتے بستر سے جا لگا۔ کبھی ایک بیٹا لے جاتا تو کبھی دوسرا۔ ایسا باپ جو ساری زندگی اپنی شاعری کی نذر کر چکا تھا، وہ اس کی زندگی کا اب کیا کرتے جو اپنے آپ خود کفیل ہوئے تھے۔
جس در پہ بھی پڑا ہوتا رات بھر جاگتا رہتا۔ یادوں کی ریل چلنے لگتی جہاں وہ تخت نشین سا شعر و سخن کہتا رہتا، سننے والے آفرین آفرین کرتے اور وہ حق سمجھ کر وصول کرتا جاتا۔ وہ تخت اس کی ملکیت تھا بھلے خوابوں میں ہی سہی۔ وہ پانی کا بلبلہ بنا اڑتا رہتا، نہ پھٹتا، نہ نکلتا...... پھر وہ ماضی سے حال کا سفر کرتا حقیقت میں لوٹ آتا۔ جہاں وہ اٹوائی کھٹوائی پڑا حکایت گو بن جاتا۔ جس کی داستان کہانی سے خالی، تنہائی سے بھری پڑی تھی۔ بیمار پڑے کھانستے بڈھے کو پانی پلانے والا میسر نہ تھا۔ دوا دارو کو کوئی طبیب نہ تھا۔ آکسیجن زدہ ماحول میں پڑا اسڑ بھی جاتا تو بھی سہارا دے کر باہر کوئی لے جانے والا نہ تھا۔ وہ بندوں کو ترس جاتا لیکن بندے اپنے اپنے کاموں میں محو اس کے لیے وقت کہاں سے نکالتے۔ بھری جوانی میں جس نے رشتوں اور گھر کی قدر نہ کی، اب بڑھاپے میں انہی دو کے لیے وہ مرا جا رہا تھا۔ وہ نازی جس پہ جوانی میں کم کم نظر ڈالتا تھا، اب بڑھاپے کی اس تنہائی میں رہ رہ کر یاد آتی تھی جب کسی کے پاس اسے دینے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ وہ خواب زادے سے حقیقت زادہ بن چکا تھا اور حقیقت بڑا رلاتی تھی اب۔
"کیا کمایا میں نے اپنے شوق اور ذوق کی خاطر؟ یہ تنہائی؟" بھرے مجمع کا عادی اب تنہائی کا عادی کیسے ہوتا۔
وہ کھڑکی سے باہر جھانکتا تو دور میدان میں کھڑا بوڑھا برگد اسے اپنے جیسا لگتا۔ اسے بھی بوڑھے برگد کی طرح کسی ساتھی کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس جیسے کسی زندہ انسان کی جو اس کی تنہائی کا ساتھی بن سکے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے بڑی ہمت مجتمع کر کے ایک فیصلہ لیا تھا۔

☆☆☆

"کچھ تو سوچا ہوتا ابا۔ عمر دیکھیں اور بات مانگیں۔" بڑا بیٹا رحمت غصے سے چلایا۔ امانی پچھلے تین برس سے اسی کے پاس قیام پذیر تھا۔ یہ اس کا آبائی گھر تھا جو دادا نے پائی پائی جوڑ کر بنایا تھا ورنہ وہ تو شاعری کے بل بوتے پہ ایک پھوٹی کوڑی نہیں جوڑ سکا تھا۔
"عمر کو دیکھ کر ہی بات کر رہا ہوں۔ یہ اس عمر کی اور میری ضرورت ہے۔" امانی کہیں سے بھی شرمندہ نہ تھا۔
"لوگ کیا کہیں گے ابا؟" وہ ساہوکار پیسے کی

زبان سمجھنے والا باپ کی زبان سمجھتا تھا نہ ہی باپ کو۔
"لوگوں کو خبر بھی ہے کہ میں زندہ ہوں؟ کون جانتا ہے کہ امانی اس دنیا کے کسی گوشے میں پڑا سڑ رہا ہے؟"
"امانی کو کوئی نہ جانے۔ رحمت اور رحیم کا باپ زندہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔" چھوٹا رحیم رحمت سے کہیں زیادہ غصے میں تھا۔
"ہاں سب جانتے ہیں سوائے رحمت اور رحیم کے جو زندہ باپ کو دیکھنے تک نہیں آتے۔"
"ہمیں لوگوں کو منہ دکھانا اور انھی میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ ہم کیسے ان کی زبانیں بند کریں گے؟ کیسے ان سے نظریں ملائیں گے؟"
"لوگوں کا کیا ہے۔ پہلے بولتے ہیں اور پھر زبان کے آرام کے لیے چپ سادھ لیتے ہیں۔ پھر ذہن کے آرام کے لیے بھول جاتے ہیں۔"
"اس عمر میں شرم نہ آئے گی ابا؟" رحمت نے اسے شرم دلانے کی کوشش کی جسے اپنی پسند کی شادی کے لیے لڑکی بھگاتے شرم نہ آئی تھی۔
"اس عمر میں مجھے شرم دلانے والے مجھ پہ رحم کیوں نہیں کرتے۔ اور کچھ نہ سہی اپنے ناموس کی ہی لاج رکھ لیتے۔"
"کچھ تو خیال کریں ابا۔"
"اتنے برسوں سے یہی تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ تو خیال کرو میرا۔ اب کوئی مل رہا ہے میرا خیال کرنے والا تو اسے آ لینے دو۔ میں بھی اپنا ہم رکاب چاہتا ہوں تو کیا غلط چاہتا ہوں؟"
"یہ عمر ایسی چاہت کے لیے ٹھیک نہیں۔" اب کی بار وہ کچھ نرم پڑے۔
"میری عمر کو پہنچو گے تو سمجھو گے کہ یہی عمر اس چاہت کی ہے۔ اسی عمر میں ساتھی کی قدر آتی ہے جب سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ جب سب بکھر جاتے ہیں یا خود میں سمٹ جاتے ہیں تو احساس جاگتا ہے کہ زندگی کے لیے ہم سفر ضروری ہے۔" اس کی آنکھوں کی نمی نازی کی قدردان تھی یہ دیکھ کر دونوں بیٹے خاموش ہو گئے۔
"حشمت صاحب کی بیوہ ہے رانی بی۔ میاں کے جانے کے بعد ہر رشتے پہ بوجھ بن چکی ہے۔ سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ہے اس کے پاس۔ اس رشتے میں بندھ جانے سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا مل جائے گا۔ جب کوئی مذہبی قباحت نہیں ہے، نہ ہی اخلاقی تو پھر انا کی قباحت کیوں؟ دو بوڑھے جن کا کوئی ساتھ دینے پہ آمادہ نہیں، کوئی خیال رکھنے والا نہیں، اگر ایک دوسرے کا ساتھ نباہنا چاہتے ہیں تو زمانے کو اعتراض کیوں ہے؟"
دونوں قائل نہ ہو سکے۔ بس خاموش ہو گئے۔ ان کے پاس اس سوال، اس دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔
"ہم کسی پہ بوجھ نہیں بن رہے بس ایک دوسرے کا بوجھ اٹھانا چاہتے ہیں۔ دو تنہائی کا شکار، بیمار، اگر ایک دوسرے کی دوا بن سکتے ہیں تو زمانہ کیوں ہم پہ انگلی اٹھائے ہوئے ہے۔ بڑھاپے کے نکاح کو کیوں بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا ضعیف کی سزا ہے کہ وہ مانده زندگی تنہا گزارے اور بیوہ پہ فرض کہ وہ ساری زندگی بیوگی کا حق ادا کرتی رہے؟ کیا بچی کچھی زندگی پہ ان کا حق نہیں رہتا۔ جوانی کی یاری سب کو پیاری اور بڑھاپے کا نکاح سب پہ بھاری۔ آخر کیوں؟" دونوں نے ایک دوسرے کی طرف چور نظروں سے دیکھا۔
"جس زمانے کی تمہیں پروا ہے میں اس کی پروا نہیں کرتا کیونکہ وہی زمانہ میری پروا نہیں کرتا۔ رانی بی سے نکاح میرا حق ہے۔ جو مجھے شرم دلاتا ہے اور اس بیوہ کو طعنے دیتا ہے پہلے خود جا کر شرم کرے اور اسی شرم سے بھلے ڈوب مرے۔" دونوں چپ چاپ باپ کے کمرے سے چلے گئے تھے۔
زوج کا جو حق وہ نازی کو جوانی میں نہیں دے سکا تھا اب بڑھاپے میں رانی کو دینا چاہتا تھا۔ رانی جسے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے بیوگی کی چادر اوڑھے دربدر پھرتے اور اپنے ہی محلے میں کھانے کی بھیک مانگتے دیکھتا تھا، اس سے کوئی دس برس ہی کم ہو گی۔ امانی اسی دھوپ میں جلتی بلتی بیوہ کے سر کی چھاؤں بننا چاہتا تھا بھلے پھیکی ہی سہی۔ وہ رانی بی کو اپنا اور خود اس کا ہم زندگی بنانے چلا تھا۔ اگر کسی کو اس سوچ پہ اعتراض تھا تو ہوتا رہے لیکن یہی اس کا فیصلہ تھا جو اٹل تھا۔

☆☆

زندگی خوب صورت ہے

زندگی خوب صورت نہیں تھی۔ بالکل بھی خوب صورت نہیں تھی۔ کم از کم اس کے لیے تو بالکل بھی خوب صورت نہیں تھی۔ اس کے لیے تو زندگی ہمیشہ سے ہی بہت بے رنگ، بے ڈھب، بے رونق اور بدصورت تھی۔ ہاں شاید بدصورت رہی تھی۔ بے رونق بھدی سی جیسے جولاہے کا کوئی کھیس جگہ جگہ سے ادھڑا اور کھونچ لگا ہوا۔ اس کے لیے بھی تو زندگی ایسی ہی تھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی کھونچ لگی، دری یا کھیس کی طرح بھدی بے کار یا پھر گاموکمہار کے ٹوٹے گھڑوں اور صراحیوں جیسی۔ نہیں بلکہ غلاموں کے بنائے ہوئے ٹیڑھے میڑھے برتنوں جیسی۔ خراب ہوجانے والی ہانڈیاں، صراحیاں، تاسیں (پانی والے پیالے)

جو گاموسے صحیح نہ بن پاتے وہ انہیں کمائی ہوئی مٹی کے ڈھیر کے پاس ہی پھینک دیتا تھا اور غلاموا سے اٹھا کر اکٹھا کر کے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چھوٹی چھوٹی

صراحیوں، ہانڈیوں اور پیالیوں کی شکل دیتا لیکن غلامو کبھی بھی ٹھیک سے صراحیاں اور ہانڈیاں نہ بنا پاتا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کجی کوئی نہ کوئی خرابی رہ جاتی تھی۔ کبھی صراحی کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوتی، کبھی گھڑا ٹیڑھا بنتا، کبھی ہانڈی عجیب سی ہیت اختیار کر لیتی تو اسے بھی زندگی غلامو کے بنائے ہوئے برتنوں کی طرح لگتی تھی۔ جس میں کجی تھی ٹیڑھا پن تھا۔

غلامو بہت محنت سے کچی کچی صراحیاں گھڑے اور دوسرے برتن بنا کر دھوپ میں سکھا کر اسے دیتا تو وہ نہ لیتی۔

"میں ان کا کیا کروں گی غلامو!"

"کھیلنا...... سب لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ اپنی گڑیا کے جہیز میں رکھنا۔" وہ مدبر سا بنا سمجھاتا۔

لیکن اسے ان ٹیڑھے میڑھے برتنوں سے دلچسپی نہ تھی۔ نہ اس کے پاس کوئی گڑیا تھی نہ وہ کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح مٹی کے ننھے ننھے برتن سجا کر کھیلتی تھی۔ زندگی تو اس کے لیے ویسے بھی ایسی ہی تھی بے ڈھنگی ٹیڑھی میڑھی یا پھر زندگی اسے گامو کمہار کی چاک سے الگ کی ہوئی صراحی کی گردن کی طرح لگتی تھی۔ چاک کی گردش دھیمی کر کے دھاگے کی مدد سے جب گاموں کمہار صراحی کی گردن الگ کرتا تو وہ اپنی دیوار پر بیٹھی گامو کو مہارت سے صراحی کی گردن الگ کرتے دیکھتی تھی۔ تو زندگی اس کے لیے ایسی ہی تھی بغیر دھڑ کے صراحی کی گردن کی طرح یا بغیر گردن کی صراحی کی طرح صرف دھڑ ہی دھڑ یا صرف گردن۔ ہاں زندگی ایسی ہی تھی۔ یا پھر کسی بنجر صحرائی زمین کی طرح جس میں صرف گھاس پھونس اگتی ہے یا پھر کانٹے دار جھاڑیاں بے پھل کی۔

ہاں زندگی اس کے لیے ایسی ہی تھی۔ ایسی ریتیلی زمین جیسی جس میں صرف کانٹے دار جھاڑیاں اگتی تھیں اور کانٹے جسم میں چبھ کر بدن لہولہو کرتے تھے یا پھر اونچے نیچے پتھریلے راستوں جیسی کہ جتنا بھی بچ بچ کر چلو پاؤں کے تلوؤں میں کوئی نہ کوئی کنکر یا پتھر چبھ ہی جاتا تھا۔ زندگی ایسی ہی تھی اس کے لیے کنکروں اور پتھروں سے بھری جو ہر آن پاؤں کے تلوؤں میں چبھتے اور انہیں زخم زخم کرتے تھے یا پھر زندگی خوف ناک طوفانی بارشوں جیسی تھی جو سب کچھ تہ وبالا کر دیتی ہے۔ سیلابی ریلے جیسی...... ہاں زندگی اس کے لیے سیلابی ریلا ہی تھی، سب کچھ بہا کر لے جانے والی تو زندگی اس کے لیے خوب صورت نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں تھی۔ ہاں، زندگی خوب صورت نہیں ہے۔

☆☆☆

اس نے ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے دیکھا۔ گلی میں ہلکا شور تھا اور سفید لبادوں والے درویشوں کی ایک ٹولی گلی میں سے گزر رہی تھی۔ یہ درویش سفید لمبے فراک نما لباس پہنتے تھے۔ اور سر پر سرخ رومی یا پتا نہیں شاید ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ ہر چھ سات ماہ بعد وہ سر جھکائے گلی میں داخل ہوتے تھے اور مہنگے کی دکان کے سامنے رک جاتے تھے۔ ان کی پیٹھ دکان کی طرف ہوتی تھی اور وہ سامنے سبز دروازے والے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے بایاں ہاتھ دل کے مقام پر رکھ کر عقیدت سے سر جھکاتے اور پھر یونہی سر جھکائے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ جب بھی گلی میں آتے مہنگا سب کام چھوڑ کر اپنی دکان کے تھڑے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں عقیدت لیے وہ انہیں اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔

ایک بار اس نے مہنگے کو تھڑے سے نیچے اتر کر عقیدت سے ان کے ہاتھ چومتے دیکھا تھا۔ آج چوتھی بار وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

اسے یہاں آئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا یا شاید کچھ زیادہ نہیں بلکہ اسے یہاں آئے ایک سال اور نو مہینے ہو گئے تھے۔ ایک سال نو ماہ پہلے خالہ ناصرہ اسے گاؤں سے اپنے ساتھ یہاں لے کر آئی تھیں۔ خالہ ناصرہ باقر رنگ ساز کی بیوی تھیں اور اس کی مرحوم ماں کی خالہ زاد بہن تھیں۔ وہ تو دنوں مہینوں کا حساب کم ہی رکھتی تھی اگر کل سے پہلے کوئی اس سے پوچھتا کہ اسے یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے تو وہ کبھی بھی ٹھیک نہ

بتا پاتی یہ تو غلامو تھا...... غلام رسول...... گامے کمہار کا بیٹا جس نے کل شام اسے بتایا تھا کہ اسے گاؤں سے آئے پورا ایک سال نو مہینے اور تین دن ہو گئے ہیں۔
"اچھا، تم نے اتنا حساب کیسے رکھ لیا غلام رسول!"
بہت پہلے جب ایک بار مولوی صاحب نے سب بچوں کو سمجھایا تھا کہ کسی کے نام نہیں بگاڑتے اللہ کو پسند نہیں ہے تو اس نے اسے غلامو کے بجائے غلام رسول کہنا شروع کر دیا تھا اور گامو کمہار کو بھی گامو چاچا کے بجائے غلام دین چاچا کہتی تھی۔
"بس رکھ لیا حساب۔" غلام رسول نے نظریں چرالی تھیں۔
"غلام رسول کے پاس جب کسی سوال کا جواب نہ ہوتا تو وہ یونہی نظریں چرا لیتا تھا۔ اور غلام رسول کے پاس تو اکثر ہی اس کے سوالوں کے جواب نہیں ہوتے تھے پھر بھی وہ اس سے کوئی نہ کوئی سوال کرتی ہی رہتی تھی کہ کبھی کبھی وہ اس کے کسی نہ کسی سوال کا جواب دے بھی دیا کرتا تھا۔"
غلام رسول جسے سب گاؤں میں غلاماں یا غلامو کہتے تھے، نہ تو اس کا کوئی قریبی عزیز تھا نہ دور کا رشتہ دار لیکن دونوں گھروں کی دیواریں سانجھی تھیں۔
گاؤں کے گھروں میں صحن کی دیواریں اتنی اونچی نہیں ہوتیں یا شاید کہیں کسی گھر کی دیواریں اونچی بھی ہوتی ہوں گی جیسے مولوی صاحب کے اور استاد تاج دین کے گھر کی دیواریں۔ لیکن ان کے صحن کی دیواریں اونچی نہیں تھیں وہ آرام سے مرغیوں کے ڈربے پر چڑھ کر جسے وہ کھڈا کہتی تھی غلام رسول کے گھر جھانک لیتی تھی اور کبھی جو فارغ ہوتی اور چاچی گھر پر نہ ہوتیں تو وہ دیوار پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی اور غلام دین چاچا کو چاک پر برتن بناتے دیکھتی رہتی اور دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھے برتنوں کے پاس بیٹھے غلام رسول کو جو غلام دین کی پھینکی ہوئی مٹی کو اٹھا کر دوبارہ سے برتن بناتا رہتا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا۔
"تمہیں پتا ہے نا غلام رسول، کہ تم چاچا جیسے برتن نہیں بنا سکتے تو پھر کیوں توڑ توڑ کر بناتے رہتے ہو۔ خواہ مخواہ ہلکان ہوتے رہتے ہو۔"
"مجھے ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنا اچھا لگتا ہے تاسین فاطمہ!۔"
وہ ہمیشہ اس کا پورا نام لیتا تھا۔ اس کی ماں نے تو اس کا نام تحسین فاطمہ رکھا تھا لیکن پتا نہیں کب وہ تحسین فاطمہ سے تاسین ہو گئی تھی اور تحسین صرف کاغذات میں ہی لکھا رہ گیا تھا۔
"بھلے دوبارہ جڑنے کے بعد وہ بدشکل اور بھدے ہو جائیں۔ بھلے ان میں کوئی کجی کوئی ٹیڑھا پن رہ جائے۔"
"تو......!"
غلام رسول حیرت سے اسے دیکھتا اور کمائی ہوئی مٹی کی لوئی اٹھا لیتا۔
"رہ جائے، کون سا مجھے ان کو بیچنا ہوتا ہے۔ یہ تو میں اپنی تسکین کے لیے بناتا ہوں جب بابا سے کوئی برتن خراب ہو جاتا ہے اور وہ گول مول کر کے اسے پھینک دیتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے میں اس مٹی کو دوبارہ کوئی شکل دے دوں پہلے سے بھی اچھی۔"
اور وہ ایسا کبھی نہ کر سکا تھا۔ یا شاید کبھی کوئی اچھی شکل دے بھی دی ہو تو اسے پتا نہیں تھا کہ وہ ہر وقت تو دیوار پر ٹنگی نہیں ہوتی تھی۔ بقول چاچی کے کہ وہ تو ہر وقت دیوار پر ہی ٹنگی ہوتی ہے اور چاچی جس قدر فراٹے سے جھوٹ بولتی تھی اس کا علم تاسین فاطمہ سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔
"کیا تم ٹوٹے ہوئے انسانوں کو بھی جوڑ لیتے ہو غلام رسول!" ایک بار اس نے پوچھا تھا اور غلام رسول کسی صراحی کی گردن اٹھا کر دیکھنے لگا تھا جسے کچھ دیر پہلے غلام دین نے بہت نفاست اور مہارت سے دھاگے کی مدد سے الگ کیا تھا۔
ان دنوں اسے اپنا آپ کسی ٹوٹے پھوٹے برتن کی طرح ہی لگتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی اس کے ٹوٹے پھوٹے وجود کو توڑ کر پھر سے بنائے۔ بھلے بدصورت اور بھدا ہی سہی، لیکن وہ اس موجودہ ہیت سے نکل آئے۔ وہ تاسین فاطمہ نہ رہے کچھ اور بن

جائے اس اتنے بڑے صحن والے گھر کے بجائے کسی جھگی میں رہنے والی وہ گندی مندی بچی ہی کیوں نہ ہو جو سارا وقت گاؤں سے باہر جھگیوں کے آگے کھیلتی رہتی تھی اور نہیں تو ڈگڈگی والے کی بندریا ہی بن جائے بس تاسین فاطمہ نہ رہے۔

☆☆☆

تو اسے ایک سال نو ماہ تین دن ہو گئے تھے اس سبز دروازے والے اور بوگن ویلیا کے سفید اور کاسنی پھولوں والے اس گھر میں آئے۔ اور ایک سال نو ماہ پہلے اس نے اس گھر کی بالکونی میں سے نیل گھروں کی گلی کی رونق کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ اور گلی میں سے گزرتے سفید لبادوں والے درویشوں کو بھی اور آج وہ چوتھی بار دیکھ رہی تھی۔ لیکن آج وہ آگے جانے کے بجائے گلی کے وسط میں رک گئے تھے۔ آج وہ چار تھے۔ تین تو وہی تھے سفید لمبی فراکوں اور سرخ ٹوپیوں والے جبکہ چوتھا لمبا سا سبز کرتا پہنے ہوئے تھا اور اس کے بال زلفوں کی صورت اس کے کندھوں پر لہراتے تھے۔ وہ چوک کے وسط میں کھڑا ہولے ہولے زمین پر اپنے ننگے پاؤں سے دھمک پیدا کرتا تھا۔ پھر جیسے اس دھمک میں ایک ردھم سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے بوگن ویلیا کی ٹہنیاں ہٹا کر نیچے جھانک کر دیکھا اس کی ایڑی ایک ترتیب سے زمین پر لگتی تھی اور دھمک پیدا کرتی تھی۔

اس نے دیکھا مہنگا اپنی دکان سے اتر کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اس نے سر جھکائے کھڑے تینوں درویشوں کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تھا۔ ایک درویش نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تھی وہ پتا نہیں ہولے ہولے ان سے کیا بات کرتا تھا، وہ سن نہیں پائی تھی۔ وسط میں کھڑا لمبی سیاہ زلفوں اور سبز کرتے والا اب ہاتھ پھیلائے گول گول گھوم رہا تھا اور اس کے لبوں سے یا حبیبی یا حبیبی نکلتا تھا اور آنکھوں میں سرخ رنگ کے ڈورے تیرتے تھے۔ پھر جیسے یکدم ہی آس پاس سب آوازیں مر گئی تھیں۔ بس ایک آواز آ رہی تھی

حبیبی حبیبی حبیبی یا نور العین
حبیبی یا نور العین یا ساکن خیالی
معاک البدایۃ وکل الحکایۃ
معاک للنھایۃ حبیبی یا نور العین
حبیبی یا نورا العین ......یا نور العین

ترجمہ: (میرے پیارے میرے پیارے میرے پیارے آنکھوں کے نور۔ میرے پیارے میری آنکھوں کے نور، اے مجسم تصور۔ تمہارے ساتھ میری شروعات ہے اور ساری عمر رہے گی۔ آخر تمہارے ساتھ ہی ہے۔ میرے پیارے آنکھوں کے نور)

اس آواز میں سوز تھا درد تھا پکار تھی تینوں میں سے کوئی ایک درویش گاتا تھا جب وہ حبیبی یا نور العین کہتا تو گول گول گھومتا سیاہ لمبی زلفوں والا زور سے پاؤں کی ایڑی زمین پر مارتا بلند آواز سے حبیبی یا نور العین کہتا اور پھر اس کے رقص میں تیزی آ جاتی۔

حبیبی یا نور العین۔
(میرے پیارے میری آنکھوں کے نور)
عیونک معایا وعیو نک کفایۃ
(تمہاری آنکھیں میرے ہمراہ رہتی ہیں اور تمہاری آنکھیں ہی میرے لیے کافی ہیں)
تنور لیالی حبیبی یا نور العین
(یہ میری راتوں کو روشن کرتی ہیں میرے پیارے میری آنکھوں کے نور)

وہ نہ الفاظ، نہ الفاظ کے معانی سمجھ پا رہی تھی لیکن آواز اور اس کی مٹھاس اور سوز دل کو کھرچتے تھے۔ گانے والا درویش یکدم ہی خاموش ہوا تو اس نے زمین پر ایڑی مارتے ہوئے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور تیز تیز چلنے لگا تو وہ تینوں بھی اس کے پیچھے سر جھکائے تیز تیز چلنے لگے تو وہ سیدھی ہوئی۔ نیچے گلی میں جو چند لمحے پہلے ساکت ہو گئی تھی پھر ہولے ہولے آوازیں جاگنے لگی تھیں۔ بلند ہونے لگی تھیں۔ چائے، پکوڑے گرم، نہ جانے کتنی آوازیں تھیں لیکن اس کے کانوں میں ایک ہی آواز آتی

تھی۔

حبیبی حبیبی یا نور العین

وہ ایک بار پھر جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ یہاں کی اور گاؤں کی زندگی میں بہت فرق تھا۔ گاؤں کی زندگی کے اپنے رنگ تھے اور یہاں کے اپنے رنگ۔ لیکن اس کے لیے زندگی یہاں بھی بے رنگ تھی کسی فقیر کی پھٹی پرانی گدڑی کی طرح جس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوں۔ حالانکہ یہاں نہ چاچی کی مار تھی نہ پھٹکار، نہ اسے سارا دن کام کرنا پڑتا تھا پھر بھی زندگی اسے ایسی ہی لگتی تھی، بدرنگ...... کسی فقیر کی پھٹی پرانی گدڑی کی طرح۔ وہ یونہی بوگن ویلیا کے پتوں اور پھولوں کو ادھر ادھر کرنے لگی تھی جب خدیجہ نے آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو تاسین۔''

''کچھ نہیں بس یونہی نیچے گلی میں دیکھ رہی تھی درویشوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری انہیں ہی دیکھتی رہی۔ ان میں سے ایک کچھ گا تا تھا بڑا ہی دلگداز سا کچھ سمجھ تو نہیں پائی تھی کیا، پر دل میں اترتے تھے۔ پتا نہیں بول یا اس کی آواز کا سوز، پتا نہیں کیا۔'' اور خدیجہ نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ اس کے کندھے سے ہٹا لیا۔

''چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے۔'' نہ...... نہیں ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو کوئی اور ہی زبان تھی عربی یا پتا نہیں فارسی یا شاید عربی ہی تھی۔''

خدیجہ ناصرہ خالہ کی دوسرے نمبر والی بیٹی تھی۔ خدیجہ باقر جواب خدیجہ سعید تھی۔ تین دن پہلے ہی دبئی سے آئی تھی اور اسے بہت اچھی لگی تھی۔ نرم مزاج دھیمے لہجے میں باتیں کرنے والی خدیجہ کی آنکھوں میں بلا کا سوز تھا۔ بڑی ہی قاتل آنکھیں تھیں اس کی سحر طاری کرتی ہوئی سی۔

''یہ درویش لوگ پتا نہیں کون ہیں...... کہاں سے آتے ہیں...... کدھر جاتے ہیں خدیجہ آپی میں نے آج چوتھی بار ان کو دیکھا ہے۔''

اس نے خدیجہ کی طرف دیکھا جو ریلنگ پر ہاتھ رکھے تھوڑا سا جھکی گلی میں شاید درویشوں کو دیکھ رہی تھی جو گلی کا موڑ مڑ رہے تھے۔ خدیجہ کی آنکھوں کے سامنے کوئی دلربا چہرہ لہرایا تھا۔ کچھ نقوش بننے اور مٹنے لگے تھے۔

''شہزادہ عالمگیر۔'' اس نے بے آواز کہا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں۔ لیکن میری شادی سے پہلے ایسے ہی صوفی ایک بار یہاں آئے تھے۔ پتا نہیں اب یہ وہی ہیں یا کوئی اور پھر شہزادہ بھی ایک روز گھر سے ان کے پیچھے چلا گیا جب واپس آیا تو ان کا ہی روپ دھارے ہوئے تھا۔ ایسا ہی سفید لباس پہنے اپنے آپ سے بے خبر۔''

''اور یہ شہزادہ کون تھا خدیجہ آپی؟''

سوال کرنے کی تو اسے بچپن سے ہی عادت تھی۔ اس کے پاس بے انت سوال تھے لیکن جن کے جواب کبھی نہیں ملے تھے۔

''شہزادہ......!'' خدیجہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکی تھی۔ ''شہزادہ حاجی صاحب اور زینب خالہ کا بیٹا تھا وہ جن کا بڑا سا گھر گلی کے آخر میں ہے۔''

''تھا...... یعنی اب نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں وہ مر گیا تھا بالکل اچانک حاجی صاحب اور زینب خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا وہ۔''

''کیا ہوا تھا اسے۔''

تاسین فاطمہ کو افسوس ہوا۔ زینب خالہ کے گھر وہ ناصرہ خالہ کے ساتھ دو تین بار گئی تھی۔ کتنی شفیق سی اور محبت کرنے والی تھیں کیسے گلے لگا کر اسے پیار کیا تھا۔ اس طرح تو کبھی کسی نے اس کو گلے لگا کر پیار نہیں کیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کاش زینب بی بی اس کی ماں ہوتیں۔ وہ بالکل ویسی ہی تھیں جیسے اس کے تصور میں ماں کا خاکہ بنتا تھا۔

''پتا نہیں گلی والے کہتے تھے اسے کسی سے عشق ہو گیا تھا اور اس عشق نے اس کی جان لے لی۔''

خدیجہ کو اس سے اپنا آپ مجرم سا لگا۔ لیکن پھر اسے پروفیسر حامد کی بات یاد آئی جو کہتے تھے کہ وہ

دوراستوں کا مسافر تھا اور اس کشمکش نے اس کی جان لی۔ تو مضطرب دل کو ذرا سا سکون ملا۔

''یہ عشق کیوں ہو جاتا ہے خدیجہ آپی؟'' سوال تو جیسے اس کی نوک زبان پر دھرے رہتے تھے۔

''پتا نہیں......'' خدیجہ نے کندھے جھٹکے۔

''ایک بار میں نے حاجرہ آپا سے پوچھا تھا جب میں ان سے اردو کے اشعار کی تشریح سمجھنے جاتی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ اس کیوں کا جواب تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ تو بس ہو جاتا ہے۔ کبھی بندے سے کبھی خالق سے۔ اور حاجرہ آپا کہتی تھیں سچا عشق تو بس خالق سے ہی ہوتا ہے۔ باقی سب جھوٹ اور فریب ہے۔''

''لیکن خالق سے عشق کرنے کا یارا تو ہر ایک میں نہیں ہوتا خدیجہ آپی! خالق سے عشق کرنے کے لیے اپنی جھولی میں بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ میرے جیسے کالے میلے دل والے بھلا کہاں اس قابل ہوتے ہیں کہ خالق سے عشق کا دعوا کر سکیں۔ یہاں تو جسے دیکھو دل کا کلوس چھپائے پارسا بنا پھرتا ہے، جھوٹے عاشق۔''

اسے چاچی کا بھائی یاد آ گیا تھا۔ یہ لمبی داڑھی ہاتھ میں تسبیح لیے اللہ ہو کے نعرے لگاتا ہوا اور......

خدیجہ باقر جواب خدیجہ سعید تھی حیران سی اس اٹھارہ سالہ تحسین فاطمہ کو دیکھنے لگی جو اس کے خیال میں ان پڑھ اور بے وقوف سی لڑکی تھی۔ وہ ان پڑھ تو ہوگی لیکن بے وقوف ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ ہاں یقیناً بے علم بھی نہیں تھی۔

''خالق کا سچا عاشق تو کوئی کوئی ہوتا ہے نا خدیجہ آپی جیسے رابعہ بصریؒ جیسے حسین بن منصور۔''

یہ غلام رسول تھا جو اسے کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا اور اس کا بتایا آج خدیجہ کو حیران کرتا تھا وہ حیرت سے اسے دیکھتی تھی...... یہ تحسین فاطمہ تھی اس کی اماں کی خالہ زاد بہن کی بیٹی۔ اماں کی اس خالہ زاد بہن کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ تحسین فاطمہ سے بھی اب پہلی بار ملی تھی۔ اماں نے اسے بتایا تھا کہ برسوں بعد وہ کسی عزیز کی وفات پر خالہ زاد بہن کے گاؤں گئی تھیں تو وہاں انہیں پتا چلا کہ خالہ زاد بہن کی اکلوتی بیٹی پر اس کی چاچی بہت ظلم کرتی ہے اور وہ جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ وہ اپنی بھانجی کو ساتھ لے جائیں۔

غلام دین کمہار جو تحسین فاطمہ کے پڑوس میں رہتا تھا، وہ اور اس کا بیٹا خاص طور پر فوتی والے گھر میں ان سے ملنے آئے تھے۔ غلام دین تب سے انہیں جانتا تھا جب ان کی خالہ زاد زندہ تھیں تو وہ ان کے گھر جایا کرتی تھیں۔ اور غلام دین کی تب باقر سے بہت دوستی تھی۔ اور غلام دین نے بھی ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تاسین فاطمہ کو اپنے ساتھ لے جائیں کہ اس کی زندگی یہاں بہت مشکل تھی اور اماں اسے ساتھ لے آئی تھیں۔

زندگی اس کے لیے تھی تو مشکل ہی بلکہ بہت ہی مشکل، لیکن زندگی کے دائرے میں آدمی نہ اپنی مرضی سے داخل ہوتا ہے نہ اپنی مرضی سے نکل سکتا ہے۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کی اس دائرے سے نکل گئی ہوتی شاید کچھ لوگوں کے لیے زندگی خوب صورت ہوتی ہوگی لیکن اس کے لیے تو زندگی آگ پر رکھا ہوا برتن تھی۔ آگ جو برتن کے پیندے کو جلاتی تھی اور اپنے دھویں سے سیاہ کرتی تھی۔

''تاسین فاطمہ تمہیں زندگی خوب صورت کیوں نہیں لگتی۔''

وہ جو غلام رسول سے ہر وقت کچھ نہ کچھ پوچھتی رہتی تھی۔ اس نے بھی ایک روز پوچھ لیا۔

''نہیں لگتی بس۔'' اس نے کندھے اچکائے تھے۔

''یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے غلام رسول! زندگی میں کچھ بھی تو ایسا نہیں ہے جو خوب صورت ہو۔''

''پر مجھے تو زندگی خوب صورت لگتی ہے تاسین فاطمہ یہ سامنے ذرا سرسوں کے کھیتوں کو دیکھو کیسا سونا سا بکھرا لگتا ہے ہر سو پیلے پھولوں نے جیسے آگ لگا رکھی ہو اور یہ اوپر نیلے آسمان پر اڑتے پرندے۔ رات کے وقت چمکتا چاند اور تارے اور وہ دور پہاڑ...... کیا کوئی بھی چیز تمہارے لیے زندگی کو خوب صورت نہیں بناتی۔''

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ بھلا ان چیزوں سے بھی کبھی زندگی خوب صورت ہوئی ہے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ سب دیکھ رہی ہے۔

وہ حیران ہوتا۔

"لیکن میں تو جب رات اوپر چھت پر سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو کتنی ہی دیر تک آسمان پر جگمگ جگمگ کرتے تاروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ حیران ہوتا رہتا ہوں کہ اللہ نے یہ کتنی پیاری دنیا بنائی ہے۔ تاروں بھرا آسمان اتنا خوب صورت لگتا ہے مجھے اور میں جب اللہ صناعی پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے چاندنی راتیں ہی نہیں اماوس کی راتیں بھی بہت خوب صورت لگتی ہیں جب چاند نہیں ہوتا، اور سیاہ آسمان پر تارے پوری آب و تاب سے چمکتے ہیں۔ پتا ہے تحسین فاطمہ، جب برسات کی راتوں میں جگنوؤں کے قافلے سامنے والے درختوں کے جھنڈ میں سے اڑتے ہیں تو میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ مسلسل بارشوں کی وجہ سے ابا کے بنائے برتن نہیں سوکھے اور آج صبح ہمارے گھر میں صرف چند مٹھی آٹا تھا جس سے پتلی پتلی سی دو روٹیاں بنی تھیں۔ اماں ابا نے آدھی آدھی روٹی پر پیاز کی گٹھی توڑ کر رکھی تھی اور اس سے روٹی کھائی تھی اور مجھے پوری روٹی پر گڑ کی چھوٹی سی ڈلی رکھ کر دے دی تھی۔ لیکن اس وقت جب جگنوؤں کی قطاریں درختوں کے جھنڈ میں اڑتی ہیں تو میں ہر غم بھول جاتا ہوں۔ یاد رہتا ہے تو صرف یہ کہ میرے اللہ نے یہ کتنی پیاری اور خوب صورت دنیا بنائی ہے۔"

وہ تحسین سے صرف چار سال بڑا تھا اور دس سالہ تحسین کو اس کی باتیں حیران کرتی تھیں۔ وہ بہت دھیان سے اس کی باتیں سنتی تھی اور جیسے ہی اس کی بات ختم ہوتی اسے اپنے دکھ یاد آجاتے اور غلام رسول کی باتیں اندر کہیں ذہن کے کسی گوشے میں جمع ہو جاتیں۔ اسے یاد آجاتا کہ اس نے آج دن کو بھی روٹی نہیں کھائی تھی اور رات کو بھی اس کے لیے روٹی سالن نہیں بچا تھا۔ برتن دھوتے ہوئے مٹی کی ہانڈی میں لگی چنے کی دال کو اس نے انگلیوں سے پونچھ پونچھ کر چاٹا تھا۔ دسترخوان جھاڑتے ہوئے روٹی کے وہ کنارے جو اس کا چچازاد بھائی کھاتے ہوئے الگ کر دیتا تھا چن کر کھائے تھے پھر بھی پیٹ میں بھوک سے بل پڑتے تھے۔ جب کھانے کو کچھ نہ ملے اور سارا دن کولھو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑے اور کام کے ساتھ ساتھ چاچی کی مار اور کوسنے بھی سننے پڑیں تو تاروں بھرا آسمان اور جگنوؤں کے قافلے زندگی کو اس کے لیے خوب صورت نہیں بناتے تھے...... بالکل بھی نہیں۔

بھلے غلام رسول کو زندگی کتنی بھی خوب صورت کیوں نہ لگتی ہو اسے زندگی خوب صورت نہیں لگتی تھی۔ وہ تو چھت پر اپنی جھلنگا سی چارپائی پر لیٹ کر نہ تو تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتی تھی نہ ہی جگنوؤں کے قطاریں اسے اچھی لگتی تھیں۔ وہ تو پیٹ پر ہاتھ رکھے اوندھی لیٹی اس بھوک کو دبانے کی کوشش کرتی تھی جو اسے بدحال کیے ہوتی تھی۔

"تو حاجرہ آپا کہتی ہیں عشق کیوں ہوتا ہے، اس کا جواب تو کسی کے پاس نہیں۔ وہ جس نے عشق کیا اور وہ جس نے عشق نہیں کیا، دونوں کے پاس ہی۔"

خدیجہ ہولے ہولے بولتی ہوئی دور خلاؤں میں جانے کیا تکتی تھی۔

"کیا آپ نے بھی کبھی عشق کیا ہے؟"

تحسین فاطمہ کے دل میں پتا نہیں کیا آیا کہ اپنے خیالوں کو جھٹک کر پوچھ بیٹھی تھی۔

خدیجہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا تصور میں کچھ مٹے مٹے سے نقش تھے جو بنتے تھے اور بگڑتے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا تھا عشق تھا یا...... بس چند لمحوں کا کھیل تھا۔

"عشق تو کسی سے بھی ہو سکتا ہے نا آپی! اللہ سے بندوں سے، ماں باپ سے، بچوں سے، اپنے کام سے، کسی سے بھی، جیسے غلام دین چاچا کو مٹی سے چاک سے، چکیت سے عشق ہے۔ غلام رسول کہتا ہے ابا کو اپنے کام سے عشق ہے اور مجھے قرآن سے اللہ

سے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق
ہے۔ وہ کہتا ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس عشق میں فنا
ہو جاؤں۔ لیکن چاچا ایسا نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے
اپنے کام سے عشق ہے۔ کیونکہ میرا بابا کہتا تھا جب
تک کام سے عشق نہ ہو کام بھی سیدھا (سیدھا) نہیں
ہوتا کہیں نہ کہیں اس میں کمی آ جاتی ہے۔ خدیجہ آپی!
کیا عشق میں فنا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

خدیجہ پتا نہیں اس کی بات سن بھی رہی تھی یا
نہیں پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔ خدیجہ چونکی۔

"پتا نہیں، لیکن وہ تو فنا ہو گیا نا۔"

"وہ کون۔" اس نے پوچھا۔

"وہ......" خدیجہ جیسے ابھی تک ماضی کی بھول
بھلیوں میں گھومتی تھی۔

"ہاں وہ......"

تب ہی خدیجہ کا دو سالہ بیٹا روتا ہوا بالکونی میں
آیا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں بہن کی شکایت کر رہا تھا
جس نے اس کا بھالو لے لیا تھا۔ خدیجہ نے جھک کر
اسے گود میں اٹھا لیا وہ ماضی سے حال میں آ گئی تھی۔
اس کے دو بچے تھے بڑی بیٹی آمنہ پانچ سال کی تھی وہ
شادی کے بعد دوسری بار پاکستان آئی تھی۔ ایک بار
چار سال بعد اور اب تقریباً دو سال بعد۔

"تحسین! میں تو تمہیں بلانے آئی تھی۔ مجھے
بازار جانا ہے۔ اماں کے گھٹنوں میں درد ہے تم ساتھ
چلو گی نا۔"

خدیجہ نے بیٹے کو کندھے سے لگایا۔ تحسین نے
سر ہلا دیا۔

"اماں کہہ رہی تھیں تمہارے لیے بھی گرمیوں
کے دو تین سوٹ لے لوں۔ تم ساتھ چلو گی نا تو اپنی
پسند سے لے لینا۔"

"لیکن میرے پاس تو کپڑے ہیں۔"

خدیجہ کی بات پر تحسین حیران ہوئی تھی۔

"ابھی پچھلے سال ہی تو خالہ نے مجھے دو تین
جوڑے لے کر دیے تھے۔ وہ بالکل نئے نکور ہیں
خدیجہ آپی۔"

"وہ تو پچھلے سال لیے تھے نا۔ اب تو نئے آئے
ہوں گے۔" خدیجہ نے اس کے ماتھے پر آئی بالوں کی
لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کیا "خوش رہا کرو گڑیا۔ اماں کہتی
ہیں بہت چپ چپ رہتی ہو۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں جیسے
کوئی شوق نہیں ہیں تمہیں۔"

خدیجہ کو اپنی یہ سادہ سی خوب صورت سی کزن بہت
اچھی لگی تھی۔ وہ اماں کی خالہ زاد بہن اور تحسین سے اس
سے پہلے بھی نہیں ملی تھی۔ تحسین کی اماں کے فوت ہونے
کے بعد شاید اماں بھی گاؤں گئی ہی نہیں تھیں۔

"میرے پاس تو خوش ہونے کے لیے کچھ بھی
نہیں ہے پھر میں کیسے خوش رہا کروں۔" اس کا دل چاہا
وہ خدیجہ سے پوچھے لیکن پھر خاموشی سے خدیجہ کے پیچھے
پیچھے چلتی ہوئی بالکونی سے کمرے میں آ گئی۔

ایک بار اس نے غلام رسول سے یہ ہی بات کہی تھی۔

"لوگ پتا نہیں کیسے خوش ہوتے ہیں میرے
پاس تو خوش ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

غلام رسول اپنی بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں
کھولے حیرانی سے اسے تکتا رہا تھا۔

"کیا میں...... کیا میرا ہونا بھی تمہیں خوش نہیں
کرتا تاسین فاطمہ! میں تو ہر وقت اس خیال سے خوش
ہوتا رہتا ہوں کہ تم ہو نا۔"

"پتا نہیں۔" وہ پیدائشی بے حس تھی یا حالات
نے اسے بے حس بنا دیا تھا۔

"تم تیار ہو کر باہر آ جاؤ۔ میں اتنے میں اسے
سلا دوں۔" خدیجہ نے اس سے کہا۔

اسے بھلا کیا تیار ہونا تھا۔ دیوار گیر الماری میں
سے اس نے سیاہ چادر نکالی جس میں کہیں کہیں شیشے
لگے تھے۔ یہ الماری خالہ ناصرہ نے اسے دی تھی۔ کہ
وہ اس میں اپنے کپڑے اور سامان رکھ سکے۔ اس
بالکونی والے کمرے میں ایسی چار دیوار گیر الماریاں
تھیں اس کے پاس بھلا ایسا کیا تھا جو وہ الماری میں
رکھتی۔ اس نے چپکے سے پھٹے پرانے کپڑوں والی
چھوٹی سی گٹھری چارپائی کے نیچے رکھ دی تھی کہ جب
خالہ کمرے میں نہیں ہوں گی تو وہ اپنے کپڑے جیسے

بھی وہ تھے۔ تھے تو نا، الماری میں رکھ دے گی۔

خالہ نے اسے بتایا تھا کہ شادی سے پہلے چاروں بہنیں اس کمرے میں رہا کرتی تھیں۔ خدیجہ سے بڑی عصمت آپا تھیں جو بیاہ کر فیصل آباد گئی تھیں۔ اور خدیجہ سے چھوٹی راحیلہ تھی جسے سب آمنہ بلاتے تھے کہ اسے اپنا نام کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس نے خود ہی اپنا نام آمنہ رکھ لیا تھا۔ لیکن جب سے خدیجہ کی دادی نے اس کی بیٹی کا نام آمنہ رکھا تھا تو وہ سب کو تاکید کرتی تھی کہ اسے اب راحیلہ ہی بلایا جائے کیونکہ اسے پسند نہیں تھا کہ سب اسے بڑی آمنہ کہیں۔ اس کا سسرال راولپنڈی میں تھا جب کہ سب سے چھوٹی سائرہ لاہور میں پڑھ رہی تھی۔ خالہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن رہی ہے۔ پھر طاہر تھا جو کالج میں تھا۔ سو اس کمرے میں اب وہ رہتی تھی۔

وہ تحسین فاطمہ جو گرمیوں میں چھت پر اور سردیوں میں برآمدے میں اپنی چارپائی پر سوتی تھی اور ساری رات لحاف میں بھی کانپتی رہتی تھی۔ ہاں چھٹیوں میں جب سائرہ آتی تو وہ بھی اسی کمرے میں سوتی تھی۔

یہ گھر کافی بڑا تھا۔ تین کمرے خاصے بڑے اور ہوادار تھے جبکہ چوتھا کمرا بڑا سا ہال تھا جس میں ایک طرف صوفے لگے تھے اور ایک طرف کھانے والی میز تھی۔ آٹھ کرسیوں والی لمبی سی میز۔ کچن...... بھی کافی بڑا تھا۔ برآمدہ اور صحن بھی کھلا تھا۔ اسٹور نیچے جانے والی سیڑھیوں کے درمیان میں تھا جسے وہ پرچھتی کہتے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر تو سب دکانیں ہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک کمرے جتنی جگہ تھی جہاں طاہر کی بائیک کھڑی رہتی تھی اور سامنے لکڑی کا سبز رنگ کا دروازہ تھا۔

وہ الماری کا پٹ پکڑے اپنے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی جو تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ سردیوں کے الگ اور گرمیوں کے الگ خانے میں، یہ سب کپڑے اسے ناصرہ خالہ نے ہی بنوا کر دیے تھے۔ گزری دو عیدوں پر سائرہ اس کے لیے لاہور سے ریڈی میڈ اتنے خوب صورت سوٹ چوڑیاں جیولری اور جوتے لائی تھی کہ وہ حیرت سے ان کپڑوں کو دیکھتی تھی۔ یوں بھی سائرہ، عصمت اور راحیلہ جب بھی آتیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتیں۔ یہ سب چیزیں اوپر والے خانے میں رکھی تھیں۔ نئے کپڑے پہلی بار اس نے یہاں ہی آ کر پہنے تھے تب اسے ان نئے کپڑوں میں اپنا آپ بہت عجیب سا لگا تھا اور وہ رخ بدل بدل کر آئینے میں کتنی ہی دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہی تھی۔ گاؤں میں تو ساری زندگی اس نے اترن ہی پہنی تھی۔ چاچی بھی اپنے اور بھی اپنی بیٹیوں کے کپڑے اسے یوں ہی دے دیا کرتی تھیں۔ کبھی اس کے ماپ کے مطابق کروانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ چاہے شبانہ آپا کی قمیص اس کے ٹخنوں تک آ رہی ہو یا مہتاب کی گھٹنوں سے اوپر پھنسی ہو۔

وہ الماری کے پٹ ہاتھ رکھے یوں ہی ساکت سی الماری میں موجود کپڑوں کو دیکھ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ جب باہر سے خدیجہ نے آواز دی۔

"اب آ بھی جاؤ تحسین۔"

اس نے آہستگی سے الماری کو بند کیا، سلیقے سے چادر کو اوڑھا۔ یہ چادر بھی خالہ نے اسے دی تھی جب وہ پہلی بار ان کے ساتھ زینب بی بی کے گھر گئی تھی اور سمجھایا تھا کہ جب بھی اسے باہر جانا ہو وہ چادر لے کر جایا کرے۔ گاؤں میں تو وہ صرف دوپٹا ہی لیتی تھی، وہ بھی پھٹے پرانے جو پوری طرح جسم کو ڈھانپتے ہی نہ تھے۔ ایک بار غلام رسول نے بھی اس سے کہا تھا۔

"تاسین فاطمہ! یہ تم کیسے دوپٹے اوڑھتی ہو۔ جب باہر جاتی ہو تو کوئی ڈھنگ کا دوپٹا لیا کرو۔"

اس کے پاس تو کوئی ڈھنگ کا دوپٹا تھا ہی نہیں اس لیے اس نے اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی تھی۔ ہاں غلام رسول بات کر کے خود ہی شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میرا مطلب سی لیا کرو۔ بلکہ میری اماں کو دینا وہ سی دیں گی۔"

"تحسین۔"

خدیجہ نے پھر آواز دی تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

وہ پہلی بار یہاں کی مارکیٹ میں نہیں آئی تھی بلکہ کئی بار کبھی خالہ کبھی سائرہ یا عصمت کے ساتھ یہاں اس بڑی مارکیٹ میں آتی رہی تھی اور ہر بار ہی وہاں کی گہما گہمی اور رونقوں کو حیرت سے دیکھتی تھی۔ کبھی بالکونی میں جاتی تو نیچے ان کی گلی میں بھی خوب گہما گہمی ہوتی۔ یہاں کی اور گاؤں کی زندگی میں بہت فرق تھا۔ وہاں چھوٹا سا بازار تھا اور چند دکانیں۔ یہاں کتنے سارے لوگ تھے۔ خریداری کرتے خوش باش سے ہنستے مسکراتے۔ پتا نہیں یہ سب اتنے خوش خوش کیوں ہیں شاید انہیں بھی زندگی غلام رسول کی طرح خوب صورت لگتی ہے۔ خدیجہ خریداری کرتی تھی اور وہ بازار کی گہما گہمی کو دیکھتی تھی۔

خدیجہ کوئی رائے مانگتی تو وہ یوں ہی سر ہلا دیتی ہاں اچھا ہے ٹھیک ہے۔

خدیجہ نے نہ جانے کتنی بار پوچھا تھا کہ اسے کچھ لینا ہے لیکن اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا اس کی چاہت سے زیادہ تھا بلکہ اس کی تو کوئی چاہت تھی ہی نہیں جو ملا کھا لیا پہن لیا اور بس۔ زندگی اس کے لیے ایسی ہی تھی اتنی ہی محدود سی چھت سے صحن تک، صحن سے کنویں تک یا پھر دیوار پر چڑھ کر غلام دین چاچا کو برتن بناتے دیکھنا۔ اس کی انگلیاں چاک پر کیسے رقص کرتی تھیں وہ کتنی مہارت سے دائیں ہاتھ میں مٹی کی لوئی پکڑ کر بائیں ہاتھ سے چکیت کو گردش دیتا تھا۔

خریداری کے بعد خدیجہ اسے فروٹ چاٹ کھلانے لے گئی تھی۔ یہاں آکر وہ نئے نئے ذائقوں سے آشنا ہوئی تھی۔ ایسے ذائقے جو اس کی زبان نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیے تھے۔ فروٹ چاٹ کا ذائقہ بھی ان میں سے ایک تھا۔

"تم بہت بور ہو تحسین۔ ذرا جو کوئی مشورہ دیا ہو۔ اللہ تمہارے کپڑے بھی مجھے اپنی پسند سے لینے پڑے۔ اب تو سائرہ آئے گی اتوار کو تو اس کے ساتھ ہی آؤں گی۔" چاٹ کھاتے ہوئے خدیجہ نے گلہ کیا تھا۔

"لیکن آپی، مجھے کیا پتا میں کیا مشورہ دیتی۔" وہ سائرہ کی طرح اسے آپی کہتی تھی۔

"کیوں نہیں پتا ہر بندے کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی پسند ہوتی ہے۔ تم کوئی رائے دیتیں نا تو میں وہ سرخ سوٹ ضرور لے لیتی۔ خود اکیلے مجھ سے فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ لوں یا نہ لوں۔ حالانکہ وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔" خدیجہ نے کوک کا گھونٹ بھرا۔

"میں بھلا کیا رائے دیتی آپ کو اچھا لگ رہا تھا تو آپ لے لیتیں نا۔" اس نے بے بسی سے خدیجہ کو دیکھا۔

"تم ایسی کیوں ہو، اتنی ڈل سی جیسے زندگی سے بیزار کوئی شخص۔ تمہاری ابھی عمر ہی کیا ہے تحسین، جو یوں زندگی سے ناتا توڑے بیٹھی ہو۔ زندگی میں دلچسپی لو۔ اپنی پسند ناپسند پر غور کرو۔" خدیجہ کو افسوس ہوا تھا۔

اس کے پاس خدیجہ کے سوالوں کا جواب نہیں تھا وہ سر جھکائے چاٹ کھاتی رہی۔

اس روز جب غلام رسول گاؤں سے اس کے لیے میوے والا گڑ اور غلام دین کے ہاتھ کی بنی ہوئی صراحی لایا تھا تو وہ بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔

"تاسین فاطمہ! زندگی سے اتنی بیزار کیوں رہتی ہو اب تو یہاں نہ چاچی کی مار ہے نہ کسی کی ڈانٹ پھٹکار۔ نہ کوئی اور تکلیف۔"

ہاں تکلیف تو کوئی نہیں تھی پھر بھی زندگی میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ یہاں آکر زندگی جیسے منجمد ہو گئی تھی، ساکت، جھیل میں پڑے ہوئے کسی پتھر کی طرح...... وہاں وہ سارا دن صبح سے رات تک کام کرتی رہتی تھی۔ جھاڑو، برتن، پانی بھرنا، کھانا پکانا اور کئی دوسرے کام، اس کے پاس زندگی کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ زندگی کی خوب صورتیاں یا بدصورتیاں اور یہاں تو فرصت ہی فرصت تھی پھر بھی۔

"ایسا کرو پڑھ لو۔ کسی اکیڈمی میں داخلہ لے لو۔ میں خالہ سے کہتا ہوں۔"

"گاؤں کے پرائمری اسکول سے چار

جماعتیں پڑھنے والی تحسین فاطمہ کیا اب اٹھارہ سال کی عمر میں پانچویں میں داخلہ لے گی۔ اسے غلام رسول کی بات پر ہنسی آ گئی تھی۔ جبکہ وہ پڑھی ہوئی چار جماعتیں بھی کب کی بھول بھال گئی تھی۔ اسے اگر کچھ یاد تھا تو یہ کہ صبح تڑکے اٹھ کر اس نے صحن میں جھاڑو دینا ہے۔ گائے کے لیے چارہ کاٹ کر لانا ہے۔ کنویں سے پانی بھرنا ہے۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے تاسین فاطمہ؟'' غلام رسول کو شاید برا لگا تھا۔

''تم بھی تو شہر آ کر عجیب عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔ بھلا میری عمر کی کوئی لڑکی اسکول......''

''یہ عجیب باتیں نہیں ہیں تاسین فاطمہ۔ یہاں شہر میں ایسے ٹیوشن سنٹر اور اکیڈمیاں ہوتی ہیں جہاں تم تیاری کر کے پہلے آٹھویں کا اور پھر دسویں کا پرائیویٹ امتحان دے دینا پھر کالج میں داخلہ لے لینا۔''

غلام رسول اتنے یقین سے کہہ رہا تھا جیسے اس نے بس دسویں کر ہی لی ہو۔ اسے دل ہی دل میں غلام رسول کے یقین پر پھر ہنسی آئی تھی لیکن بظاہر وہ سنجیدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''لو میں اب چھ سات سال لگا کر دس پڑھوں اور پڑھتے پڑھتے بڈھی ہو جاؤں۔ سب میرا مذاق اڑائیں۔ بھلا بڈھے طوطے بھی کبھی سیکھ سکے ہیں کچھ۔''

اس نے یہ سوچا تھا لیکن غلام رسول سے نہیں کہا تھا جو بہت جوش سے کہہ رہا تھا۔

''میں پھر آؤں گا تو سائرہ باجی سے بات کروں گا انہیں ضرور پتا ہو گا کہ کون سی جگہ پر اس طرح تیاری کروا کر امتحان دلوایا جا سکتا ہے۔''

''مجھے نہیں پڑھنا غلام رسول، نہ میں پڑھ سکتی ہوں اب۔'' اس کا صبر جواب دے گیا تھا۔

''تو......!'' غلام رسول مایوس نہیں ہوا تھا۔

''اگر پڑھنا نہیں چاہتی ہو تو کچھ اور کر لو مطلب کوئی سلائی، کڑھائی پینٹنگ، کوکنگ کا کورس۔ فارغ بیٹھ بیٹھ کر تو تھک جاؤ گی، زندگی اور بھی بری لگنے لگی تمہیں۔''

غلام رسول تو شہر آ کر بھلا ہی ہو گیا ہے۔ پہلے بھی کچھ کم کہانیاں نہیں سناتا تھا اب اور بھی۔ اس نے غلام رسول کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور کپڑے کے تھیلے سے گڑ نکال کر کھانے لگی تھی۔

☆☆☆

چاٹ کھا کر وہ گھر کی طرف چل پڑیں۔ اگرچہ خدیجہ کی شاپنگ نامکمل تھی لیکن اس کا ارادہ اب سائرہ کے ساتھ ہی آنے کا تھا۔ تحسین صحیح ہی تو کہتی تھی ساری زندگی گاؤں میں گزاری تھی اسے بھلا کیا پتا۔ حالانکہ گاؤں اور دیہات سے آنے والی جو لڑکیاں اس کے ساتھ پڑھتی تھیں وہ تو بہت ہوشیار تھیں اور کچھ تو شہری لڑکیوں کے بھی کان کترتی تھیں۔ خیر تحسین بھی وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی۔ خدیجہ نے سوچا تھا اور اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی وہ حاجرہ کی دکان پر رک گئی تھی۔ جہاں مودی بیٹھا تھا، ظفری کا چھوٹا بھائی اور خواتین گاہکوں سے دوپٹے لے رہا تھا۔

''مودی! مجھے بھی دوپٹے رنگوانے ہیں۔''

''تو دے دیں رنگ دوں گا۔'' مودی نے مصروف سے انداز میں پیچھے ریک میں سے رنگے ہوئے دوپٹے اٹھائے اور پرچی دیکھ کر خاتون کے حوالے کیے۔

''حاجرہ آپا کہاں ہیں؟ پہلے ان سے مل لوں۔'' خدیجہ نے پوچھا۔

''آپا اندر ہیں۔ آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔'' خدیجہ کی بات کا جواب دے کر مودی پھر مصروف ہو گیا تھا۔

''چلو تحسین! زرا خدیجہ آپا سے مل لیں۔''

تحسین سے کہتے ہوئے خدیجہ نے دکان کے ساتھ موجود دروازہ دھکیلا جو کھلتا چلا گیا۔ حاجرہ برآمدے میں چارپائی پر چادر اوڑھے لیٹی تھیں۔ صحن میں چولہا بند تھا اور کڑاہی خالی پڑی تھی۔

''کون ہے......؟'' آہٹ پر حاجرہ نے چادر چہرے سے ہٹائی۔

"ارے خدیجہ ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"جی آپا!" خدیجہ نے شاپنگ بیگ زمین پر رکھے تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر، گلے لگا لیا۔

"کب آئی ہو؟"

"دو تین دن ہو گئے ہیں آپا۔ سفر کی تھکان اور کچھ طبیعت بھی اپ سیٹ تھی اس لیے ملنے نہ آ سکی۔ آپ کب سے بیمار ہیں۔ کتنی کمزور ہو رہی ہیں۔"

"ارے نہیں تمہارا وہم ہے۔ بس رات سے ہی نزلہ زکام اور ہلکا سا بخار ہے۔ دراصل رات دیر تک رنگائی کا کام کرتی رہی تھی باہر صحن میں کچھ ٹھنڈ بھی تھی حالانکہ مارچ بھی ختم ہو رہا ہے۔" حاجرہ نے اس کا بازو تھپتھپایا۔

"آپ بھی نا حاجرہ آپا! آخر کیا ضرورت تھی دیر تک کام کرنے کی اور پھر خواہ مخواہ ہی آپ نے خود کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ چھوڑ دیں یہ کام اب۔" خدیجہ نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"شادی کے کپڑے تھے وقت پر دینے تھے اور مجھے یہ کام کرنا مصیبت نہیں لگتا۔ خوشی ہوتی ہے مجھے۔"

"آپ بی ایڈ کر کے کہیں ٹیچر بھی تو لگ سکتی تھیں نا۔ کپڑے رنگنے کا کام کرنا ضروری تھا کیا۔"

خدیجہ شادی سے پہلے تو اتنی بحث نہیں کرتی تھی حاجرہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کام تو کام ہوتا ہے خدیجہ! بد دلی سے کیا جائے تو بیگار اور خوش دلی سے کریں تو ایک دن کام کام نہیں رہتا عشق بن جاتا ہے اور میں بھی رنگنے کا کام خوش دلی سے کرتی ہوں۔"

"غلام دین چاچا بھی یہ ہی کہتا ہے۔" وہ بے اختیار بول پڑی تھی۔

"ارے تحسین! تم ابھی تک کھڑی ہو بیٹھ جاؤ بیٹا۔ وہ کرسی یا موڑھا لے لو۔" حاجرہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

ان ڈیڑھ پونے دو سالوں میں گلی کے تقریباً سبھی گھر والے تحسین سے مل چکے تھے اور انہوں نے ناصرہ کے اس عمل کو بہت سراہا تھا کہ وہ اپنی یتیم بھانجی کو ساتھ لے آئی تھیں۔ وہ موڑھے پر بیٹھ گئی تو حاجرہ پھر خدیجہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں آپا، لاؤں گی آپ سے ملانے کے لیے۔ لیکن آپ مانیں یا نہ مانیں بہت کمزور ہو رہی ہیں۔ کیا کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔" خدیجہ نے انہیں بغور دیکھا۔

"ارے نہیں، وہم ہے تمہارا۔ کچھ کمزوری تو عمر کے ساتھ ہو جاتی ہے نا، اور پھر ایک دن کے بخار نے ہی نچوڑ دیا ہے۔ مودی ڈاکٹر ہاشمی سے دوائی لے آیا تھا۔ شکر ہے اب بخار نہیں ہے۔"

"ہاں، آپ تو جیسے ساٹھ سال کی ہو گئی ہیں نا۔" خدیجہ جھنجلائی تھی۔

"میں گھر جا کر یخنی بنا کر بھیجتی ہوں۔"

"یخنی تو صبح صبح زارا بنا کر دے گئی تھی میرا پینے کو جی ہی نہیں چاہا۔" وہ مدھم سا مسکرائیں۔

"تم یونہی پریشان ہو رہی ہو۔"

"یہ زارا کون ہے آپا۔" خدیجہ کے لیے یہ نیا نام تھا۔

اوپر والا پورشن خالی پڑا تھا۔ مولوی صاحب کے کوئی عزیز ہیں۔ شمس الحق صاحب، انہیں ہی کرائے پر دے دیا ہے۔ زارا ان کی ہی بیٹی ہے۔ اچھے شریف لوگ ہیں۔ پچھلی طرف مولوی صاحب نے اپنی نگرانی میں سیڑھیاں بھی نکلوا دی تھیں۔"

حاجرہ نے تفصیل بتائی تو خدیجہ خوش ہو گئی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا آپا۔ دن تو خیر گزر ہی جاتا ہے لیکن رات کو ڈر تو لگتا ہو گا آپ کو۔"

"نہیں ڈر کیسا۔"

وہ مسکرائی تھیں۔ تحسین کو ان کی مسکراہٹ بہت بھلی لگی جیسے پورا چہرہ روشن ہو گیا ہو۔ تحسین نے بہت غور سے انہیں دیکھا، ان کے سانولے رخساروں پر چمک سی تھی اور آنکھیں بھی بہت روشن تھیں۔ وہ اسے بہت مطمئن اور خوش لگی تھیں۔ وہ بھی تو اس کی طرح تھیں اکیلی۔ کوئی نہیں تھا اپنا پھر بھی...... پھر بھی ان کی

آنکھوں میں زندگی کی وہ چمک تھی جو اس کی آنکھوں میں نہیں تھی اور غلام رسول کہتا تھا۔
"پوری دنیا میں ایک تم ہی ہو ناشکری۔ جسے اللہ کی بنائی دنیا خوب صورت نہیں لگتی اور جو زندگی سے پیار نہیں کرتی۔"
"تو پوری دنیا میں کوئی میرے جیسا ہو گا بھی نہیں۔"
اس نے اپنی پھٹی پرانی اوڑھنی کو گانٹھ لگائی تھی کہ کہیں مزید نہ پھٹ جائے۔ چاچی نے صبح ہی اس سے کہا تھا کہ اگر یہ دوپٹا بھی پھاڑ دیا نا تو پھر ننگے سر پھرنا۔ اسے تو ننگے سر پھرنے میں بھی کوئی عار نہیں تھا لیکن غلام رسول کو برا لگتا۔ وہ کنویں پر پانی بھرنے آئی تھی اور گھڑا ابھر کر قریب ہی پڑے پتھر پر بیٹھ کر اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی جو ڈول کی رسی کھینچنے سے سرخ ہو رہی تھیں جب غلام رسول اس کے پاس ہی پڑے دوسرے پتھر پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔
"میں نے تمہیں کہا تو تھا تاسین فاطمہ جب پانی بھرنے آیا کرو تو مجھے بتا دیا کرو میں ڈول کھینچ دوں گا۔"
"ہاں تم تو جیسے بڑے پہلوان ہو نا۔" اس نے اپنے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے پونچھے تھے۔
"لڑکوں میں زیادہ طاقت ہوتی ہے اور پھر میں تم سے بڑا بھی تو ہوں۔" غلام رسول کی ہمیشہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح تاسین کی تکلیف کم کر سکے۔
"ایک صراحی تو تم سے ٹھیک سے بنتی نہیں اور چاچا کہہ رہے تھے کہ تم تو بھٹی بھی صحیح سے نہیں جلا پاتے۔" تاسین فاطمہ کو اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی۔
"وہ الگ بات ہے تاسین فاطمہ لیکن آئندہ مجھے بتا کر کنویں پر آنا۔ دیکھو تو کیسی سرخ ہو رہی ہیں تمہاری ہتھیلیاں چھل بھی گئی ہیں نا۔" اسے افسوس ہو رہا تھا۔
"اچھا۔"
اس نے ہاتھ پھیلا کر سپاٹ نظروں سے اپنی ہتھیلیاں دیکھیں۔ وہ اتنی سرخ تو نہیں تھیں جتنی سب گھر والوں کے کپڑے دھو کر یا ہاتھوں پر چاچی کی چھڑی کھا کر ہو جاتی تھیں جو چاچی نے بطور خاص اسے مارنے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ سپاٹ انداز غلام رسول کو تکلیف دیتا تھا۔
"اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ رات کو جب تم چھت پر سو رہی تھیں نا آخری راتوں کا چاند تھا تو ستارے دیکھے تھے۔ آسمان سچ میں موتیوں سے بھرا تھال ہی لگ رہا تھا نا۔ کتنا خوب صورت...... دل چاہتا تھا دیکھتے رہو۔"
"پتا نہیں، مجھے نہیں لگتا۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے آسمان یوں ہی تاروں بھرا ہے بھلا کیا خاص تھا اس میں وہی برسوں پرانا آسمان اور تارے۔"
اور تب غلام رسول نے کہا تھا وہ ناشکری ہے کہ اسے کچھ بھی خوب صورت نہیں لگتا۔ غلام رسول کی بات یاد آنے پر اس نے سر اٹھا کر حاجرہ آپا کی طرف دیکھا جو خدیجہ کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے مسکراتے ہوئے اس سے جانے کیا کہہ رہی تھیں۔
"حاجرہ آپا! کیا آپ کو بھی زندگی خوب صورت لگتی ہے؟" وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی تھی۔
"زندگی تو خوب صورت ہی ہوتی ہے کہ اللہ کی عطا کردہ ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتی۔"
حاجرہ خدیجہ کا ہاتھ چھوڑ کر اب اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
"آپ کا تو کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کو زندگی خوب صورت لگتی ہے۔"
"ہاں زندگی تو اللہ کا دیا ہوا تحفہ ہے تحسین اور تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے جیسا بھی ہو۔"
"چاہے کانٹوں بھرا ہی کیوں نہ ہو۔" غلام رسول سے سوال جواب کرتے کرتے اسے عادت ہو گئی تھی سوال سے سوال نکالنے کی۔
"ہاں۔" حاجرہ مسکرائی تھیں۔
"لیکن مجھے تو زندگی خوب صورت نہیں لگتی بالکل بھی نہیں۔" اس کا وہی پرانا خیال تھا۔ حالانکہ اب وہ گاؤں کے مقابلے میں بہت بہتر زندگی گزار رہی تھی۔
"تمہیں زندگی خوب صورت کیوں نہیں لگتی

تحسین۔'' حاجرہ اب اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''پتا نہیں حاجرہ آپا میں ایسا کیا تھا کہ وہ باتیں جو اس نے غلام رسول سے بھی کبھی نہیں کی تھیں اب حاجرہ آپا سے کر رہی تھی ہولے ہولے جیسے خود سے بات کرتی ہو۔''

''ابا کہتے تھے میں دو سال کی تھی جب اماں فوت ہوئیں اور انہوں نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی کہ سوتیلی ماں مجھ پر ظلم نہ کرے۔ کیا تھا اگر ابا دوسری شادی کر لیتے۔ سوتیلی ماں ظلم کرتی پر اتنا تو نہیں جتنا چاچی کرتی تھی۔ بہن بھائی تو ہوتے بھلے سوتیلے ہی سہی۔ پر اب تو کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ سوتیلی مارتی بھی نا تو ابا کے ڈر سے ہاتھ ہولا ہی رکھتی ابا کو میری فکر تو ہوتی کہ سوتیلی کہیں مجھ پر ظلم نہ کرے پر ابا تو مجھے چاچی کے حوالے کر کے بے فکر ہو گیا تھا۔ ابا کو سوتیلی ماؤں کے ظلم کی داستانیں تو ازبر تھیں کہ جب بھی کوئی شادی پر زور دیتا وہ دہرا دیتا لیکن کاش کسی نے اسے چاچی، مامی کے ظلم کی داستان بھی سنا رکھی ہوتی۔ پر ابا تو بے فکر سا کراچی چلا گیا تھا جہاں وہ ایک سیٹھ کے پاس ملازم تھا۔ سال بعد آٹھ دس دن کی چھٹی پر آتا تو وہ بھی اتنا مصروف ہوتا کہ کبھی پاس بٹھا کر پوچھا ہی نہیں کہ تاسین فاطمہ تیری چاچی تیرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ اسے تو چاچی پر اندھا یقین تھا کہ اس نے مجھے شہزادیوں کی طرح رکھا ہوگا اور اس اندھے یقین نے تاسین فاطمہ کی زندگی کے سارے رنگ مٹا ڈالے حاجرہ آپا۔ اور وہ بدرنگے کپڑے کی طرح ہو گئی بد صورت بھدی۔'' وہ بولی تو بولتی چلی گئی۔

''میں آٹھ سال کی تھی جب ابا خود آنے کے بجائے صندوق میں بند ہو کر آیا۔ وہ آتا تھا تو بدرنگ زندگی اچھی لگنے لگتی تھی اور اب اس نے کبھی نہیں آنا تھا۔ اس کوٹھی کے حوالے کیے ساتواں دن تھا شاید مجھے تو خیر یاد نہیں پر غلام رسول نے ایک روز بتایا تھا کہ تب ابا کو گئے سات دن ہو گئے تھے۔ اس روز کیا ہوا تھا مجھے یاد نہیں۔ پتا نہیں مجھ سے کوئی برتن ٹوٹا تھا یا کیا کہ چاچی نے کپڑے دھونے والے ڈنڈے سے اتنے زور زور سے مارا تھا کہ میرے دائیں بازو کی ہڈی نہ جانے کہاں کہاں سے ٹوٹ گئی تھی اور جب میری حالت خراب ہونے لگی تو چاچا مجھے پہلوان فریدو کے پاس لے گیا لیکن میرا بازو اب فریدو پہلوان کے بس کا نہیں تھا۔ مجبوراً چاچا کو سرکاری ہسپتال لے جانا پڑا اور مہینوں میں گلے میں پٹی ڈالے پھرتی رہی اور یہ بایاں بازو اس پر چاچی نے ایک بار چولھے سے جلتی لکڑی نکال کر ماری تھی تو مہینوں زخم ٹھیک نہیں ہوا تھا۔''

اس نے نظریں اٹھائیں۔ خالی خالی بے تاثر آنکھیں، سپاٹ چہرا۔ اس نے آستین پیچھے کرتے ہوئے دونوں بازو آگے بڑھائے۔ ایک قدرے ٹیڑھا کہ ہڈی صحیح سے جڑ نہیں سکی تھی اور دوسرے بازو کی جلد سکڑی اور جلی ہوئی سی۔

خدیجہ کی آنکھوں میں نمی تھی اور حاجرہ بھی ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک صحرا تھیں اسے یاد نہیں تھا کہ آخری بار وہ کب روئی تھی شاید ابا کو صندوق میں بند دیکھ کر۔

''زندگی مجھے کیوں خوب صورت نہیں لگتی۔ غلام رسول بھی پوچھتا تھا۔'' اس نے نظریں اٹھائیں کیسی کھنڈر اور ویران سی آنکھیں تھیں اس کی وہ جیسے خلاؤں میں تکتی تھی اور خود سے ہی بات کرتی تھی۔

''جب پیٹ میں بھوک سے آگ لگی ہو اور ہانڈی میں لگی دال کو انگلیوں سے پونچھ پونچھ کر بھوک مٹانے کی کوشش کرنی پڑے اور دستر خوان سے روٹی کے بھورے (ٹکڑے) چن کر کھانے پڑیں، پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑوں سے جسم کی برہنگی چھپتی نہ ہو۔ جسم کا پور پور دن بھر کے کام کی تھکن اور چاچی کی مار سے سلگتا ہو تو زندگی کیسے خوب صورت لگ سکتی ہے۔''

''ہاں شاید نہ لگتی ہو۔'' حاجرہ کی آنکھوں میں تاسف تھا۔

''پر تحسین بیٹا! زندگی ہے تو خوب صورت۔''

''غلام رسول بھی یہی کہتا ہے کہ زندگی خوب

صورت ہے۔ اسے چاند، ستارے، آسمان، پرندے، سرسوں کے کھیت...... سب میں زندگی کی خوب صورتیاں دکھتی ہیں۔ لیکن آپ کو زندگی کیوں خوب صورت لگتی ہے حاجرہ آپا؟" شاید چند دن پہلے غلام رسول جو سوال چھوڑ گیا تھا اسی سوال کا جواب تلاشتے ہوئے وہ حاجرہ سے پوچھ بیٹھی۔

"اس لیے کہ یہ میرے خالق کی عطا کردہ ہے۔" حاجرہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہوگئی تھیں اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی جس نے سانولی سلونی سی حاجرہ کے چہرے کو نکھار دیا تھا۔

"کیا صرف اتنی سی بات پر آپ کو زندگی خوب صورت لگتی ہے۔" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے تحسین......!" حاجرہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ اس خالق نے ہمیں زندگی دی...... اس دنیا میں بھیجا اور پھر ہمارے لیے اس دنیا کو رنگوں سے سجایا۔ ہمارے لیے طرح طرح کے پھول بوٹے اناج پھل لگائے۔ یہ اتنی سی بات نہیں ہے چندا۔" ان کی آواز جیسے بھرا گئی تھی۔

"آپ تو بالکل غلام رسول جیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔" وہ اب بھی حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ غلام رسول کون ہے تحسین! کیا تمہارا چچا زاد؟"

حاجرہ نے پوچھا تو اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"میرے چاچا کا بیٹا تو غلام رسول کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہے ویلا نکما۔ سارے زمانے کا بدتمیز اور لڑاکا۔ یہ غلام رسول تو گاموں مطلب غلام دین چاچا کا بیٹا ہے۔ چاچا مٹی کے برتن بناتا اپنے گھر کے صحن میں اس کا چاک اور بھٹی ہے۔ پورے گاؤں والے اس سے برتن خریدتے ہیں۔ بلکہ قصبے سے بھی دکان دار اس سے برتن خرید کر لے جاتے ہیں۔ غلام رسول نے تو قرآن حفظ کیا ہے۔ گاؤں سے دس جماعتیں پڑھ کر ادھر شہر میں آ گیا ہے پڑھنے۔ کالج میں بھی پڑھتا ہے اور جامعہ رضویہ سے حدیث فقہ اور تفسیر بھی پڑھ رہا ہے۔"

اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ غلام رسول کے متعلق بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں خود بخود فخر سا آ گیا تھا۔

"غلام رسول کہتا ہے میں کور بینا ہوں۔ مجھے دنیا کو دیکھنا نہیں آتا۔ میں اسے سمجھا ہی نہیں پاتی کہ میں دنیا کو اس طرح نہیں دیکھ سکتی جیسے وہ دیکھتا ہے۔ مجھے وہ حسن نظر نہیں آ سکتا جو اسے نظر آتا ہے۔ خدیجہ آپی کے آنے سے ایک دن پہلے وہ گاؤں سے میرے لیے میوے والا گڑ لایا تھا۔ غلام دین چاچا نے بھیجا تھا۔ وہاں جب میں گاؤں میں تھی تو چاچا بھی کبھی مجھے گڑ کی ڈلی کھانے کے لیے دیتا تھا اور کہتا تھا غلام رسول زندگی گڑ جیسی میٹھی ہے پر تو ہی نہیں سمجھتی۔ پر حاجرہ آپا میرے لیے زندگی کڑوے تمے (ایک کڑوا پھل) جیسی ہے۔ وہ ایسا کہہ سکتا ہے نا کہ اس کے پاس اس کی اماں ہیں ابا ہیں اور میرے پاس تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس غلام رسول ہے نا تحسین فاطمہ۔" حاجرہ آپا کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا۔

"میرے پاس بھلا کہاں ہے وہ۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا تھا۔

"وہ تو......"

"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم نے کچھ پڑھا بھی ہے۔" حاجرہ نے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والے جملے کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"چار جماعتیں پڑھی تھیں، وہ بھی اس لیے کہ چاچی کی تابی اکیلی اسکول نہیں جاتی تھی۔ مجھ سے سال ڈیڑھ سال ہی چھوٹی تھی نا پھر جب وہ اکیلی جانے لگی تو چاچی نے مجھے اسکول سے اٹھا لیا حالانکہ میرا دل چاہتا تھا بہت سارا پڑھ لوں کیونکہ ابا جب چھٹی پر آتا تھا تو ہمیشہ کہتا تھا میں اپنی بیٹی کو بہت سارا پڑھا کر ڈاکٹر بناؤں گا۔ جب تم یہاں سب پڑھ لوگی تو تمہیں کراچی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تو ابا ہی نہیں رہا تھا تو میں کیا کہتی کہ مجھے پڑھنا ہے۔ چاچی نے کہا گھر بیٹھو، تو میں گھر بیٹھ گئی۔"

"تو میرے پاس آجایا کرو میں تمہیں پڑھا دیا

کروں گی۔ جب سارا پڑھ لوگی دسویں تک کا تو دسویں کا امتحان دے دینا۔"
"غلام رسول بھی یہ ہی کہہ رہا تھا اس روز کہ سارا دن فارغ بیٹھی مکھیاں مارتی رہتی ہو۔ پڑھائی کرلو۔ پر میں نے کہہ دیا کہ اب میں اس عمر میں پڑھتی اچھی لگوں گی کیا۔"
"علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی تحسین! تم آجایا کرو فارغ ہو کر۔"
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا لیکن اس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا اور آنکھیں بے تاثر...... خدیجہ حیرت سے اسے دیکھتی تھی اور حاجرہ کی سوچتی نظریں اس کے وجود میں اترتی تھیں۔
"ارے میں اتنی دیر سے باتوں میں لگی ہوں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔" حاجرہ کو ایک دم خیال آیا تھا اور وہ اٹھی تھیں۔
"نہیں آپا۔" خدیجہ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھالیا۔
"اس وقت چائے کا بالکل جی نہیں چاہ رہا۔ اب چلتے ہیں۔ چھوٹا اٹھ گیا ہوگا اور اماں کو تنگ کر رہا ہوگا۔ پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گی۔ بچوں کو بھی ساتھ لاؤں گی تو چائے بھی ضرور پیوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"اگر کھچڑی کھانے کو جی چاہ رہا ہو تو بنا کر بھیج دیتی ہوں۔"
"یخنی پڑی ہے، زاما ڈبل روٹی بھی دے گئی تھی۔ بہت اچھی بچی ہے اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ بہت خیال کرتی ہے میرا۔ اور ہاں تحسین اگر پڑھنے کا ارادہ بن جائے تو آجانا کتابوں کی فکر نہ کرنا۔ بچے آتے ہیں رات کو میرے پاس پڑھنے تو ابھی ان کی کتابوں سے پڑھیں گے پھر دیکھوں گی تمہیں کس جماعت سے پڑھانا شروع کروں۔"
اس نے سر ہلایا تھا لیکن دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ لو بھلا اب حاجرہ آپا مجھے اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی دوسری پڑھائیں گی ظاہر ہے۔ جو پڑھا تھا وہ تو بھول ہی گیا ہوگا۔
"قرآن تو پڑھا ہوگا نا؟" حاجرہ نے پھر پوچھا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔
"پڑھا تو تھا شبانہ اور مہتاب کے ساتھ صبح سویرے اور دوپہر میں مولوی صاحب کے پاس جاتی تھی پڑھنے۔ پھر ہم نے قرآن ختم کرلیا تو چاچی نے منع کر دیا جانے سے کہ دسیوں کام ہوتے ہیں گھر پر۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ زیادہ نہیں تو دو تین بار تو دہراؤ شبانہ اور مہتاب تو جاتی رہیں پر میں نے تو جو آخری دن مولوی صاحب کے پاس پڑھا پھر کھول کر بھی نہیں دیکھا۔" اس کی سچائی سے دکھ جھلکتا تھا۔
"اچھا چلو کوئی بات نہیں میرے پاس یا آپا جی کے پاس جا کر قرآن بھی پڑھ لینا۔"
وہ تو نماز بھی نہیں پڑھتی تھی اس کی زندگی میں کتنی کمیاں اور کتنی خامیاں تھیں۔ اسے تو نماز پڑھنا آتا ہی نہیں تھا نہ ہی کسی نے سکھایا۔ اب خالہ ناصرہ کو نماز پڑھتا دیکھ کر کئی بار کا جی چاہا تھا کہ وہ ان سے کہے کہ وہ اسے بھی نماز پڑھنا سکھا دیں لیکن جھجک جاتی کہ خالہ کیا کہیں گی کہ اتنی بڑی ہوگئی ہے اور نماز پڑھنا نہیں آتی۔

☆☆☆

زندگی سب کو خوب صورت لگتی ہے بھلے زندگی ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ بھلے ان کے پاس کوئی اپنا نہ ہو جیسے حاجرہ آپا۔ لیکن مجھے زندگی خوب صورت نہیں لگتی حالانکہ میرے پاس میرے پاس تو غلام رسول ہے۔ رات کو وہ جب سونے کے لیے لیٹی تو حاجرہ کی باتیں خود بخود ہی ذہن میں گونجنے لگیں۔
"ہاں میرے پاس غلام رسول ہے۔" اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔
ہاں ہے تو...... ہاں آج سے نہیں وہ تو کب سے ہے۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تب سے۔ جب اماں مری تھی اور ابا کو کام پر جانا ہوتا تھا تو وہ اسے پڑوس میں غلام دین چاچا کے گھر چھوڑ آتا تھا اور وہاں غلام

رسول اس کے ساتھ کھیلتا، روتی تو اس کے آنسو پونچھتا۔ اپنے کھلونے کھیلنے کے لیے دیتا۔ وہ اس سے چار سال ہی تو بڑا تھا یا چند ماہ زیادہ۔ پھر جب ابا کو کراچی میں نوکری مل گئی اور وہ چاچا چاچی کو اپنے گھر لے آیا اور اسے ان کے حوالے کر کے خود کراچی چلا گیا تھا تب بھی غلام رسول کو جب بھی موقع ملتا اس سے کھیلنے کے لیے آجاتا تھا۔ چاچی اسے ڈانٹتی تھیں لیکن وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ دوسرے دن پھر آموجود ہوتا۔

وہ دونوں گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کیے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ غلام رسول نے تو اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ جب ابا فوت ہوئے تو وہ کیسے اس کا سایہ بن گیا تھا۔ وہ قبرستان جاتی تو اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اسے سمجھاتا کہ مولوی صاحب کہتے ہیں سب نے مرنا ہے۔ آگے پیچھے سب کو ہی اپنی باری پر جانا ہے وعدہ پورا کرنے حالانکہ تب وہ بارہ سال کا ہی تھا لیکن بہت سمجھ داری کی باتیں کرتا تھا۔ جب جب چاچی نے اسے مارا جب اس کا بازو ٹوٹا، جب اس کا بازو جلا تب وہی تو تھا جس نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اس کے درد کو محسوس کیا تھا ہاں وہی تو تھا۔ سچ کہتا تھا وہ کہ میں ناشکری ہوں۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے زندگی بدصورت لگتی ہے۔ اس نے سر اٹھا کر خدیجہ کی طرف دیکھا وہ دوسرے پلنگ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ پاس ہی اس کا بیٹا خرم بھی سو رہا تھا جبکہ آمنہ دوسرے کمرے میں نانی کے پاس سوتی تھی۔

"تمہارے پاس غلام رسول ہے نا تحسین فاطمہ؟"

حاجرہ آپا نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاں میرے پاس غلام رسول ہے۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوئی۔ دھک، دھک جیسے اس کا دل یہاں وہاں بازو میں کلائی پر کنپٹیوں میں ہر جگہ دھڑک رہا تھا اور وہ اپنے دل کی دھڑکن سنتی تھی۔ یہ ردھم یہ تال اور ہی تھی کچھ اور اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

اس کے تصور میں غلام رسول کا سراپا لہرایا۔ اس غلام رسول کا نہیں جو بچہ تھا جو اس کے لیے مٹی کے ٹیڑھے میڑھے برتن بناتا تھا۔ بلکہ وہ غلام رسول جو اونچا لمبا گورا چٹا تھا جس کی خواب ناک آنکھیں کہانیاں سناتی تھیں لیکن اس نے کبھی ان کہانیوں کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ غلام رسول جو چند دن پہلے اس کے لیے میوے والا گڑ لایا تھا بائیس، تیئیس سالہ غلام رسول جو کاٹن کے کلف لگے کپڑے پہنے شہری بابو لگ رہا تھا اور خالہ ناصرہ نے اسے نظر بد سے بچنے کی دعا دی تھی اور جو آنکھوں میں ڈھیروں اشتیاق اور محبت لیے اسے تکتا تھا اور سمجھاتا تھا کہ زندگی اس گڑ کی طرح میٹھی اور شیریں ہے۔ ہاں وہی غلام رسول آج اس کے تصور میں ہلچل مچاتا تھا اور وہ میٹھی میٹھی سی کسک محسوس کرتی تھی۔ لیکن اس شام جس کی اگلی صبح اسے شہر آنا تھا وہ کچھ محسوس نہیں کرتی تھی بس خالی آنکھوں اور سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی تھی۔ وہ بہت اداس تھا۔

"بہت یاد آؤ گی تا سین فاطمہ۔"

"تو تم وہاں کیوں جا رہے ہو غلام رسول یہاں چاچا کے ساتھ مل کر برتن بناتا۔ دیکھو، چاچا تو اب بوڑھا ہو گیا ہے تم کام سیکھ لو تو پھر تم سے ٹیڑھے برتن نہیں بنیں گے۔"

"ہاں میں برتن بنانا سیکھ تو لوں لیکن یہ ابا کی ہی خواہش ہے کہ میں شہر جا کر تعلیم حاصل کروں۔ قرآن تو میں نے حفظ کر لیا ہے پر مولوی صاحب کہتے ہیں صرف حفظ کرنا کچھ نہیں ہوتا ہے اسے سمجھنا اور اس کی روح میں بھی اترنا پڑتا ہے۔ انہوں نے وہاں شہر میں جامعہ حنفیہ رضویہ میں بات کر لی ہے وہاں کا منتظم مولوی صاحب کا جاننے والا ہے خود مولوی صاحب کا بیٹا بھی وہاں ہی سے دینی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔"

"پر چاچا تو تمہیں کالج میں پڑھانا چاہتا تھا۔"

"ہاں دن میں جامعہ جایا کروں گا اور رات کو نائٹ کالج میں داخلہ لے لوں گا۔" غلام رسول

ہمیشہ ہی بہت نرمی اور تحمل سے اس کا ہر سوال کا جواب دیا کرتا تھا۔

''تو پھر سوئے گا کس وقت۔'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''ساری رات تھوڑا ہی پڑھوں گا بس دو تین گھنٹے۔''

غلام رسول مسکرایا تھا۔ شہر میں اس کے رشتے کا ایک چچا رہتا تھا جس کے پاس اس نے ٹھہرنا تھا۔ اس کی اولاد نہیں تھی گھر میں دونوں میاں بیوی ہی تھے۔ جب وہ شہر میں غلام دین کے ساتھ داخلے وغیرہ کا پتا کرنے گیا تھا تو انہوں نے بے حد اصرار سے اسے اپنے ہاں ٹھہرنے کا کہا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا تاسین فاطمہ، اور اماں ابا کے پاس آتی رہنا میرے جانے کے بعد وہ اداس اور اکیلے ہوں گے۔'' اس نے ایک بار بھی اس طرح غلام رسول کو نہیں دیکھا تھا جس طرح وہ دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی صورت آنکھوں میں سموتا ہو۔

''مجھے ابا کے ساتھ کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ میں خود بھی جانا نہیں چاہتا تھا لیکن زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے اب مٹی کے برتن کم ہی بکتے ہیں، وہ بھی یہاں دیہاتوں میں شہروں میں تو کوئی نہیں لیتا۔ چینی اور شیشے کے برتن تو خیر بڑے گھروں میں ہوتے ہی تھے لیکن اب پلاسٹک کے سستے برتن بن گئے ہیں ایسے ایسے خوب صورت کہ کیا بتاؤں۔'' وہ خود ہی وضاحت کر رہا تھا۔

''اچھا بتاؤ کیا مجھے یاد کرو گی۔''

وہ پرامید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن وہ کچھ دیر خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر یوں ہی سر ہلا دیا تھا اور وہ خوش ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''مجھے چار سال وہاں رہ کر پڑھنا ہے لیکن میں چھٹیوں میں گاؤں آتا رہا کروں گا۔ لیکن مجھے وہاں تمہاری فکر رہا کرے گی۔ تاسین فاطمہ، کنویں پر اکیلی مت جانا۔ اماں کو ساتھ لے جایا کرنا۔''

وہ اسے مختلف ہدایات دیتا رہا تھا اور وہ چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ پھر وہ چلا گیا تھا اور کتنے ہی دن وہ بولائی بولائی سی پھرتی رہی تھی کبھی چھت پر چلی جاتی کبھی بے وقت جھاڑو اٹھا کر صحن میں لگانے لگتی۔ تب تو وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پائی تھی لیکن اب اس وقت رات کے اس پہر اسے پر ادراک ہوا تھا کہ وہ کیوں بولائی بولائی پھرتی تھی۔ کیوں اسے کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ غلام رسول سے سینکڑوں سوال کرتی تھی لیکن وہ کبھی اس سے یہ نہیں پوچھ سکی تھی کہ اس کے جانے کے بعد دل اور کیوں ویران ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی اچھا کیوں نہیں لگتا۔ وہ اس کے آنے پر خوش ہوتی تھی شاید اس لیے کہ وہ جب چھٹیوں میں گھر آتا تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ زیادہ تر کھانے والی چیزیں۔ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ صرف اس کے لیے ہی کیوں کچھ لے کر آتا ہے۔ نرگس، شبانہ اور مہتاب کے لیے کیوں نہیں لاتا۔

پہلی بار جب وہ چھٹیوں میں آیا تھا تو اس نے پوچھا تھا۔ ''مجھے کتنا یاد کیا تھا تاسین فاطمہ۔''

''کیا میرے پاس کوئی ترازو ہے کہ میں تمہیں تول کر بتاؤں کہ کتنا۔'' وہ مزے سے کھوپرے والی مٹھائی کھا رہی تھی جو غلام رسول شہر سے لایا تھا۔

''اچھا کتنا نہ سہی یہ تو بتاؤ، یاد کیا تھا۔''

پتا نہیں وہ کیا جاننا چاہتا تھا۔ اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا تھا کہ پہلی بار یہ مزے دار سی مٹھائی کھاتے ہوئے اس کے پاس غلام رسول کے سوال پر غور کرنے کا وقت ہی نہیں تھا لیکن غلام رسول کی آنکھوں میں تو جگنو دمکنے لگے تھے۔

''مجھے پتا تھا تاسین فاطمہ۔ تم مجھے ضرور یاد کرتی ہو گی جب کنویں پر جاتی ہو گی۔ جب چھت پر لیٹ کر چاند تاروں کو دیکھتی ہو گی۔ جب دیوار پر چڑھ کر ابا سے باتیں کرتی ہو گی تب تب تو میں تمہیں ضرور ہی یاد آتا ہوں گا۔''

اور وہ مگن سی مٹھائی کھاتے ہوئے سر ہلائے جاتی تھی اور غلام رسول کے اندر پھول سے کھلتے تھے۔

ایک بار جب وہ آیا تو اس کا چہرہ نیلوں نیل ہو رہا تھا

اور غلام رسول اسے دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔
"یہ کیا ہوا تاسین فاطمہ؟"
"چاچی نے مارا تھا۔" وہ لاپروائی سے کھیت سے سرسوں کا ساگ توڑتی رہی تھی۔
"تمہیں درد نہیں ہوتا تاسین فاطمہ!"
"پتا نہیں۔" وہ بدستور اپنا کام کرتی رہی تھی۔
"تمہیں خود سے زندگی سے محبت کیوں نہیں ہے تاسین فاطمہ؟" وہ بے حد دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تمہیں اپنے آپ سے محبت نہیں ہے تو مجھ سے کیسے محبت کرو گی۔"
وہ روانی میں کہہ گیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر تک اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔
"اتنی بے حس اور پتھر مت بنو تحسین فاطمہ زندگی کے حسن کو اس کی خوب صورتیوں کو محسوس کرو۔ یہ زندگی اللہ کی نعمت ہے اس کی قدر کرو۔ انسان پر خود اپنے وجود اپنی ذات کا بھی حق ہوتا ہے تاسین فاطمہ۔ اور جسے اپنے حقوق کا نہ پتا ہو وہ دوسروں کے حقوق کیسے جان پائے گا۔"
تب اسے شہر میں گئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان دو سالوں میں وہ خاصا بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ دو سال پہلے جب وہ گیا تھا تو اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اب چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں اور تحسین نے نظریں جھکالی تھیں۔
"ادھر میری طرف دیکھو تحسین۔ تم کیوں مار کھاتی ہو چاچی سے بلاوجہ۔ روکتی کیوں نہیں ہو انہیں۔ تمہارے ہی گھر میں رہ کر انہوں نے تمہیں ملازمہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور نوکروں سے بھی برا سلوک کرتی ہیں تمہارے ساتھ۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ تمہارے نانا کا گھر ہے جو ان کے بعد تمہاری اماں کو ملا تھا اور اس پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم ڈٹ کر رہو اس گھر میں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"شہر جا کر وہ بہت بدل گیا تھا۔" تاسین نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو لیکن اپنے آپ سے محبت کرنا سیکھ لو۔ جب تمہیں خود سے محبت ہو جائے گی نا تو پھر تمہیں زندگی خوب صورت لگنے لگی گی جب زندگی خوب صورت لگے گی تو زندگی دینے والے سے اور پھر اس کے بندوں سے بھی محبت ہو جائے گی۔"
وہ شہر جا کر بدلا ہی نہیں تھا اوکھی اوکھی باتیں بھی کرنے لگا تھا لیکن اس نے بھی اس کی باتوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ بھلا آدمی خود سے کیسے محبت کر سکتا ہے یہ غلام رسول بھی نا۔
اور جب اس نے گھر آ کر یوں ہی نہ جانے کس بات پر نرگس اور مہتاب سے کہا تھا یہ گھر میرا ہے میرے نانا کا اور تم لوگ میرے گھر میں رہتے ہو اور چاچی نے اسے وہ چار چوٹ کی مار دی تھی کہ دو روز تک وہ چارپائی سے ہل بھی نہیں پائی تھی۔ اور چاچی جب گھر سے کہیں گئی تھی تو غلام رسول کی اماں نے آ کر اس کی ٹکور کی تھی۔ اس نے اس روز کے بعد تو بالکل ہی غلام رسول کی باتوں پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ اس کی باتیں سنتی اور بھول جاتی تھی۔ اور پھر یہ غلام رسول ہی تھا جس نے خالہ ناصرہ کو اس کے متعلق بتایا تھا جب وہ گاؤں آئی تھیں۔ اس نے تو پہلی بار خالہ ناصرہ کو دیکھا تھا۔ خالہ ناصرہ کتنی ہی دیر اسے گلے سے لگائے روتی رہی تھیں۔
"تمہاری اماں کے ساتھ تو میرا سگی بہنوں سے بڑھ کر پیار تھا تحسین۔ میں تو ہفتوں آ کر خالہ کے گھر رہتی تھی اور خالہ خالو بھی مجھے تیری اماں سے کم نہیں چاہتے تھے۔ خالہ ہمیشہ کہتی تھیں میری دو بیٹیاں ہیں۔ میری شادی ہو گئی۔ خالہ خالو نہ رہے اور تمہاری اماں بھی شادی کے تین سال بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں تو اس گاؤں سے ناتا ہی ٹوٹ گیا۔ سسرال شہر میں تھا وہاں کی ہو گئی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی مشکل میں ہو۔ جو غلام دین بھائی، غلام رسول اور بھرجائی (بھابھی) نہ بتاتی سارے حالات تو میں بے خبر ہی رہتی۔"
اور پھر خالہ ناصرہ چاچی سے لڑ جھگڑ کر اسے

ساتھ ہی لے آئی تھیں۔ بلکہ گھر خالی کرنے کی دھمکی بھی دے آئی تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی چاچی گھر خالی کرنے والی نہیں تھیں اور خالہ ناصرہ جو اتنے سالوں بعد گاؤں آئی تھیں پھر کب آنا تھا انہوں نے گاؤں اور گاؤں میں ان کا تھا ہی کون۔ بس خلیفہ جی جو ان کے نانا کے بھائی تھے۔ جن کے مرنے پر وہ اب آئی تھیں۔ وہ شاید خالہ کے ساتھ نہ آتی اگر غلام رسول اور چاچا کا موثر نہ کہنا۔ تو وہ یہاں آ گئی تھی خالہ کے گھر میں جو نیل گروں کی گلی میں تھا۔ غلام رسول تین چار ماہ بعد خالہ کے گھر آتا تھا۔ کبھی سرسوں کا ساگ لے کر اور کبھی کوئی اور سوغات لے کر، خالہ بھی اس کے آنے پر بہت خوش ہوتی تھیں۔

''غلام رسول بیٹا اسے سمجھاؤ ہر وقت چپ گم صم رہتی ہے۔''

اور غلام رسول تو بولتا چلا جاتا تھا۔ جانے کیا کیا۔ یہ الگ بات تھی کہ ہر بات اس کے سر سے گزر جاتی تھی۔ وہ شہر آ کر اوٹھی اوٹھی باتیں جو کرنے لگا تھا۔ وہ چلا جاتا تو وہ اس کی کہی ہر بات بھول جاتی تھی لیکن آج رات کے اس پہر اسے غلام رسول کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اس کی فکر کرنا، اس کی وہ والہانہ نظریں، اس کا چوری چوری اسے دیکھنا، ان کا ادراک اسے آج ہو رہا تھا۔ اندر کہیں آگہی کے دروازے کھل رہے تھے بند ہو رہے تھے۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی اتنی مدھم کہ لگتا جیسے دل پاتال میں گر گیا ہو۔

''کیا ہوا تحسین! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟''

خدیجہ نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... کچھ نہیں۔ بس یوں ہی آنکھ کھل گئی تھی تو......''

وہ چونکی، گھبرائی اور پھر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن بند آنکھوں کے پیچھے بھی لحہ لحہ بعد غلام رسول کا سراپا لہراتا اور کانوں میں حاجرہ آپا کی آواز رس گھولتی ''تمہارے پاس غلام رسول ہے نا۔''

وہ آج پہلی بار کسی نئے احساس سے روشناس ہو رہی تھی۔ یہ احساس کیا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیا یہ محبت ہے۔ نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے خود سے پوچھا تھا۔ یا عشق ہے اور محبت اور عشق میں بھلا کیا فرق ہے...... چلو جو بھی فرق ہو کچھ تو ہے نیا جو میں آج غلام رسول کے لیے محسوس کرتی ہوں۔ وہ سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔

☆☆☆

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو خدیجہ بچوں کو ناشتا کروا رہی تھی۔

''اٹھ گئیں تم۔'' خدیجہ نے نوالہ بنا کر آمنہ کے منہ میں دیا۔

''وہ میری آنکھ ہی نہیں کھلی آپ جگا دیتیں مجھے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''تمہیں شاید رات نیند نہیں آ رہی تھی دیر سے سوئی تھیں اس لیے میں نے نہیں جگایا۔'' خدیجہ نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔

''اماں نے آلو والے پراٹھے پکائے ہیں منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی جاؤ، میں اور اماں تو ناشتا کر چکے۔''

اور وہ شرمندہ شرمندہ سی باہر چلی گئی۔ خدیجہ نے جاتے جاتے اسے دیکھا اور دکھ سے سوچا کتنی پیاری ہے لیکن اپنی خوب صورتی اور حسن سے بے نیاز احساس سے عاری۔ جیسے کوئی خوب صورت گڑیا۔

''امی۔''

خرم نے منہ کھولا تو وہ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اسے کھلانے لگی کچھ ہی دیر بعد تحسین چائے کا کپ اور پراٹھا لے کر اندر ہی آ گئی۔

''خدیجہ آپی!''

پراٹھے کا نوالہ توڑ کر اس نے منہ میں رکھا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ خدیجہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ حاجرہ آپا صحیح کہتی ہیں مجھے پڑھنا چاہیے آپ مجھے چوتھی جماعت کی کتابیں اور کاپیاں لا دیجیے گا اور خالہ سے بھی پوچھ لیجیے گا کہ میں حاجرہ

آپا کے پاس پڑھنے چلی جایا کروں۔"
"ہاں ہاں کیوں نہیں مجھے آج سعید کی پھپھو کے گھر جانا ہے۔ واپسی پر لیتی آؤں گی۔"
خدیجہ خوش ہوگئی تھی۔ اور اماں بھلا کیوں منع کریں گی وہ تو خوش ہوں گی۔
وہ سر جھکا کر ناشتا کرنے لگی۔ ناشتا ختم کر کے وہ چائے کا خالی کپ کچن میں رکھ کر واپس آئی تو خدیجہ بھی بچوں کو ناشتا کروا چکی تھی اور بچوں کے کپڑے استری کرنے کے لیے نکال رہی تھی۔
"لائیں مجھے دے دیں میں استری کر دیتی ہوں۔" اس نے خدیجہ کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے۔
"ٹھیک ہے تم ہی کر دو۔ میں اتنے میں بچوں کو نہلا لیتی ہوں۔"
خدیجہ بچوں کو لے کر چلی گئی تو کپڑے استری کر کے اس نے الماری سے ایک کاغذ نکالا اور مٹھی میں دبا کر باہر آئی تو خدیجہ خالہ ناصرہ سے باتیں کر رہی تھی اور بچے ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے۔
"نہائے نہیں ابھی۔"
"نہیں، بس وہ اماں سے کچھ بات کرنے لگی تھی۔" خدیجہ نے جواب دے کر بچوں کو آواز دی۔
"خدیجہ آپی! وہ مجھے ایک فون کرنا ہے آپ نمبر ملا دیں گی۔"
"ہاں کس کو کرنا ہے۔" خدیجہ نے پوچھا۔
"وہ غلام رسول کو۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔
"کوئی کام تھا۔"
"نہیں بس وہ اسے بتانا تھا کہ میں اب حاجرہ آپا سے پڑھوں گی وہ کہتا ہے نا مجھ سے پڑھنے کو تو خوش ہو جائے گا۔" اس نے نظریں جھکا گئی تھیں۔
خدیجہ نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں کچھ رنگوں کو بکھرتے دیکھا اور اس کی ہر جذبے سے عاری سپاٹ آنکھوں میں انوکھے سے رنگ لہراتے تھے۔
"چلو آؤ، تمہیں نمبر ملا دیتی ہوں۔"

اس نے مٹھی میں بند کاغذ خدیجہ کی طرف بڑھایا اور خدیجہ کے ساتھ ہال کمرے میں آگئی جہاں فون ہوتا تھا۔
بہت دن پہلے غلام رسول نے اسے نمبر دیا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اسے فون کر لے لیکن صبح کے وقت یا رات کو۔ دن میں تو وہ ظاہر ہے جامعہ میں ہوتا ہوگا اور شام کو کالج اور اس نے وہ کاغذ الماری میں اخبار کے نیچے رکھ دیا تھا۔
"لو بھئی بیل ہو رہی ہے۔" خدیجہ نے ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور باہر چلی گئی۔
"ہیلو...... ہیلو کون۔"
دوسری طرف غلام رسول ہی تھا۔ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس گئی تھی اور ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔
"وہ...... وہ میں......"
"کون ...... کون بول رہا ہے۔" غلام رسول پوچھ رہا تھا۔
"میں...... میں ہوں تاسین۔"
بمشکل اس کے حلق سے نکلا تھا۔ حالانکہ وہ تو غلام رسول سے ذرا بھی جھجکتی نہ تھی۔ جو منہ میں آتا بول دیتی تھی۔
"تاسین ...... ہاں تاسین فاطمہ کیا ہوا۔" وہ گھبرا گیا تھا۔
"سب خیریت ہے نا۔"
"ہاں وہ مجھے بتانا تھا کہ میں کل سے حاجرہ آپا کے پاس پڑھنے جایا کروں گی۔" اس نے بائیں ہاتھ سے پیشانی پر نمودار ہوتے پسینے کے قطرے پونچھے۔
"سچ ...... سچ تاسین فاطمہ!" وہ خوش ہوا۔
"ہاں سچ ...... اور ...... مجھے یہ بھی بتانا تھا کہ...... وہ جھجک کر خاموش ہوگئی تھی۔"
"ہاں ...... ہاں بولو تاسین فاطمہ!" وہ اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔
"یہ ...... یہ کہ میں بھی تمہیں یاد کرتی ہوں اور حاجرہ آپا کہتی ہیں کہ تمہارے پاس غلام رسول ہے

پھر تم خوش کیوں نہیں رہتی ہو۔ مجھے لگا وہ ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کر کے تھوک نگلا تھا۔

"تاسین...... تاسین فاطمہ...... میں تو ہمیشہ سے تمہارے پاس ہوں اور تمہارے پاس رہوں گا اور ہاں پھر کہنا یہ تم کیا کہہ رہی تھیں تم بھی مجھے یاد کرتی ہو۔"

"جی۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"تم نے آج مجھے مالا مال کر دیا تاسین فاطمہ۔ مجھے اپنی محبتوں اپنے جذبوں پر یقین تھا لیکن زندگی سے متعلق تمہارے رویے مجھے مایوس کرتے تھے۔ جسے زندگی سے ہی پیار نہ ہو...... جینے سے ہی دلچسپی نہ ہو۔ وہ بھلا غلام دین کمہار کے بیٹے کی محبتوں کی گہرائی کہاں پا سکے گی، وہ بھلا مجھ سے کیوں کر محبت کرے گی۔" وہ بول رہا تھا اور اس کی ہتھیلیاں ایک بار پھر پسینے میں بھیگتی جا رہی تھیں۔

"تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو نا...... نہیں بھی کرتیں تو اب کرو گی نا۔" اس کی آواز گمبھیر اور بھاری ہو گئی تھی۔

"جی۔" اس کے لبوں سے بمشکل نکلا تھا اور اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اپنی بھیگی ہتھیلیاں قمیص کے دامن سے صاف کیں اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکل آئی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ خالہ ناصرہ اس وقت آرام کرتی تھیں کہ تہجد کے وقت سے اٹھی ہوتی تھیں۔ خدیجہ کمرے میں بچوں کو تیار کر رہی تھی۔

"بات ہو گئی۔" اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"جی۔" وہ پتا نہیں کیوں جھینپ سی گئی تھی۔

"اماں بتا رہی تھیں کہ غلام رسول نے بی۔ اے کر لیا ہے اور دس پندرہ دنوں تک جامعہ سے بھی فارغ ہو جائے گا۔" خدیجہ نے کنگھی اٹھا کر آمنہ کے بال بنائے۔

"جی۔"

"آگے کیا ارادہ ہے اس کا۔" اس نے اب رخ موڑ کر تحسین کی طرف دیکھا تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ ابھی تک کھڑی خدیجہ کو دیکھ رہی تھی۔

"اماں کہہ رہی تھیں غلام رسول اچھا لڑکا ہے۔ غلام رسول اور اس کے اماں ابا تمہارا بہت خیال کرتے ہیں۔"

اس کی پلکیں لرزیں اور رخساروں پر سرخی سی دوڑ گئی۔

"تحسین......" خدیجہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ تب آمنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"امی! خرم نے میرے بال خراب کر دیے ہیں۔"

"ارے یہ کیا کر دیا بھئی۔"

"خدیجہ نے خرم کی مٹھی سے اس کے بال چھڑائے اور وہ ایک بار پھر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی تحسین کمرے سے باہر نکلی۔"

"میں ذرا کچن سمیٹ لوں اور برتن دھو دوں۔"

وہ خالہ ناصرہ کے منع کرنے کے باوجود برتن دھو کر کچن سمیٹ دیتی تھی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے ماسی رحمت آتی تھی۔ اس نے تو خالہ سے کہا تھا کہ وہ آرام سے سب کام کر لیا کرے گی۔ ماسی رحمت کی کیا ضرورت ہے تو خالہ ناصرہ ہنسی تھیں۔

"تم کیوں کسی کی لگی لگائی روزی پر لات مارتی ہو۔ کئی سالوں سے وہ کام کر رہی ہے کرنے دو۔" اور وہ چپ کر گئی تھی کہ خالہ شاید صحیح ہی کہہ رہی تھیں۔

وہ برتن دھو کر اور کچن سمیٹ کر کمرے میں آئی تو خدیجہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ خدیجہ کے جانے کے بعد وہ یونہی کچھ دیر بالکونی میں کھڑی رہی پھر کمرے میں واپس آ گئی۔

آج کا دن اس کے لیے بہت انوکھا اور مختلف سا تھا۔ کام کرتے ہوئے یا پھر آرام کرتے ہوئے بھی اس کے اندر پھول چٹکتے اور کھلتے تھے۔ اس نے سارا دن غلام رسول کو سوچتے ہوئے گزار دیا تھا۔ اس کی وہ

ساری باتیں جن پر اس نے غور کرنے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی تھی آج وہ سوچتی اور آپوں آپ مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو ناصرہ خالہ کو چائے دے کر وہ ان کے پاس ہی برآمدے میں بیٹھی تھی۔ خود وہ شام کو کم ہی چائے پیتی تھی۔ پہلے تو وہ بالکل ہی نہیں پیتی تھی۔ لیکن جب سائرہ گھر آئی تو پڑھتے ہوئے کئی بار چائے پیتی تھی اور ایک آدھ بار اسے بھی زبردستی پلا دیتی یوں وہ بھی کبھار شام کو چائے پی لیتی تھی۔ لیکن آج تو جیسے بھوک پیاس سب اڑ گئی تھی۔ دل نئے نئے احساسات سے روشناس ہو رہا تھا اور وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔

"خدیجہ کہہ رہی تھی رات کے لیے مٹر چاول بنا لیجیے گا۔" خالہ ناصرہ نے چائے پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "کچن میں مٹر پڑے ہیں۔ لے آؤ یہاں ہی بیٹھ کر دانے نکال دیتی ہوں۔"

وہ اٹھی۔

"آلو پیاز والی ٹوکری بھی لے آنا۔"

وہ کچن کی طرف بڑھی تب ہی سیڑھیوں سے نمودار ہوتے غلام رسول کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو چھ سات ماہ بعد چکر لگاتا تھا۔ جب گاؤں سے واپس آتا تھا تب۔ وہاں کی کوئی نہ کوئی سوغات دینے کے بہانے۔ خالہ ناصرہ بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ آیا تھا۔ خیریت ہے نا غلام رسول کہیں تاسین کے چچا نے تو اسے واپس نہیں بلوا لیا۔ بہرحال وہ اس کا شرعی وارث ہے۔

"نہیں خالہ! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ تحسین پر ایک نظر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "دراصل میرے ایک دوست کے ابو وکیل ہیں۔ میں نے ان سے بات کی تھی کہ کیسے تاسین کے چچا نے اس کے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے تو انہوں نے کہا کہ درخواست دے دیں، تاسین کو اس کا حق مل جائے گا۔ تو میں نے تاسین کی رضا مندی لینی تھی اور دستخط بھی کروانے تھے اس سے درخواست پر۔ پھر وکیل نوٹس بھیجے گا انہیں۔"

"میں نے کیا کرنا ہے گھر لے کر۔ میں تو اب یہاں ہی رہوں گی خالہ کے پاس۔" وہ خالہ ناصرہ کے تخت کے قریب ہی کھڑی تھی۔

فروخت کر دینا اور جو پیسہ ملے گا سنبھال کر رکھ لینا تمہارے کام آئے گا۔" غلام رسول اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بیٹی، غلام رسول صحیح کہتا ہے۔ اس گھر پر تمہارا حق ہے ان کا نہیں۔ وہ تمہارے نانا کا گھر تھا۔" خالہ ناصرہ نے بھی غلام رسول کی تائید کی۔

"چاچا کے پاس اپنا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ وہ چھ بندے کہاں جائیں گے کوئی خالی زمین بھی نہیں ہے جہاں گھر بنا سکیں۔ جو زمین ہے وہاں کاشت کرتے ہیں۔ پرانا گھر تو انہوں نے بہت پہلے فروخت کر کے ٹریکٹر لے لیا تھا۔" وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی یوں جیسے خود سے بات کرتی ہو پھر اس نے سر اٹھا کر غلام رسول کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ آپ چاچا کو نوٹس نہ بھیجیں۔ مجھے گھر نہیں چاہیے وہ میں نے انہیں ہی دے دیا۔"

زندگی میں پہلی بار اس نے خود سے کوئی فیصلہ کیا تھا اور خود بخود ہی اس کے لہجے میں اعتماد در آیا تھا۔

"یوں تو کبھی بھی اپنا حق نہیں چھوڑنا چاہیے مولوی صاحب بھی یہی کہتے تھے۔ لیکن اپنے چچا کی بے گھری کا خیال کر کے اگر تم اپنا حق چھوڑنا چاہتی ہو تو اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا تاسین فاطمہ۔"

غلام رسول کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش تھی اور خالہ ناصرہ کے لبوں کی مسکراہٹ بھی بتاتی تھی کہ انہیں تاسین فاطمہ کی بات اچھی لگی ہے۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے اس کے بازو پر ہلکی سی تھپکی دی اور غلام رسول کی طرف دیکھا۔

"تم کھانا کھا کر جانا میں مٹر پلاؤ پکانے لگی ہوں۔"

"نہیں...... نہیں خالہ بس میں ابھی......"

"بازار کے کھانے کھا کھا کر بندہ اوب ہی جاتا

ہے، آج گھر کا کھالو۔"
خالہ ناصرہ کے خلوص سادگی اور شفقت سے وہ ہمیشہ ہی متاثر ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے سر جھکا دیا تھا۔
"جی اچھا۔"
خالہ ناصرہ کچن میں چلی گئی تو اس نے تحسین کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑی تھی۔
"بیٹھ جاؤ تاسین۔" وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"میں آج بہت خوش ہوں۔ آج پہلی بار مجھے لگا کہ میری محبتیں رائگاں نہیں ہیں۔"
اس کی خواب ناک آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔ گداز لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"بہت اچھی لگ رہی ہو تاسین...... بہت پیاری۔"
آج خدیجہ کے جانے کے بعد اس نے سائرہ کا لایا ہوا کاٹن کا ریڈی میڈ سوٹ پہنا تھا لائٹ فیروزی اور لائٹ پنک کے امتزاج والا اور ساتھ میں پنک اور فیروزی چوڑیاں پہن کر آنکھوں میں کاجل بھی لگایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار...... یا شاید جب وہ اپنی اماں کی گود میں تھی تو وہ اسے سرمہ یا کاجل لگاتی ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ شرما گئی تھی۔ خالہ ناصرہ نے بھی تعریف کی تھی۔
"ایسے ہی رہا کرو تحسین...... اب سائرہ اتنے شوق سے تمہارے لیے چوڑیاں لائی تھی اور تم نے پہنی نہیں تھیں تو اسے افسوس ہوا تھا۔"
"جی اب پہنوں گی۔"
اس نے جھکی نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔ اسے خود نہیں پتا تھا کہ آج وہ اس طرح کیوں تیار ہوئی تھی آج کیوں اس کا بننے سنورنے کو دل چاہا تھا۔ شاید دل کے تار کسی دل سے جڑے تھے شاید اندر کہیں الہام ہوا تھا کہ آج غلام رسول آئے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ خود اس الہام سے بے خبر تھی۔

"تاسین! پیاری تو تم ہمیشہ سے تھیں۔ لیکن آج تو نگاہ تمہارے چہرے سے ہٹانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔"
اس کے ذرا سے اظہار نے غلام رسول کو اپنے جذبوں کے اظہار کا موقع دے دیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے اعتدال ہو رہی تھیں۔ دھک دھک اس نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا۔ پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئی تھیں رخساروں پر شفق نثار ہوتی تھی۔ آج وہ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ آج اس کے سپاٹ چہرے پر قوس قزح کھیلتی تھی اور بے تاثر آنکھوں میں رنگوں کی ہولی مچی تھی۔ اس میں تبدیلی آ رہی تھی۔ امید کی ایک ننھی سی کرن نے غلام رسول کے اندر چراغاں کر دیا تھا۔
"تم نے جو پڑھنے کا سوچا ہے۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔"
"حاجرہ آپا کہتی ہیں علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اپنی موت تک آدمی علم حاصل کر سکتا ہے۔" اس نے جھکی نظروں سے بتایا۔
"تمہاری حاجرہ آپا بالکل صحیح کہتی ہیں تحسین۔" وہ مسکرایا۔
مسکراہٹ اس کے گداز لبوں پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے فوراً نظریں چرا لیں۔ آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس طرح غلام رسول کو نہیں دیکھا تھا آج پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ غلام رسول کے چہرے پر داڑھی کتنی جچتی ہے اور پھر یکدم ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں ذرا خالہ ناصرہ کی مدد کروں۔"
اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی اسے اس کی یہ حیا...... یہ گریز، شرمانا، گھبرانا سب اچھا لگ رہا تھا۔ پہلے بھلا کہاں ایسے جذبے اس کی ذات سے چھلکتے تھے وہ تو بس پتھر کی مورتی تھی۔ وہ کچن میں چلی گئی تھی لیکن مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی خالہ ناصرہ اسے چاول بھگونے کا کہہ کر باہر آ گئیں۔
"گاؤں جاؤ تو اپنے اماں ابا کو ہماری طرف

سے بہت پوچھنا۔" خالہ ناصرہ تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔

"ہفتہ دس دن تک مجھے جامعہ کی ڈگری مل جائے گی تو پھر گاؤں چلا جاؤں گا۔" اس نے بتایا۔

"کیوں کیا آگے پڑھنے یا نوکری کا ارادہ نہیں ہے۔"

"دراصل ارادہ تو تھا کہ بی۔ ایڈ کر کے کہیں استاد لگ جاؤں لیکن فی الحال بی۔ اے کا نتیجہ آنے تک گاؤں میں ہی رہوں گا۔ چاچا زندہ ہوتے تو شاید یہاں ہی رہ کر درمیانی عرصہ میں کوئی نوکری کر لیتا۔ لیکن آپ کو پتا ہے سال بھر پہلے چاچا کے انتقال کے بعد چچی میکے چلی گئی تھیں گھر کرائے پر دے دیا تھا۔ پہلے میں دوست کے ساتھ کمرا شیئر کرتا تھا لیکن اب تین چار ماہ سے سارا کرایہ خود ہی دینا پڑتا ہے تو میں نے بہتر ہی سمجھا کہ ابھی گاؤں چلا جاؤں۔"

اس نے تفصیل سے بتایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ خالہ ناصرہ اس سے یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں۔ ایک بار پہلے بھی انہوں نے اس سے تحسین کے حوالے سے مبہم سی بات کی تھی۔ سو ضروری سمجھا کہ انہیں کچھ تسلی بھی دے دے۔

"چچا کے ایک دو ملنے والوں سے میں نے نوکری کے لیے کہہ رکھا ہے۔ اگر کوئی اچھی نوکری مل گئی تو پرائیویٹ ایم۔ اے کر لوں گا۔ اچھی نوکری مل جائے تو پھر شادی کا سوچوں۔" خالہ ناصرہ کھڑی ہو گئیں۔

"مغرب کی اذان ہونے والی ہے وضو کر لوں اور ہاں تم نماز پڑھ کر ادھر ہی آنا۔ کھانا کھا کر جانا، کہیں مسجد سے ہی چلے نہ جانا۔"

"جی بہتر۔"

اور جب وہ نماز پڑھ کر آیا تو خدیجہ بھی آ چکی تھی۔ خالہ ناصرہ کی طرح وہ بھی اسے بہت مخلص اور مہربان سی لگی تھی۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور وہ کھانا کھا کر چلا گیا تو تحسین کچن میں آ کر برتن دھونے لگی۔

☆☆☆

"تحسین غلام رسول اچھا ہے۔ اچھا لگا مجھے۔"

بچوں کو سلا کر خدیجہ بھی کچن میں آ گئی تھی اور کاؤنٹر پر پڑے برتن سمیٹ رہی تھی۔

"میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔"

اس نے مڑ کر خدیجہ کو دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔

"یہ محبت کیا ہوتی ہے خدیجہ آپی اور کیسے ہو جاتی ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں پتا کہ کیسے ہو جاتی ہے سنا نہیں تھا حاجرہ آپا نے کیا کہا تھا اس کیوں کا جواب تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ محبت کیا ہے تو پیاری تحسین یہ ایک لامحدود جذبہ ہے۔ ہم اسے چند لوگوں یا چند لفظوں تک محدود نہیں کر سکتے۔ کسی نے محبت کو سچ کہا تو کسی نے محبت کو خدا کہا۔ ہر شخص کا اپنا پیمانہ اور اپنی نظر ہے۔ تحسین! سر حامد کہتے تھے کہ اس کائنات کی تخلیق ہی محبت کے لیے کی گئی ہے بچوں سے محبت، ماں باپ سے محبت، بہن بھائیوں سے محبت...... یہ بڑا لافانی جذبہ ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوستوں سے محبت، اپنے شہر اپنے وطن سے محبت۔ اپنے دین سے محبت، تحسین فاطمہ تم محبت کو محدود نہیں کر سکتیں نہ ہی کسی ایک فرد کے لیے مخصوص کر سکتی ہو۔"

خدیجہ نے لمبی بات کی تھی لیکن وہ حیران سی سوچتی تھی کہ بیک وقت آدمی اتنے سارے لوگوں سے کیسے محبت کر سکتا ہے۔ اور اسے الجھن سے اپنی طرف دیکھتا پا کر خدیجہ ہنس دی۔

"چلو چھوڑو تاسین فاطمہ! تم اس جھگڑے میں نہ پڑو کہ محبت کیا، کیوں ہے تم بس اس محبت کو محسوس کرو جو غلام رسول کے دل میں تمہارے لیے ہے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے تحسین فاطمہ، اسے کھونا مت۔ کھو جانے کا کرب بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔"

"میں کون سا ہر وقت اس کے ساتھ ہوتی ہوں جو وہ مجھ سے کھو جائے گا۔ پھر وہ مجھ سے چار سال بڑا

ہے اور چار سال سے یہاں شہر میں رہ رہا ہے بھلا کیسے کھو سکتا ہے۔"

وہ ابھی سنک دھونے لگی تھی۔ خدیجہ کو اس کی سادگی پر پیار آیا۔ وہ بے وقوف یا کم عقل نہیں تھی لیکن اپنی محدود سی زندگی کی سادگی اور معصومیت میں وہ باتوں کی گہرائی تک نہیں جاتی تھی۔

"بعض لوگ ساتھ نہ ہو کر بھی ساتھ ہی ہوتے ہیں تحسین فاطمہ۔ تم ہمیشہ اس کے ساتھ ہی ہوتی ہو یہ مجھے ایک ملاقات میں پتا چل گیا اور تم اتنے برسوں میں نہ جان سکیں۔ تمہیں وہ محبت کیوں نظر نہیں آتی، کیوں نہیں دکھتی جو اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے ہے۔" خدیجہ کاؤنٹر سے چیزیں سمیٹ کر اب اسے صاف کر رہی تھی۔

"کور بینا جو ہوں۔ غلام رسول کہتا ہے تو صحیح ہی کہتا ہے۔"

وہ جیسے خود سے ناراض ہو کر بولی تھی۔ خدیجہ ہنس دی۔ لیکن دل میں جیسے کسی نے چٹکی بھری تھی تم کون سی بینا تھیں۔ تمہیں بھی تو شہزادہ عالمگیر کی محبت کی سچائی نظر نہیں آئی تھی۔ کیا تھا اگر تم اس سچائی کو جان پاتیں یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر میں خوش اور مطمئن نہیں ہو، سعید اچھا شوہر اور اچھا باپ تھا خیال رکھنے والا لیکن پھر بھی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی ہوتی تھی سوئی چبھنے کی جیسی۔

کچن سمیٹ کر وہ دونوں کمرے میں آ گئیں۔ بڑا کمرہ جہاں ٹی۔ وی تھا اور ٹی۔ وی دیکھتے ہوئے دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ خدیجہ نے اسے کتابیں اور کاپیاں دکھائیں جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔ وہ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی تھی اس لیے بیڈ پر لیٹتے ہی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ لیکن وہ غلام رسول کو سوچ رہی تھی۔ سوچنا چاہتی تھی اور وہ ساری باتیں دہرانا چاہتی تھی جو آج شام غلام رسول نے کی تھیں۔ اور پھر غلام رسول اور اس کی باتوں کو سوچتے سوچتے وہ جانے کب سو گئی۔

خدیجہ پانی پینے کے لیے اٹھی تو اس نے دیکھا کہ سوتے میں بھی اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ اس سے وہ اتنی معصوم اور پیاری لگ رہی تھی کہ خدیجہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور اس کے لبوں سے بے اختیار اس کے لیے دعا نکلی۔

"یا اللہ! غلام رسول کو تحسین کا ہی نصیب بنانا۔"

کہ آج اس نے اگر غلام رسول کی آنکھوں میں تحسین کے لیے محبت دیکھی تھی تو تحسین کی بے تاثر آنکھوں میں غلام رسول کے نام پر رنگوں کی برسات ہوتے اور رخساروں پر گلاب کھلتے دیکھے تھے۔ رات کے اس پہر خدیجہ کے پر خلوص دل سے نکلنے والی دعا اوپر آسمانوں پر در قبولیت کی طرف رواں تھی اور خدیجہ پانی بن کر ایک بار پھر اس کے اچھے نصیب کی دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی خوب صورت ہے، بہت خوب صورت۔

اس نے صحن میں کھڑے ہو کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ چودھویں کا چاند جیسے بالکل اس کے سر پر چمکتا تھا۔ پورے صحن میں چاند کی روشنی بکھری تھی اور چاروں طرف موتیے اور گلاب کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔ صحن کی دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں موتیا، رات کی رانی، چنبیلی اور گلاب کے پودے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر چاند سے نظر ہٹائی۔ آسمان پر یہ چمکتا چاند، دمکتے تارے تو ہمیشہ سے تھے وہ اسے کبھی خوب صورت نہیں لگے تھے یا اس نے کبھی دھیان سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ جیسے اب دیکھتی تھی شاید اس کے اندر تب حسن اور خوب صورتی کو محسوس کرنے والی حس ہی نہیں تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو تاسین فاطمہ۔" غلام رسول پتا نہیں کب چپکے سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔

چاند کو دیکھتی ہوں کتنا روشن اور خوب صورت لگ رہا ہے۔ تاسین نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

"لیکن پہلے تو تمہیں یہ کبھی خوب صورت نہیں لگا تھا۔ نہ چاند، نہ ستارے، نہ پرندے۔" غلام رسول اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"شاید پہلے مجھے زندگی کا صحیح مفہوم نہیں معلوم تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ زندگی تو بس یہی ہے جو میں گزار رہی ہوں بھدی بے رنگ، بدصورت۔"

"اور اب، اب کیسی لگتی ہے زندگی؟" وہ پوچھ رہا تھا لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"خوب صورت بہت خوب صورت کیونکہ اب آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ کا ساتھ ہر چیز کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔ اب ہر چیز کو میں آپ کی نظر سے دیکھتی ہوں۔"

یہ تحسین فاطمہ تھی جس کا سپاٹ چہرہ اور خالی آنکھیں بڑی سے بڑی بات پر بھی بے تاثر رہتی تھیں۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں ہزاروں رنگ دمک رہے تھے کہ آج غلام رسول اس کا ہم سفر تھا۔ اس کا شریک حیات۔

☆☆☆

خدیجہ کی رات کے اس پہر کی گئی دعا نے درقبولیت کو چھولیا تھا۔ وہ بارگاہ ایزدی میں قبول کرلی گئی تھی۔ اور اس رات کی صبح وہ ناشتے کے بعد کتابیں کاپیاں اٹھائے حاجرہ کے پاس چلی آئی تھی اور حاجرہ کو لگا تھا کہ یہ وہ تحسین فاطمہ نہیں تھی جو کل اس کے پاس آئی تھی اور جسے وہ پچھلے کچھ عرصے سے دیکھ رہی تھیں یہ تو کوئی اور ہی تحسین فاطمہ تھی اعتماد، یقین اور امید کی دولت سے مالا مال۔ آج ان آنکھوں میں صحراؤں کی ویرانی نہیں تھی بلکہ کسی احساس سے لمحے لمحے بعد چراغاں سا ہو جاتا تھا۔ اور حاجرہ نے بھی اس کی راہ نمائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اردو، حساب، انگلش وہ سب ہی پڑھنے لگی۔ قرآن بھی نئے سرے سے پڑھا نماز بھی سیکھی۔ حاجرہ نے اس کے دل میں دین سے اللہ سے اور کتابوں سے محبت پیدا کی...... یہ حاجرہ ہی تھیں جس نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ غلام رسول کو تم کہہ کر نہ بلایا کرے کہ وہ اس سے عمر میں بڑا بھی ہے اور اس کا شوہر بھی ہے۔

غلام رسول کو جامعہ کی ڈگری لیتے ہی اسی جامعہ میں معلم کی نوکری مل گئی تھی۔ اس نے خالہ ناصرہ کو بتایا تھا کہ وہ پہلے عربی میں اور پھر اسلامیات میں ماسٹر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو وہ پرائیویٹ کرے گا۔ اس سلسلے میں جامعہ کے منتظم مولانا صاحب اس کی مدد کریں گے جو خود بھی پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔اے کر چکے تھے۔

"کیا جامعہ میں ہی نوکری کرو گے۔ کہیں کوئی اور اچھی جاب تلاش نہیں کرو گے۔ کہو تو تمہارے خالو سے بات کروں وہاں دبئی میں۔"

"نہیں خالہ جامعہ میں پڑھانا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے...... اور اتنا اعزازیہ مل جاتا ہے کہ اچھی طرح گزارا ہو جائے۔"

"تو کیا شادی کا ارادہ نہیں ہے۔"

خالہ ناصرہ نے وہ بات کی تھی جو کرنا چاہتی تھیں اور خدیجہ نے جانے سے پہلے انہیں بہت تاکید کی تھی کہ وہ غلام رسول اور تحسین کی شادی کی بات کریں۔

"جی خالہ...... لیکن......"

"لیکن کیا۔" خالہ ناصرہ نے ان کی بات کاٹ کر صاف بات کی تھی۔ "یہی عمر ہے شادی کی اور میں بھی چاہتی ہوں کہ تحسین کی ذمہ داری لی ہے تو احسن طریقے سے اس سے وقت پر فارغ ہو جاؤں۔ میرا خیال تمہارے لیے تھا لیکن اگر تمہارا کہیں اور ارادہ ہو تو بتا دو پھر میں تحسین کے لیے کوئی اور رشتہ دیکھوں۔"

"نہیں نہیں خالہ! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ نے میرے اور تحسین کے لیے جو سوچا اس سے بہتر بھلا کیا ہو سکتا ہے۔"

وہ فوراً ہی بولا تھا اور دروازے کے پیچھے کھڑی تحسین کا دل جیسے اس خوشی کو سہار ہی نہ پا رہا تھا اور آنکھیں...... ہمیشہ خشک رہنے والی آنکھیں احساس تشکر سے نم ہو رہی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے اپنے اماں ابا کو لے کر آؤ۔"

دو دن بعد ہی غلام رسول اپنے ماں باپ کو لے آیا تھا۔ یہ تو ان کی بھی خواہش تھی کہ تحسین فاطمہ ان کی بہو بنے۔ سو شادی کی بات طے پا گئی تھی۔ غلام

رسول جامعہ میں نوکری ملنے کے بعد وہاں ہی منتقل ہوگیا تھا کہ اساتذہ اور طلباء کے لیے جامعہ سے منسلک رہائش گاہ تھی۔ کرائے کا کمرہ وہ چھوڑ چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ کوئی چھوٹا سا کم کرائے والا گھر مل جائے تو وہ اماں ابا کو بھی یہاں ہی لے آئے کہ غلام دین اب بوڑھا ہوگیا تھا اور اس سے کام نہیں ہوتا تھا اور پھر پچھلے دنوں اسے فالج کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا تو اسے علاج کے سلسلے میں انہیں بار بار گاؤں سے شہر لانے میں دقت ہوتی تھی۔ ابھی بھی وہ مکمل طور پر ٹھیک نہیں تھے۔ ایک ہاتھ اور بازو ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا۔ یہاں شہر میں باقاعدگی سے تھراپی وغیرہ ہوتی تو جلدی ٹھیک ہوجاتے۔ اس نے جب یہ مسئلہ خالہ ناصرہ کے سامنے رکھا تو خالہ ناصرہ کو فوراً ہی شاہ جی کے خالی گھر کا خیال آیا تھا۔ شجاع محی الدین کی شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے گھر ابھی تک خالی تھا۔

"گھر کی تم فکر نہ کرو میں آج ہی حاجی صاحب سے بات کرتی ہوں۔" گھر کی چابیاں حاجی صاحب کے پاس ہی تھیں۔

"لیکن خالہ کرایہ مناسب ہو تو......"

"کرائے کی تم فکر نہ کرو بس اماں ابا کو یہاں لانے کی تیاری کرو...... ہماری گلی میں ہی آگے گھر ہے بس بے فکر ہو جاؤ۔"

یوں غلام رسول شادی سے پہلے ہی شاہ جی والے گھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ آ گیا تھا۔ شادی کے سارے اخراجات باقر صاحب نے ہی برداشت کیے تھے لیکن خالہ ناصرہ کی یتیم بھانجی کی شادی میں گلی کے سب لوگ ہی پیش پیش تھے۔ خالہ ناصرہ کے دروازے پر اکثر دستک ہوتی رہتی۔

"خالہ! کوئی کام ہو تو بتایئے گا۔ باقر بھائی تو بارات سے دو دن پہلے ہی آئیں گے نا۔"

گلو بادشاہ پوچھتا۔ "ابا کہہ رہے ہیں فرنیچر والے کے پاس کب چلنا ہے۔"

ہادی لیس والا لیسیں کنگریاں اور جانے کیا کیا اٹھائے آجاتا۔ "آپ پسند کرلیں خالہ، تو منگلے بھائی کو دے دوں۔"

وہ حیران ہو کر حاجرہ سے پوچھتی۔

"حاجرہ آپا! یہ کیسے لوگ ہیں۔ اتنے مخلص، اتنے شفیق اور محبت کرنے والے۔"

"ہاں بس ایسے ہی ہیں۔" حاجرہ مسکراتیں۔

"بھلا آج کل کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ۔"

وہ سوچتی ایک اس کے سگے چاچا چاچی تھے جب غلام دین چاچا اور صالحہ چاچی اس کے رشتے کے لیے چاچا کے پاس گئے تھے کہ خالہ ناصرہ نے ہی کہا تھا کہ تحسین کا شرعی وارث تو اس کا چچا ہی ہے نا تو اس کے پاس بھی ایک بار چلے جاؤ۔ جب وہ گئے تو چاچی نے کہا تھا کہ بھاڑ میں جائے تاسین۔ اس کی خالہ اس کا رشتہ غلام رسول کو دے یا کسی بھنگی کو ہماری جوتی کو بھی پروا نہیں۔"

چاچی صالحہ نے اسے بتایا تھا کہ جب وہ آ رہے تھے تو انہوں نے سنا تھا چاچا کہہ رہے تھے کہ لوگ بات بنائیں گے کہ یتیم بھتیجی کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تو لوگوں کے منہ بند کرنے کے لیے چلے جائیں گے۔

ناصرہ آپا نے ملک صاحب کے گھر فون کیا تھا نا کہ منہ دکھاوے کو ہی سہی بھتیجی کو رخصت کرنے کے لیے آجانا۔

"میں خوب جانتی ہوں ناصرہ کو اور اس کی چالاکیوں کو۔" چاچی نے جواب دیا تھا۔

"خالی ہاتھ جاؤ گے کیا ارے پہلے تو وہ اپنی بہن کا زیور مانگے گی۔ پورے بیس تولے زیور چڑھایا تھا اس کے باپ نے اور پھر......"

"اچھا چل ٹھیک ہے لوگوں کی زبانیں نہ پہلے بند ہوئی تھیں نہ اب بند ہوں گی۔"

اور یہ اس کے اپنے تھے اور یہ جو اس کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ جو اسے ٹھیک طرح سے جانتے بھی نہ تھے۔ ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے، وہ صرف اتنا ہی تو جانتے تھے کہ وہ ناصرہ کی یتیم بھانجی ہے۔ لیکن وہ سب اس کی شادی

میں اتنی دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ ان کے اپنے گھر کی کسی بہن بیٹی کی شادی ہو۔ کبھی زینب بی بی کچھ اٹھائے چلی آتیں۔ کبھی پروین، ستار شوز والے کی بیوی ڈنر سیٹ اٹھوا کے لے آتی۔

"یہ تحسین کے لیے رکھ لو ناصرہ بہن، مدحو کے لیے لیا تھا پر ابھی تو اس کی شادی میں دیر ہے۔"

سب ہی اپنی اپنی حیثیت کے حساب سے تحفے لا رہے تھے اور دن میں کتنی بار اس کی آنکھیں نم ہوتیں اور کتنی ہی بار وہ اللہ کا شکر ادا کرتی۔ اس سال ہونے والی یہ تیسری شادی تھی جس میں پوری گلی والے حصہ ڈال رہے تھے۔ پہلے کلثوم فاطمہ کی بیٹی آفرین کی پھر شجاع محی الدین کی اور اب تحسین فاطمہ کی۔

عصمت، راحیلہ اور سائرہ اس کی شادی میں شرکت کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی آ گئی تھیں۔ کپڑوں کی پیکنگ، میک اپ اور دوسری چیزوں کی خریداری سب ان کے ذمے تھی وہ تو بس ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا کرتی۔

خدیجہ نہیں آ سکتی تھی لیکن ہر دوسرے تیسرے دن فون کرتی۔ تیاری کہاں تک پہنچی، کیا خریدا۔ بارات کا لہنگا کیسا ہوگا۔ کون سا کلر لیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا نفیس سا گولڈ کا سیٹ باقر علی کے ساتھ بھیجا تھا۔

بارات سے ایک دن پہلے طاہر بھی کاکول سے آ گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی اس کا کوئی نہیں ہے وہ اس بھری دنیا میں اکیلی ہے۔ لیکن اس کے تو سب تھے۔ ماں اس کی فکر کرتی اس کے لیے دعائیں کرتی۔ بہنیں اسے مشورے دیتیں۔ رات کو ڈھولکی رکھ کر بیٹھ جاتیں۔ آس پاس سے بھی سب آ جاتیں۔ باپ تھا جس نے سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کیا تھا۔ بہنیں تھیں جو یوں آنسو بہا رہی تھیں جیسے اس نے ان کے سنگ جنم لیا تھا۔ طاہر نے سگے بھائی کی طرح قرآن کے سائے تلے رخصت کیا تو اس کا جی چاہا چیخیں مار مار کر روئے اور سجدے میں سر رکھے تو اٹھائے ہی نا۔

وہ خالہ ناصرہ کے گھر سے رخصت ہو کر شاہ جی والے گھر میں آ گئی تھی۔ یہ گھر بڑا بھا گوان تھا پچاس سال پہلے اس نے ہجرت کے زخموں سے چور محی الدین شاہ کے خاندان کے لیے اپنا دامن کشادہ کیا تھا تو آج تحسین فاطمہ اور غلام رسول کے لیے بازو وا کر دیے تھے۔ تحسین اس گھر میں آ کر بہت خوش تھی اسے سجاتی سنوارتی رہتی تھی۔ شادی کے بعد بھی اس نے حاجرہ کے پاس جانا نہ چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی پڑھتی تھی۔ اور گھر آ کر غلام رسول سے بھی پوچھ لیتی جو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ غلام رسول اس کا بہت خیال رکھتا تھا یوں سنبھال کر رکھتا جیسے وہ کوئی کانچ کا نازک برتن ہو۔

"میں تمہارے ماضی کے دکھوں کا ازالہ تو نہیں کر سکتا یاسین فاطمہ، لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ اب آج کے بعد تمہیں ہر دکھ سے بچاؤں گا اور ہر وہ خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا جو میرے اختیار میں ہوئی۔"

"آپ کی ہمراہی میں مجھے ماضی کی کوئی بات یاد نہیں رہی۔" اور غلام رسول مسکرا دیا تھا۔

"تمہیں بہت اچھی باتیں کرنا آ گیا ہے تاسین فاطمہ۔ میں تو حاجرہ آپا کا شکریہ ادا ہی نہیں کر سکتا جنہوں نے تمہیں میرے ہونے کا احساس دلایا۔ پھر اس کے چہرے پر بدلتی کیفیات دیکھیں تو پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو تاسین۔"

"کچھ نہیں بس یونہی اپنی گلی والوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔" اس نے چونک کر پلکیں جھپک کر پلکوں کے کناروں پر اٹکی نمی کو جھاڑا۔

"کیسے لوگ ہیں سب سے مختلف۔ اتنے اچھے۔"

"ہاں ایسے لوگ بھلا اب کہاں ہوتے ہیں۔ نایاب۔"

"یہاں اس نیل گردوں کی گلی میں۔"

وہ ہنسی تو غلام رسول اس کی ہنسی کی دلکشی میں کھو سا گیا۔ اس کے مقدر کا ستارا عروج پر تھا جو اسے

تاسین فاطمہ مل گئی تھی۔
"اب آپ کھو گئے۔" وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"تم سامنے ہو تو ہوش ہی کہاں رہتا ہے۔ میں مولوی صاحب کی طرف جانے کے لیے نکلا تھا اور تم نے بھلا دیا۔" وہ مسکرایا۔
"لیکن ابھی تو آپ عشاء پڑھ کے آئے ہیں پھر خیریت ہے نا۔" وہ حیران ہوئی۔
"ہاں خیریت ہے انہوں نے کہا تھا کسی اہم مسئلے پر بات کرنی ہے۔ وہ اپنے اذکار سے فارغ ہو جائیں تو گھنٹے آدھ گھنٹے تک ہم لوگ آجائیں۔ راجہ صاحب، حاجی صاحب، عبدالستار صاحب اور ڈاکٹر ہاشمی سب کو ہی بلایا تھا۔ یوں بھی عبدالستار صاحب اور حاجی صاحب آج نماز میں شامل نہیں تھے کہیں گئے ہوئے تھے دیر سے آنا تھا ورنہ نماز کے بعد ہی بات ہو جاتی۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔"
وہ دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ آئی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے باہر برآمدے میں ہی بیٹھ کر اپنی چھٹی جماعت کی کتابیں دیکھنے لگی تھی جو آج ہی غلام رسول لے کر آیا تھا۔ اس نے چند مہینوں میں ہی پانچویں کی کتابیں ختم کر ڈالی تھیں اور حاجرہ کہتی تھیں اگر وہ اس طرح لگن سے پڑھتی رہی تو اگلے سال وہ اس کا آٹھویں کا امتحان دلوا دیں گی کسی بھی پرائیویٹ اسکول کی طرف سے۔
"یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو بیٹی۔" غلام دین اپنے کمرے سے باہر نکلا تھا۔
"یوں ہی ذرا یہ کتابیں دیکھ رہی تھی چاچا۔ آپ کو کچھ چاہیے۔" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔ یہ غلام رسول کدھر ہے۔ اسے کہنا تھا صبح بسوں کے اڈے پر چلا جائے۔ صابر وہاں سامان چھوڑ جائے گا۔ میں نے کچھ گھڑے اور پراتیں منگوائی ہیں۔ وہ لے آئے گا۔ صبح اسے نکلنے کی جلدی ہوتی ہے تو میں نے سوچا کہ ابھی کہہ دوں صبح بھول نہ جاؤں۔"
"جی چاچا کہہ دوں گی۔" اس نے کتابیں سمیٹ کر شاپر میں ڈالیں۔
"سرخ نقش گھڑے تو تقریباً سارے ہی بک گئے تاسین فاطمہ۔" وہ بہت خوش تھے۔ تھراپی سے ان کا بازو کافی حد تک کام کرنے لگا تھا لیکن ساری زندگی کام کرنے والے آدمی کے لیے فارغ بیٹھنا بہت مشکل ہوتا ہے سو غلام دین بھی گھبرا گیا تھا۔
"غلام رسول! مجھے اور اپنی ماں کو گاؤں چھوڑ آؤ یار۔"
"وہاں جا کر کیا کریں گے ابا!" غلام رسول نے پوچھا تھا۔
"اپنا کام جو کرتا تھا۔ مٹی کے برتنوں کا۔ یہاں تو فارغ بیٹھ بیٹھ کر جھلا ہو جاؤں گا غلام رسول۔" اور ان کی فراغت کا حل بھی نکال لیا گیا تھا۔
"محی الدین صاحب کی دکان خالی پڑی ہے۔ ابھی تک کرائے پر نہیں چڑھائی تو غلام رسول بیٹا اپنے ابا جی کو اس دکان پہ بٹھا دو۔" حاجی صاحب نے مشورہ دیا تھا۔ "مجھے یقین ہے ان کا دل لگ جائے گا۔"
غلام رسول نے ان سے ذکر کیا تھا کہ۔ "اس کے والد واپس گاؤں جانا چاہتے ہیں جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتا۔ ابھی ان کا بازو ٹھیک طرح سے نہیں ہوا۔ میں ہر روز انہیں ایکسر سائز کرواتا ہوں ہر ہفتے ہاسپٹل لے کر جاتا ہوں آپ انہیں سمجھائیں شاید آپ کی بات مان لیں۔"
اور یوں فیصلہ ہو گیا کہ غلام دین دکان چلائے گا۔ لیکن دکان میں کیا رکھا جائے۔ کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء یا کچھ اور۔ اس بات کا فیصلہ غلام دین کا تھا۔
"مٹی کے گھڑے پراتیں صراحیاں وغیرہ۔"
"اور یہ گھڑے وغیرہ کون بنائے گا ابا!" غلام رسول نے پوچھا تھا۔
"صابر سے منگوائیں گے گاؤں سے۔" صابر بھی ان کے گاؤں کا کمہار تھا۔
یوں دکان میں مال آ گیا۔ غلام دین خوش

رہنے لگا تھا۔ گو شہر میں لوگ پانی ٹھنڈا رکھنے کے لیے کولر استعمال کرتے تھے۔ اکثر گھروں میں فریج بھی ہوتا تھا پھر بھی کچھ لوگ گھڑے اور صراحیاں وغیرہ خریدنا پسند کرتے تھے اور غلام دین کا کام جھبی کچھ نہ کچھ چل پڑا تھا سواب وہ مطمئن تھا۔ تیل گھروں کی گلی میں مٹی کے برتنوں کی یہ واحد دکان تھی۔

''تاسین فاطمہ! تم نے یہ نہیں بتایا غلام رسول کہاں گیا ہے۔'' غلام دین نے واپس کمرے میں جاتے جاتے پوچھا۔

''مولوی صاحب کی طرف کسی کام سے گئے ہیں۔ شاید انہیں دیر ہو جائے آپ کو اور چاچی کو کھانا دے دوں۔''

''ہاں...... دے ہی دو تمہاری چاچی تو سوتی جا رہی ہے۔ ابھی خراٹے لینے لگے گی۔''

''جی۔ میں ابھی سالن گرم کر کے روٹیاں پکاتی ہوں۔ کیا خبر اتنے میں وہ بھی آ جائیں۔''

وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی تو غلام دین بھی کمرے میں چلا گیا۔ محبت و شفقت سے اسے دیکھتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اللہ نے اسے تحسین جیسی اچھی بہو عطا کی ہے۔

☆☆☆

''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں غلام رسول، اللہ ان شاء اللہ بہتر کرے گا۔ آپ نے اپنی سی کوشش تو کر ڈالی ہے نا۔ جلوس بھی نکالے۔ احتجاج کیا۔ حکومت کو بھی اپنے موقف سے آگاہ کیا اور......''

''نہیں کی...... اپنی سی کوشش نہیں کی تاسین فاطمہ۔'' غلام رسول نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''کیا ہمیں صرف اتنا ہی کرنا چاہیے تھا۔ بولو کیا صرف اتنا ہی کرنا چاہیے تھا۔ چند دن جلوس نکال کر حکومت کو چھٹیاں لکھ کر کیا ہمارا فرض ادا ہو گیا۔ کیا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا...... ان کے امتی ہونے کا حق ادا کر دیا تاسین فاطمہ۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کرسی کا رخ اس کی طرف کیا تھا۔

تحسین نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اس نے پہلے تو کبھی اتنی بلند آواز میں بات نہیں کی تھی۔ جب وہ کم عمر لڑکا تھا تب، جب بڑا ہوا تب اور اب شادی کے بعد بھی اس نے کبھی بلند آواز سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ بہت نرمی اور آہستگی سے ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا۔ تحسین بہت دیر سے دیکھ رہی تھی کہ وہ صرف کتاب کھولے بیٹھا ہے۔ قلم میز پر کھلا پڑا ہے اور کھلے رجسٹر کے ورق یوں ہی سادہ ہیں۔ جامعہ سے آ کر وہ کچھ دیر پڑھتا اور نوٹس تیار کرتا تھا۔ شاہ جی کا یہ گھر مع سامان کے ہی ملا تھا اور یہ رائٹنگ ٹیبل اور کرسی بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ تحسین اب بھی سر اٹھائے متوحش سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سجدوں کے نشان سے مزین پیشانی پر شکنیں تھیں اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ ایسی سرخی جس سے درد جھلکتا تھا۔

''ہم یہ کیسے مسلمان ہیں تاسین فاطمہ۔'' اس کی آواز اب گری گئی تھی۔ ''کمزور عقیدے اور کمزور ایمان کے۔ ہم اس شخص کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں برداشت کر رہے ہیں جو......'' اور اس نے سر جھکا لیا تھا۔ آنسوؤں نے جیسے اس کا حلق سی دیا تھا۔

وہ پچھلے کئی ماہ سے ایسے ہی پریشان تھا اس رات سے جب مولوی صاحب نے اس سمیت محلے کے چند معزز لوگوں کو بلایا تھا کہ بند گلی کے باہر جو نئی کوٹھیاں بنی تھیں ان میں سے ہی ایک کوٹھی میں پرویز نامی ایک شخص چند ماہ پہلے آ کر ٹھہرا تھا۔ پتا نہیں یہ کوٹھی اس کی ذاتی تھی یا اس نے کرائے پر لی تھی۔ وہ کون تھا، کیا کرتا تھا کہاں سے آیا تھا اس کے متعلق تو کچھ علم نہ تھا۔ لیکن پتا چلا تھا کہ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ پہلے تو سنی سنائی بات تھی اب وہ برملا ایسا کرتا پھر رہا تھا۔ خود مولوی صاحب نے اسے اپنے ناپاک لبوں سے گستاخانہ لفظ نکالتے سنا تھا۔ کچھ خاص حلقوں میں وہ خود کو اس عہد کا نبی بھی کہتا تھا۔ اور سب کو بلانے کا مقصد تھا کہ اس شخص کو روکا جائے۔ چنانچہ سب کی رائے اور باہمی مشورے سے مولوی

صاحب کے ساتھ چند اور لوگ اس کی رہائش گاہ پر گئے تھے اور اسے تنبیہ کی تھی لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اب تو کسی نہ کسی گلی میں آ کر لوگوں کو اکٹھا کر کے کسی موضوع پر بولنا شروع کر دیتا اور اس گفتگو میں گستاخی بھی کر جاتا تھا۔ جلوس بھی نکالا گیا تھا۔ حکومت کے ذمہ دار بندوں سے بھی رجوع کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی قدم ابھی تک نہیں اٹھایا گیا تھا اور غلام رسول بہت پریشان تھا۔ غلام رسول کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ ہر وقت بے چین اور مضطرب رہتا۔ راتوں کو اٹھ کر کبھی صحن میں ٹہلنے لگتا کبھی اس سے کہتا۔

''تاسین فاطمہ تم نے غازی علم دین کے متعلق سنا ہے۔''

''ہاں ابھی چند دن پہلے ہی حاجرہ آپا نے بتایا ہے۔''

''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت پر جان لٹانے والے صرف یہ اکیلے علم دین ہی نہیں تھے تاسین فاطمہ۔ اس قافلے میں اور بھی بہت سے سچے عاشق ہیں۔ کاش میں بھی اس قافلے کا ایک فرد ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت کے لیے جان قربان کر دینے والا لیکن میں...... میں تو......'' وہ تاسین کی طرف دیکھتا اور اس کی آنکھوں سے کرب چھلکتا۔ گہرا...... دل کو چھیلتا ہوا کرب۔

''غلام رسول......'' تحسین گھبرا جاتی پریشان ہو جاتی اور وہ اٹھ کر پھر بے چینی سے ٹہلنے لگتا ادھر سے ادھر۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ پھر اس کے پاس بیٹھا بتا رہا ہوتا۔

''پتا ہے تاسین فاطمہ! کل مجھے مولوی صاحب نے بتایا۔ کہ ان کے والد نے انہیں بتایا تھا کہ سین کمپنی کلکتہ کے مالک نے ایک کتاب چھپوائی تھی ''سند جیون'' اس میں اس نے حضرت عائشہؓ کے متعلق کچھ لکھا تھا جس پر مسلمانوں میں خاصا غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ لاہور سے امیر احمد اور عبداللہ نامی اشخاص حرمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہونے کے لیے آئے تھے۔ رات سیٹھ موسیٰ کے سفارت خانے میں رہے۔ صبح گل شاہی کی دکان پر بیٹھے رہے۔ وہاں سے کالج اسٹریٹ کا پتا پوچھا کہ ادھر کام ہے...... اور پبلشر، کاتب اور مصنف تینوں کو قتل کر دیا برچھی ماری تھی۔ آدھے گھنٹے ادھر ادھر پھرتے رہے تھے پھر دیکھنے گئے کہ کہیں زندہ نہ ہوں لیکن پکڑے گئے ولائیت تک مقدمہ لڑا گیا...... پتا ہے تاسین فاطمہ۔''

وہ بے حد مودب سا بیٹھا عقیدت سے بولتا رہتا اور وہ متوحش سی اسے دیکھتی رہتی۔ غلام رسول کے ذہن میں کیا ہے وہ کیا سوچتا ہے۔

مولوی صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کے والد ان دنوں کلکتہ میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ سنٹرل جیل کلکتہ میں انہیں ملنے گئے تھے وہاں امیر احمد کی والدہ اور بہن اور عبداللہ کے والد اور کچھ دوسرے عزیز آئے ہوئے تھے ملنے۔ انہوں نے امیر احمد سے کہا کہ وہ رہائی کی کوشش کر رہے ہیں تو امیر احمد مسکرائے تھے۔ ہم رہا نہیں ہوں گے۔ رات خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے فرما رہے تھے۔ ہم منتظر ہیں جلدی آؤ۔ مولوی صاحب کے والد بتاتے تھے کہ اس روز عصر کی نماز امیر احمد نے پڑھائی تھی اور وہاں موجود ان کے ملاقاتیوں نے اور مسلمان قیدیوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ دو دن بعد فجر کے وقت انہیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ فجر سے پہلے ہی مسلمانوں کے محلوں میں مشین گنیں لگا دی گئی تھیں۔ کہتے ہیں چالیس ہزار آدمی تھے ان کے جنازے میں۔'' غلام رسول کی آنکھوں میں جیسے چراغ سے جل اٹھتے تھے۔

''خوش نصیب لوگ۔''

غلام رسول کی آواز بھرا جاتی اور وہ پھر بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا اور وہ پریشان سی اسے دیکھتی رہتی۔ یوں لگتا تھا جیسے بھوک پیاس بھی ختم ہو گئی ہو جامعہ سے جلدی لوٹ آتا اور پھر وہی بے چینی وہی اضطراب۔

''پتا ہے ایک شخص تھا شردھنند اس نے اسلام کے خلاف کتاب لکھی تھی تو غازی عبدالرشید کا بل سے

آیا اور دلی میں اسے مار دیا تھا پھر وہ آریاؤں کا بڑا لیڈر ریلیکھ رام جس نے......"

وہ تقریباً ہر روز ہی ان باتوں کو دہراتا تھا۔ اسے ان سب افراد کے متعلق علم تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو سزا دے کر سرخ رو ہوئے تھے۔

"بولو نا تاسین فاطمہ! ہم کیسے مسلمان ہیں۔ کیا ہم نے بحیثیت مسلمان اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔"

تحسین چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تپش تھی اور چہرا کسی انجانی حدت سے جلتا تھا۔

"میرے اندر بھانبڑ جلتے ہیں اور میرا دل چولھے پر رکھی ہانڈی کی طرح ابلتا ہے تاسین فاطمہ۔ میں غلام رسول اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دعوے دار ہوں۔ لیکن یہ کیسی محبت ہے میری کھوکھلی، خالی خولی لفاظی۔ وہ شخص دو گلیاں چھوڑ کر اپنے گھر میں بیٹھا اپنی ناپاک زبان سے فضول گوئی کرتا ہے اور میں کچھ نہیں کر پاتا۔ بتاؤ نا تاسین فاطمہ...... کیا کروں میں میرا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہے کسی پل چین نہیں ہے مجھے۔"

وہ یکدم ہی اٹھ کر باہر چلا گیا تھا وہ کچھ دیر تو یونہی مضطرب سی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔ باہر کوئی نہیں تھا اور صحن کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ وہ بے چین سی ہو کر صالحہ چچی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"یہ غلام رسول کہاں گیا ہے تاسین، ابھی عشاء کی نماز میں تو وقت ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں چاچی۔ بتایا نہیں۔" اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ "پتا نہیں آج کل کیا ہو گیا ہے انہیں۔ بے چین اور مضطرب سے رہتے ہیں اور پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ جامعہ سے بھی جلدی چھٹی کر کے آ جاتے ہیں۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"جھلی نہ ہو تو۔" صالحہ چاچی نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ "مرد کے ہزاروں بکھیڑے ہوتے ہیں۔ کوئی پریشانی ہو گی آتا ہے تو پوچھتی ہوں۔"

"اوئے۔ وہ اکیلا ہی پریشان نہیں ہے غلام رسول کی ماں...... سارے گلی والے آس پاس کے سب لوگ پریشان ہیں۔" غلام دین کمرے میں آیا تھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے چاچا کہ کہیں غلام رسول......" اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا تھا۔

"کیا خبر تاسین...... یہ سعادت کس کے نصیب میں ہے۔ یہاں کئی سر پھرے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ شہر بھر میں غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ حاجی صاحب کہہ رہے تھے کہ کل معززین کا ایک اور وفد اسلام آباد جا رہا ہے۔" غلام دین چارپائی پر لیٹ گیا۔

"اذان ہو تو مجھے بتانا تاسین۔ نماز مسجد میں ہی پڑھوں گا۔ حاجی صاحب کہتے ہیں کہ مسجد کی نماز گھر کی نماز سے افضل ہے اور اگر کوئی عذر نہ ہو تو مسجد میں ہی نماز پڑھا کریں۔"

"جی چاچا۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ "یہ سعادت اگر غلام رسول کو مل گئی تو......" اور اس تو کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا نہیں۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ اگر غلام رسول اس کے پاس نہ ہوا تو زندگی پھر پہلے جیسی بے رنگ اور بے رونق ہو جائے گی۔ ریتیلے صحراؤں جیسی، بنجر زمینوں جیسی۔ وہ بے چینی سے اس طرح کمرے میں چکر لگانے لگی جیسے غلام رسول لگاتا تھا۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا تھا اور دماغ کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔ تب ہی مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوئی تو اس نے کمرے سے نکل کر غلام دین کو اذان کا بتایا اور خود وضو کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ نماز پڑھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گرنے لگے۔

"یا اللہ۔ غلام رسول کے دل کو سکون عطا فرما۔ اس کی اس بے چینی اور اضطراب کو دور فرما میرے مولا۔"

غلام رسول آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آیا

تھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ دعا مانگ کر وہ اٹھی جاء نماز تہہ کر کے رکھی اور غلام رسول سے پوچھا۔

"آپ کے لیے دودھ لے آؤں آپ نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔" ان کے ہاں عموماً مغرب کے بعد کھانا کھا لیا جاتا تھا۔ غلام رسول نے نفی میں سر ہلایا اور اسے دیکھنے لگا اور کتنی ہی دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا۔ وہ گھبرا سی گئی۔

"کیا دیکھتے ہیں آپ۔"

"تاسین فاطمہ......" وہ بولا تو اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور اس نے یک دم تحسین کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ "مجھے اس وعدے سے آزاد کر دو تاسین فاطمہ جو میں نے تم سے کیا تھا۔"

"کون سا وعدہ۔" وہ حیران ہوئی۔

"میں نے وعدہ کیا تھا نا کہ میں تمہاری طرف آنے والی گرم ہوا کو بھی روک لوں گا۔ میں تمہارے سامنے خوشیوں کے ڈھیر لگا دوں گا۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے آخری سانسوں تک۔ میں تمہیں اب بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ہم دونوں زندگی کی خوب صورتیوں کو ایک ساتھ محسوس کریں گے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو......تو مجھے اس وعدے سے آزاد کر دو تاسین فاطمہ۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ "یہ وعدہ مجھے زنجیر کرتا ہے۔ روکتا ہے اور میرا من کرلاتا ہے ملامت کرتا ہے۔ میرے وجود پر لگنے والے پتھر میرے اندر سے ہی آتے ہیں۔ میں اگر جیتا رہا تو زندگی میری لیے لعنت ہوگی۔"

اس کی خوب صورت آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی تو اس نے آٹھویں کا امتحان دینا تھا۔ ابھی دس جماعتیں پوری کرنا تھیں پھر دین کی تعلیم کے لیے جامعہ میں جانا تھا۔ غلام رسول کیا سوچتا تھا کیا چاہتا تھا وہ سمجھ رہی تھی اور غلام رسول کے بغیر وہ اکیلی۔ اس کے پاس غلام رسول تھا تو زندگی اس کے لیے خوب صورت ہو گئی تھی غلام رسول نہیں ہوگا تو......تو......"

"میں کیا کروں تاسین فاطمہ! بتاؤ میں کیا کروں۔"

تحسین نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کے سجدوں کی امین اس کی کشادہ پیشانی، اس کی روشن آنکھیں جن سے جو کرب جھلکتا تھا وہ دل چیرتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہتے تھے اور اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے اس کی ڈاڑھی کو بھگوتے تھے۔ تحسین کے آنسو بھی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ غلام رسول کے ہاتھوں پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی۔

"میں نے آپ کو ہر اس وعدے سے آزاد کیا جو آپ نے مجھ سے کیے تھے۔"

"تاسین......تاسین فاطمہ......" غلام رسول کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے تھے اس نے اس کے ہاتھوں کو چوما آنکھوں سے لگایا۔ "مجھے معاف کر دینا تاسین۔"

"میں نے معاف کیا۔ میں نے اپنا ہر حق معاف کیا۔ آپ کا دل جو کہتا ہے آپ وہ کریں۔ آپ اپنا فرض نبھائیں غلام رسول۔"

یہ سب اس کے اندر سے خود بخود نکلا تھا کوئی غیبی طاقت تھی جو اس سے یہ کہلوا رہی تھی۔ وہ یکدم پرسکون ہو گئی تھی چند لمحے پہلے کا اضطراب اور بے چینی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے غلام رسول کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں اب تشکر کے رنگ کھلے تھے۔ جیسے وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہو۔ پھر یکدم اس نے تاسین کے ہاتھ چھوڑ دیے جو ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور کھڑا ہو گیا اب اس کے ہاتھ اس کے دونوں کندھوں پر تھے وہ بالکل اس کے مقابل کھڑا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں کہ تحسین کو لگا جیسے وہ ان آنکھوں کی حدت سے پگھل کر پانی ہو جائے گی۔

"تاسین فاطمہ۔" اس کی آواز سرگوشی کی طرح تھی۔ "میں نے تم سے محبت نہیں کی عشق کیا ہے۔ شاید تب سے جب تمہاری اماں کے بعد تمہارے ابا تمہیں اماں کے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ اماں تمہیں کندھے سے لگاتیں۔ گود میں لٹا کر لوری سناتیں لیکن تم روئے چلی

جاتیں اور میں اماں کے گھٹنے سے لگا بیٹھا دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگتا رہتا کہ وہ تمہاری اماں کو واپس بھیج دے۔ بھلے مجھے بدلے میں لے لے۔"

تحسین خاموش کھڑی سنتی رہی اور اس کے اندر جیسے برسات ہوتی تھی۔ سب جل تھل ہو رہا تھا۔

"شاید اس عشق کا بیج تب ہی میرے دل کی زمین میں پڑ گیا تھا پہلے یہ صرف ایک بیج تھا پھر اس سے ننھی سی کونپل پھوٹی اور یہ نمو پاتا رہا یہاں تک کہ تناور درخت بن گیا۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اتنا تناور کہ جب میں نے اس سے دامن چھڑانے کا سوچا تو اس کی جڑیں جو گہرائی میں اتر کر اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ میرا وجود ہل کر رہ گیا۔ لیکن تاسین فاطمہ ایک عشق اور بھی ہوتا ہے...... مخلوق کا اپنے خالق سے اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق...... اور اس عشق کے تقاضے اور ہیں۔ اس عشق کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بعض اوقات جان سے بھی جانا پڑتا ہے۔ تم نے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ میرے راستے سہل کر دیے تمہارا بہت شکریہ۔"

وہ ذرا سا جھکا اور اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔ تحسین سرشاری ساکت کھڑی تھی۔ برسوں کی تشنگی مٹ گئی تھی۔ وہ جو اندر کہیں گہرائی میں تھوڑے بہت زندگی سے گلے اور شکوے باقی رہ گئے تھے اور تھوڑی سی تشنگی تھی وہ سب ختم ہو گئی تھی جیسے کسی نے پیاسی زمین کو سیراب کر ڈالا ہو اور جیسے ہر گلے، ہر شکوے کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا ہو۔ وہ سرشاری کھڑی تھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس نے اس کے کندھوں سے ہاتھ اٹھایا اور کب وہ بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا وہ تو بس سرشاری کھڑی تھی اور کانوں میں حاجرہ آپا کی آواز گونجی تھی "تمہارے پاس غلام رسول ہے نا" اور اس کے لب بے آواز ہلتے تھے۔

حبیبی...... حبیبی یا نور العین۔

☆☆☆

آج سورج کئی دنوں بعد نظر آیا تھا لیکن اس کی تپش جسموں میں چبھتی نہیں تھی بلکہ سردی سے سکڑے جسموں میں ہلکی ہلکی حدت پیدا کرتی تھی۔ نیل گروں کی گلی میں خلاف معمول خاموشی تھی۔ مہنگا، ہادی، گلو بادشاہ اور کئی دوسرے چوک میں کھڑے دھوپ سینکتے تھے اور سورج کی تپش جسموں کو گرمی دیتی تھی۔ صالحہ چاچی لکڑی کے تخت پر بیٹھی ننھے ننھے کرتے سیتی تھیں۔ دھوپ برآمدے میں بچھے تخت پر بھی اپنی کرنیں بچھاتی تھی۔

تحسین نے چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھا۔

"یہ غلام رسول چائے پیے بغیر ہی چلا گیا۔"

"کہہ رہے تھے ایک چکر باہر کا لگا کر آتا ہوں۔" تحسین نے ناشتے کے خالی برتن اکٹھے کر کے نل کے نیچے رکھے۔

"کیا آج بھی اپنے کام پر نہیں جانا اس نے۔" صالحہ نے سوئی میں دھاگا ڈالا۔

"نہیں، جامعہ سے چھٹی لے رکھی ہے انہوں نے۔"

تب ہی دروازہ کھول کر غلام رسول اندر داخل ہوا اور تخت پر صالحہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ابا چلے گئے دکان پر۔"

"نہیں۔" صالحہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی، شاید ٹھنڈ لگ گئی ہے۔"

"ایک کرب سا اس کی آنکھوں میں ہلکورے لینے لگا۔"

"تاسین میری اور ابا کی چائے اندر کمرے میں ہی دے دو۔" بات کر کے وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

تحسین چائے لے کر غلام دین کے کمرے میں آئی تھی وہ موڑھے پر بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میرے اندر جلتی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی ابا اور جامعہ جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ گلی میں، جامعہ میں ہر جگہ لوگوں کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی ہے۔ گھما پھرا کر وہی ایک بات...... میرا دل جلتا ہے ابا۔ وہ کیوں دہراتے ہیں یہ بات۔ بات کرنے والے کا منہ بند کیوں نہیں کر دیتے اور وہ نہ جانے کہاں جا چھپا ہے کن کونوں کھدروں میں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں اور وہ ملتا ہی نہیں۔"

تحسین نے لکڑی کی چھوٹی سی میز پر چائے رکھی۔ تب ہی صالحہ ہاتھ میں ننھے ننھے کرتے اٹھائے اندر آئی۔

''یہ دیکھو غلام رسول میں نے تمہارے بچے کے لیے ہاتھوں سے سیے ہیں۔'' غلام رسول نے کرتا ہاتھ میں لے کر دیکھا اور صالحہ کے خوشی سے چمکتے چہرے پر نظر ڈالی۔

''یہ تو لڑکوں والا ہے۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ میرا پوتا آئے گا اور اگر پوتی بھی ہوئی تو پہن لے گی۔ لڑکیاں بھی تو پہنتی ہیں ایسے کرتے۔'' صالحہ کی آواز میں چہکار تھی۔

غلام رسول ہنس دیا۔ کتنے دنوں بعد وہ اس طرح ہنسا تھا اور پھر اس نے گہری نظروں سے تحسین کی طرف دیکھا تو اس کے رخساروں پر جیسے شفق اتر آئی اور وہ شرما کر تیزی سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد غلام رسول بھی دو گھونٹ چائے پی کر کمرے میں آ گیا تھا وہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور اس کے رخساروں پر اب بھی شفق کھیلتی تھی۔ پلکیں شرم سے بوجھل ہو کر جھک گئی تھیں اور ہولے ہولے لرزتی تھیں۔ غلام رسول اپنی لکھنے والی میز سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور پلکوں کی لرزش کو بہت دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

''تاسین فاطمہ ادھر دیکھو۔''

اور تاسین نے جھکی ہوئی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ اور پھر جیسے غلام رسول کے چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔ آج اس کے چہرے پر انوکھا سا جمال تھا اور آنکھوں سے روشنیاں نکلتی تھیں اور کمرے میں اس کے آنے سے انوکھی سی مہک پھیل گئی تھی۔ یہ انوکھی سی مہک باہر برآمدے میں بھی تھی جب وہ آیا تھا اور پھر غلام دین چاچا اور صالحہ چاچی کے کمرے میں بھی یہ مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی انوکھی سی مہک جو ناگوار نہیں گزرتی تھی بلکہ دل و دماغ کو پرسکون کرتی تھی۔ کیا غلام رسول نے آج کوئی نئی خوشبو لگائی ہے تحسین نے سوچا۔ حالانکہ عموماً وہ جمعہ کے دن خوشبو لگاتا تھا اور آج جمعرات تھی۔

''تاسین فاطمہ! آج نماز ظہر کے بعد چاروں گلیوں کے لوگ احتجاج کے لیے نکلیں گے کہ ابھی تک ہمارے احتجاجی مراسلوں کے باوجود کچھ نہیں کیا گیا۔ ابھی مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر سارا لائحہ عمل طے کریں گے۔ ہمارا احتجاج پرامن ہوگا۔ تاسین فاطمہ! حاجی صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ ہمیں ارباب اختیار کو احساس دلانا ہے کہ ایسے افراد کے خلاف فوراً کارروائی کی جائے۔ ورنہ کوئی سرپھرا کوئی دیوانہ......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اندر کہیں کوئی آگ سی بھڑکی تھی۔ شعلہ سا لپکا تھا۔ کاش یہ دیوانگی میرا مقدر ہوتی دل نے حسرت کی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا پھر یکایک مڑا۔

''تاسین! ہمارا بچہ......'' وہ مسکرایا۔ ''وہ لڑکا ہو یا لڑکی اس کے دل میں صرف دنیا کی حب نہ پیدا کرنا بلکہ اسے خالق اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے بھی روشناس کرانا۔ اسے دین کے متعلق بھی بتانا۔''

وہ کہنا چاہتی تھی میں کیوں...... تم ہو گے نا غلام رسول میرے ساتھ، خود ہی اپنے بچے کو سب بتانا۔ میں تو ایک کم علم اور ان پڑھ عورت ہوں۔ لیکن وہ اپنی بات کہہ کے رکا نہیں تھا اور تحسین فاطمہ کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔

پھر اس نے گھر کی صفائی بھی کی، کپڑے بھی دھوئے، صالحہ چاچی کے سر میں تیل لگا کر کنگھی بھی کی۔ کھانا بھی تیار کیا، لیکن اس کا دل یوں ہی ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ یہاں تک کہ مسجد سے ظہر کی اذان بلند ہوئی۔ وہ ہمیشہ ہی اذان سنتے ہوئے کھو جاتی تھی لیکن آج اسے مؤذن کی آواز میں ہر دن سے زیادہ سوز محسوس ہو رہا تھا۔ اذان کے الفاظ ساتھ ساتھ دہراتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ اس کے اپنے دل کی کیفیت ایسی ہے کہ اسے ہر دن سے زیادہ سوز محسوس ہو رہا ہے۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھنے کے بعد بھی نجانے کتنی ہی دیر تک جانماز پر ہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ صالحہ نے اسے آواز دی۔

"تحسین! غلام رسول کہاں گیا ہے کچھ بتایا تھا۔"
"مولوی صاحب کی طرف ہی گئے تھے۔ جماعت تو ہوگئی ہے آتے ہی ہوں گے۔"
لیکن کتنی ہی دیر گزر گئی غلام رسول واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے چاچی اور غلام دین کو کھانا دے دیا تھا۔ باہر گلی سے ہلکے شور کی آوازیں آتی تھیں جیسے بہت سارے لوگ اکٹھے ہورہے ہیں۔ غلام رسول نے بتایا تو تھا کہ چاروں گلیوں کے لوگ آج پھر احتجاج کریں گے ڈی۔سی کے آفس تک جائیں گے اور درخواست کریں گے کہ اس ملعون کو گرفتار کیا جائے اور سزا دی جائے۔
غلام دین نے کھانا کھا کر تحسین سے پوچھا۔
"یہ شور کیسا ہے باہر۔" تحسین کے بتانے پر وہ اٹھ کر دروازے تک آیا تھا اور دروازہ کھول کر دیکھنے لگا تھا۔ چاروں گلیوں کے لوگ چوک میں جمع ہورہے تھے۔ مولوی صاحب اور غلام رسول نے باری باری مختصر خطاب کیا تھا۔ کھلے دروازے سے آتی غلام رسول کی آواز صحن میں کھڑی تحسین فاطمہ کے کانوں میں آتی تھی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔ لیکن اس کی آواز کا سوز اور اس میں آنسوؤں کی نمی وہ محسوس کرتی تھی۔ اور اس کا اندر بھی بھیگتا جاتا تھا اور وہ غلام رسول کے لیے بے آواز دعا کرتی تھی۔ غلام دین اس وقت تک دروازے پر کھڑا رہا جب تک سب لوگ گلی سے نکل نہ گئے لیکن نعرہ رسالت اور نعرہ تکبیر کی آوازیں اب بھی ہوا کے دوش پر تیرتی تحسین کے کانوں میں آتی تھیں۔ غلام دین ہولے ہولے چلتا ہوا برآمدے میں تخت پر آکر بیٹھ گیا تھا۔
"میں آج بیمار نہ ہوتا تو میں بھی اس جلوس کے ساتھ جاتا، لیکن یہ سعادت میرے نصیب میں نہیں تھی۔ آج ٹھنڈ لگ کر تپ نہ چڑھتا تو میں بھی اس چڑیا کی طرح جو چونچ میں پانی کا قطرہ بھر کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی آگ بجھانے جاتی تھی اس کار خیر میں شامل ہو کر پانی کے قطرے جتنی ہی سہی اس محبت اس عشق کا حصہ دار بن جاتا جس عشق کی تپش سے ان کے سینے جلتے ہیں۔" غلام دین جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا۔

☆☆☆

جلوس غلام رسول اور مولوی صاحب کی قیادت میں گلیوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ ہر قدم پر مزید لوگ اس میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبے نعتیں پڑھتے نعرے لگاتے لوگوں کو ڈی۔سی آفس سے کافی دور ہی روک دیا گیا تھا پولیس کے سپاہی کندھے سے کندھا جوڑے ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھائے دیوار بنائے کھڑے تھے۔
"ہمارا مقصد توڑ پھوڑ یا ہنگامہ کرنا نہیں ہے۔"
غلام رسول آگے بڑھا تھا اور پولیس والوں میں سے بھی ایک شخص آگے آیا تھا شاید حوالدار تھا۔ ساری بات بتا کر غلام رسول نے ڈی۔سی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔
"ڈی۔سی صاحب بہت مصروف ہیں۔ ملاقات نہیں ہوسکتی۔ آپ لوگوں کو جو کچھ کہنا ہے ایک درخواست لکھ کر دے دیں۔" حوالدار نے دائیں ہاتھ میں پکڑی اسٹک (چھڑی) کو گھمایا اور بائیں ہاتھ سے مونچھوں کو بل دیا۔
"بہت بار درخواستیں ارسال کیں حوالدار صاحب۔ اب ڈی۔سی صاحب سے روبرو مل کر بات کرنا چاہتے ہیں۔" غلام رسول کا لہجہ نرم تھا لیکن حوالدار اپنی وردی کے زعم میں تھا۔
"کہہ دیا نا ڈی۔سی صاحب نہیں مل سکتے۔ بہتر ہے کہ تم ان سب کو لے کر واپس چلے جاؤ۔ میں شہر کا ڈسپلن خراب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔"
اس کی بلند آواز جلوس میں موجود اکثر لوگوں نے سنی تھی اور جواب میں نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت کی صدائیں بلند ہوئی تھیں۔ حوالدار کی مونچھیں پھڑکنے لگی تھیں۔ اور اس نے غلام رسول کے بازو پر چھڑی ماری تھی۔
"انہیں واپس لے جاؤ ورنہ ہم منتشر کرنا جانتے ہیں۔"

''ہم منتشر ہوجائیں گے بس ہمیں اپنی گزارشات پیش کرنی ہیں ڈی ۔ سی صاحب کو۔'' غلام رسول کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

''ہم آپ الگ نہیں ہیں صاحب۔ ہمارا دین ہمارا مذہب ایک ہے۔ ہمارا درد مشترک ہے۔ ہماری تکلیف ایک ہے۔ ہمیں......''

''بس...... زیادہ فلسفہ نہ بگھار میاں، اور جو بھی گزارشات ہیں تحریری طور پر دے جا۔ اور یہ جو جلوس لے کر آیا ہے نا اس کو چلتا کر حوالدار اب غصے میں نظر آرہا تھا۔''

''ہم قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہتے ورنہ ہمارے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ اس ملحد کو سبق سکھا دیتے۔''

اس کے اندر رہ رہ کر شعلے بھڑکتے تھے اور وہ صبر کا دامن تھامے کھڑا تھا اور حاجی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

''صبر کر، حوصلہ کر۔ ضرور شنوائی ہوگی۔ اب انگریزوں کا دور تو نہیں ہے اپنا ملک ہے۔ تو ہمیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔''

حوالدار کی چھڑی پھر اس کے بازو پر لگی تھی۔

''ورنہ کیا سبق سکھائے گا۔ بول......''

''عشق کے ہاتھ سے جب فرزانگی کا دامن چھوٹ جائے تو دیوانگی کچھ بھی کروا دیتی ہے صاحب ہمیں ڈی۔ سی صاحب سے ملوا دیں۔''

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ہجوم میں سے پھر کسی نے نعرہ تکبیر بلند کیا تھا۔ فضا ایک بار پھر اللہ اکبر اور نعرۂ رسالت کی آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔ کچھ سر پھرے بلند آواز میں نعتیں پڑھنے لگے تھے۔ غلام رسول نے ان کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ بلند کیے تھے۔

''بھائیوں فکر نہ کرو آج ہم ڈی ۔ سی صاحب سے مل کر ہی جائیں گے اور اس فتنے کا سد باب......''

ایک چھوٹا سا پتھر نہ جانے کدھر سے آیا تھا اور دیوار بنائے کھڑے پولیس والوں میں سے کسی کے سر پر لگا تھا۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر کچھ شرپسند بھی عام لوگوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ پتھر کسی شرپسند نے پھینکا تھا یا جلوس کے افراد میں سے کسی نے لیکن پولیس کے سپاہی اپنے ساتھی کے سر سے خون بہتا دیکھ کر لاٹھیاں لے کر جلوس پر چڑھ دوڑے تھے۔ غلام رسول جوان کی طرف پیٹھ کیے کھڑا لوگوں سے مخاطب تھا اس کے سر کے پچھلے حصے پر پوری طاقت سے کسی نے لاٹھی ماری تھی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا تو ایک اور لاٹھی اس کے سر پر پڑی تھی۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی زیادہ لوگ ادھر ادھر گلیوں میں منتشر ہو گئے تھے۔ حوالدار چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو لاٹھی چارج سے منع کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے گرتے دیکھا تو تیزی سے اس کے قریب آئے تھے اور اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تھا۔ ہجوم تقریباً منتشر ہو گیا تھا۔ صرف چاروں گلیوں کے کچھ لوگ موجود تھے۔ حوالدار پولیس والوں کو ڈانٹ رہا تھا۔

''گلو، منگے، ہادی جلدی سے کوئی ٹیکسی دیکھو۔''

مولوی صاحب اسے سہارا دے کر چند قدم چلے تھے لیکن پھر وہ ان کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

''مولوی صاحب! گواہ رہنا۔ میں علم دین اور علی احمد کی طرح عشق کی اس منزل تک تو نہیں پہنچ سکا تھا جس پر وہ تھے لیکن میں نے اس راستے پر چلنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ روز محشر میری تڑپ اور سعی کی گواہی دیں گے نا آپ۔'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ مولوی صاحب نے سر ہلایا۔

''نعرۂ رسالت۔'' اس کے آس پاس موجود لوگوں میں سے کسی نے پھر نعرہ لگایا تھا۔

چوٹ دماغ کے ایسے نازک حصے پر لگی تھی کہ سانس رک رک کر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور لبوں پر کلمہ شہادت تھا۔ پھر لب ساکت ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب اس کے پاس بیٹھ گئے تھے اور اس کا سر گود میں رکھا اور اس کی پیشانی جس

سے روشنی سی نکلتی تھی بے اختیار چوم لی۔ پھر کون چارپائی لایا کس نے اسے چارپائی پر لٹایا مولوی صاحب کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتے تھے اتنا پرسکون چہرا اتنی روشن پیشانی۔ وہ پیچھے ہٹے تھے اور نیل گروپ کی گلی کے جوانوں نے چارپائی اٹھائی۔ ادھر ادھر گلیوں محلوں میں چھپے لوگ نکل نکل کر ساتھ شامل ہوتے گئے تھے۔

☆☆☆

تحسین گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ غلام دین اب تخت پر تھک کر لیٹ چکا تھا۔

''چاچا......'' تحسین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ ادھر ہی سو گئے ہیں۔ کمرے میں آرام سے چل کر لیٹیں۔''

''غلام رسول کا انتظار کر رہا تھا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تب ہی ساکت گلی نعرہ تکبیر اور نعرہ سالت سے گونج اٹھی۔ اس نے گھبرا کر غلام دین کی طرف دیکھا۔

''یہ شور گلی میں یہ شور کیسا ہے تحسین۔'' صالحہ چاچی بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

''میں دیکھتا ہوں۔''

غلام دین اٹھ کر باہر چلا گیا تو وہ بھی سی تخت پر بیٹھ گئی۔ صالحہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

''وہ لوگ واپس آئے ہوں گے چاچی ڈی۔ سی نے ان کی بات مان لی ہو گی۔''

اس نے صالحہ چاچی کو ہی نہیں خود کو بھی تسلی دی تھی کہ دل سینے کی چاردیواری میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا۔ پتا نہیں کیوں...... وہ صالحہ کے بازو پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی کہ دروازہ کھلا پہلے گلو بادشاہ نے اندر قدم رکھا آنسو بہاتا۔ پیچھے کون تھا۔ تحسین اٹھ کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔

گلی کے چند لوگ چارپائی اٹھائے اندر آ گئے تھے۔ چارپائی کے ساتھ ساتھ غلام دین چلتا تھا اس کا سر اٹھا ہوا تھا اور آنکھ سے آنسو بہتے تھے۔ چارپائی صحن کے بیچوں بیچ رکھ کر وہ لوگ سر جھکائے چلے گئے تھے۔ بنا کچھ پوچھے تحسین فاطمہ کو ادراک ہو گیا تھا وہ دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے صحن میں آ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ گلی والوں نے خود ہی خود سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ تحسین نے دیکھا اس کے لب نیم وا تھے جیسے مسکراتا ہو اور پیشانی سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشقوں کے چہرے ایسے ہی روشن ہوتے ہیں۔ تحسین سوچتی تھی اور اس کے لب ہولے ہولے ہلتے تھے۔

''میں نے آپ کو ہر وعدے سے آزاد کیا۔ غلام رسول سارے حقوق معاف کیے۔''

اور اس کی بھیگی نظریں بار بار چارپائی کی پٹی پر بیٹھی صالحہ چاچی کی طرف اٹھتی تھیں جیسے التجا کرتی ہوں آپ بھی اپنے حقوق معاف کر دیں چاچی۔ دودھ بخش دیں کہ اس کی منزل اور تھی وہ ہماری راہوں کا مسافر نہ تھا۔ عورتیں صالحہ چاچی کو سنبھالتی تھیں جو اچانک ہو جانے والے اس حادثے سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

نیل گروں کی گلی سے خبر نکل کر پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پورا شہر نیل گروں کی گلی میں اُمڈ آیا ہو۔ ماڑیوں والے محلے کی چاروں گلیاں بھری ہوئی تھیں۔ باہر سڑک پر بھی ہجوم تھا آس پاس کے دیہاتوں سے بھی لوگ عشاء تک آتے رہے تھے کہ جنازہ عشاء کے بعد اٹھنا تھا۔ ڈی۔ سی صاحب اور انتظامیہ کے کچھ اور لوگ بھی جنازے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ فوری طور پر اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا تھا بلکہ اس کے گھر سے تمام فضول مواد ضبط کر کے تلف کر دیا گیا تھا۔ غلام رسول کی قربانی رائگاں نہیں گئی تھی۔ ڈی۔ سی صاحب نے حاجی صاحب اور دوسرے معززین کو یقین دلایا تھا کہ اس شخص کے خلاف مقدمہ چلا کر آئین کے مطابق اسے سزا دی جائے گی۔ لوگوں کی آمد جاری تھی لیکن عشاء کے بعد جنازہ اٹھا لیا گیا۔ کلمہ شہادت کی بلند آواز سے گلی گونج اٹھی تھی۔

☆☆☆

”اس شہر کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کسی کا نہیں ہوا تھا۔“ اگلی صبح گلو صالحہ چاچی کے پاس سر جھکائے بیٹھا بتا رہا تھا اور اس کے کانوں میں غلام رسول کی آواز آتی تھی۔

”تاسین فاطمہ امیر احمد اور عبداللہ کے جنازے میں چالیس ہزار لوگ تھے۔“

”شاہ صاحب اور شجاع بھائی بھی لاہور سے آ گئے تھے۔ سیدھے قبرستان پہنچے تھے۔ حاجی صاحب نے اطلاع کی تھی انہیں۔ جنازے کے بعد جب سب نے چہرا دیکھا تو ایسا پھول کی طرح کھلا تھا۔“

وہ آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا تھا۔ وہ چپ بیٹھی تھی سائرہ صحن اور برآمدے میں بیٹھی خواتین میں سپارے تقسیم کر رہی تھی۔ عصمت اور راحیلہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے دلاسے دیتی تھیں۔ وہ تینوں ہی اطلاع ملتے ہی آ گئی تھیں۔ طاہر بھی آ گیا تھا اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتارا تھا اور تحسین کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”تحسین! میری بہن...... خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔ زندگی میں کبھی بھی کوئی مشکل آئی تو تمہارا بھائی تمہارے ساتھ کھڑا ہوگا۔ جس دن ابا تمہیں گاؤں سے لے کر آئے میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا آج سے تم پانچ بہنوں کے بھائی ہو اور اسی روز ہی میں نے تمہیں اپنی چھوٹی بہن کا درجہ دے دیا تھا۔ تم ہمیشہ میری چھوٹی بہن رہو گی۔“

خدیجہ کو دو دن بعد کی فلائٹ ملی تھی۔ لیکن وہ بھی چند دنوں کے لیے اس کا دکھ بٹانے آ گئی تھی۔ سائرہ اور خدیجہ تو چار دن رہ کر چلی گئی تھیں سائرہ کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا اور خدیجہ بچے چھوڑ کر آئی تھی۔ لیکن راحیلہ اور عصمت پورا ایک ہفتہ رہی تھیں ہر لمحہ اس کا حوصلہ بڑھاتیں اسے دلاسے دیتیں۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ غلام رسول کی دائمی جدائی کا دکھ منائے یا ان سب کی محبتوں کا شکر ادا کرے۔

☆☆☆

غلام رسول کو رخصت ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے جب غلام دین نے واپس گاؤں [illegible] رہ کیا۔

”ہم تو غلا[illegible] کی وجہ سے یہاں آئے تھے صالحہ۔ اب یہ [illegible] یا گے واپس گاؤں چلتے ہیں۔“

جب غلام رسول کے ارادے کی خبر گلی کے لوگوں کو ملی تو وہاں [illegible] بے چینی سی پھیل گئی۔

”نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں کون ہے ان کا...... غلام رسول نہ ہوا تو کون دیکھ بھال کرے گا۔“

اور نومبر کی اس آخری صبح کو حاجی صاحب اور مولوی صاحب پوری گلی کی طرف سے غلام دین سے بات کرنے آئے تھے اور گلو بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

”غلام دین! ہم نے سنا ہے تم واپس گاؤں جا رہے ہو۔“ حاجی صاحب تخت پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے جبکہ مولوی صاحب غلام دین کے پاس ہی تخت پر بیٹھے ہوئے تھے اور گلو پاس ہی کھڑا تھا۔

”جی حاجی صاحب۔“ غلام دین نے سر جھکا لیا۔

”غلام رسول اس گلی کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ یہاں اجنبی تھا لیکن غلام دین جاتے جاتے وہ ہم سب کو اپنا بنا گیا۔ اور کوئی یوں اپنوں کو چھوڑ کر جاتا ہے بھائی۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔“

حاجی صاحب نے شکوہ کیا اور مولوی صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

”غلام رسول نے ہمیں معتبر کر دیا غلام دین بھائی۔ ہمیں اس گلی کو اس شہر کو معتبر کر دیا۔ ہم سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ فخر سے سر بلند کر کے وہ۔ جس نے اس ملعون کے خلاف آواز اٹھائی اور اسی کوشش میں جان دی۔ وہ ہمارا تھا۔ ہماری گلی کا بھائی تم یہاں سے جا کر ہم سے یہ فخر تو نہ چھینو۔“

”آپ یہاں اکیلے نہیں ہو چاچا۔ اس گلی کا ہر بچہ آپ کا غلام رسول ہے۔ کوئی غلطی ہو تو بے شک دس جوتے لگا لینا چاچا۔ سر نہیں اٹھائیں گے۔ اور آپ یہاں سے جاؤ گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا اماں ابا بھائیوں سب کو چھوڑ کر۔ اکیلا نہیں جانے دوں گا چاچا۔“

گلو کا تو بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ حاجی صاحب مسکرائے۔ اس مان اس محبت و اپنائیت پر غلام دین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اور اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے صالحہ اور تحسین کی آنکھوں سے اس محبت اور اپنائیت پر آنسو بہتے تھے۔

☆☆☆

اپریل کا آغاز تھا اور پورے صحن میں پھولوں کی خوشبو چکراتی پھرتی تھی۔ صالحہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتی تھیں ہلکی ہلکی ہوا چلتی تھی اور سورج کی تپش میں حدت نہیں تھی۔ تحسین پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھڑی پھولوں کو دیکھتی تھی۔ غلام دین کچھ دیر پہلے ہی دکان پر گیا تھا۔ غلام رسول اس کے پاس نہیں تھا لیکن نیل گروں کی گلی کے اس گھر میں تحسین فاطمہ کے لیے زندگی بدصورت نہیں تھی۔ سب ان کے درد کے شریک تھے۔ کب غلام دین کی دوائیاں آتیں کون انہیں تھراپی کے لیے ہسپتال لے کر جاتا۔ کون ان کے کمزور بازو کی مالش کر کے ایکسر سائز کرواتا۔ کون اڈے سے صابر کے بھیجے ہوئے گھڑے اور دوسری چیزیں لاتا تحسین نہیں جانتی تھی لیکن سب کام ہو رہے تھے۔ کب راشن ختم ہوا کب آیا۔ گلو صبح صبح باقاعدگی سے آتا اور دروازے سے ہی آواز لگاتا۔

”کچھ چاہیے چاچا جی...... کوئی سودا منگوانا ہے...... کوئی کام ہو تو......“

زینب بی بی، پروین خالہ ان کی بچیاں۔ آپا جی سب ہی چکر لگاتی رہتی تھیں۔ حاجرہ بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ پہلے تین چار ماہ تک تو وہ خود ہی فارغ ہو کر چکر لگا جاتی تھیں۔ اسے پڑھا بھی جاتیں۔ وہ قرآن کا سبق بھی دہرا لیتی تھی۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی ننھا تھوڑا سا بڑا ہو جائے تو وہ خود ان کے پاس چلی جایا کرے گی۔

”تحسین......“ صالحہ چاچی نے قرآن مجید جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھا۔

”آج ننھے کو حفاظتی ٹیکا لگوانے جانا ہے پاگل۔“

”جی چاچی! آج ہی جانا ہے۔ ناصرہ خالہ کے ساتھ۔“

وہ کیاریوں کے پاس سے ہٹ کر برآمدے میں آ گئی اور تخت کے پاس ہی پڑے ہوئے پنگوڑے میں سوئے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا جو دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ وہ جب پیدا ہوا تو پوری گلی والوں نے خوشی منائی تھی۔ ہادی اور میدا (حمیدا) دھوبی بڑے بازار سے دیسی گھی کے لڈو بنوا کر لائے تھے اور پوری گلی میں تقسیم کیے تھے۔ ناصرہ خالہ نے ہمیشہ کی طرح اس کے میکے کا مان رکھا تھا۔ بچے کا پنگوڑا رضائی، دلائی کمبل نہ جانے کیا کیا لے کر آئی تھیں۔ چاروں بہنوں نے ڈھیروں کپڑے اور کھلونے بھجوائے تھے۔ طاہر بھی جب گھر آیا تو کپڑے اور کھلونے لایا تھا۔ اس نے ننھے کا نام شہزادہ عالمگیر رکھا تھا کہ خدیجہ نے جاتے جاتے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”سنو تحسین! اپنے بیٹے کا نام شہزادہ عالمگیر رکھنا۔“ حاجی صاحب اور زینب بی بی نام سن کر حیران ہوئے تھے۔

”تحسین بیٹی! یہ نام رکھنے کا خیال کیسے آ گیا تمہیں۔“ زینب بی بی اسے گود میں لٹائے شہد چٹا رہی تھیں۔

”بس دل چاہا کہ یہ نام رکھوں، آپ کو برا لگا۔“

وہ خدیجہ کے راز کی امین تھی۔ کیسے کہتی کہ کس کی خواہش تھی یہ۔ گو خدیجہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کی شفاف آنکھوں میں چمکتے پانی نے کچھ راز کہہ دیے تھے۔

”نہیں، ہمیں کیوں برا لگے گا۔“

زینب بی بی کی آنکھوں میں پانی تیرتا تھا اور وہ ننھے کی پیشانی چومتی تھیں۔ وہ ان کے بیٹے کا ہم نام تھا یا ویسے ہی وہ انہیں اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ جب تک ایک بار دیکھ نہ لیتیں چین نہ آتا۔ حاجی صاحب بھی دو چار دن بعد چکر لگاتے تھے۔

”اگر کچھ دیر سے جانا ہے تو میں ذرا آپا جی کے پاس سے ہو آؤں۔“ صالحہ چاچی نے پوچھا۔ تب ہی

دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ بھئی کون ہے۔"

صالحہ اب دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گلو دروازہ کھول کر اندر آیا۔

"السلام علیکم چاچی۔ حاجی صاحب نے ہسپتال جانے کے لیے گاڑی بھیج دی ہے۔ ناصرہ خالہ کہہ رہی ہیں کہ آجائیں۔"

"اچھا۔"

تاسین نے تخت پر پڑی چادر اٹھا کر اچھی طرح اوڑھی اور جھک کر ننھے کو اٹھایا۔

"لائیں تحسین باجی! ہمارے شہزادے کو مجھے دے دیں۔" گلو نے ننھے کو اس سے لے لیا اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے ایک بار پھر چادر درست کی اور صالحہ کی طرف دیکھا۔

"چاچی میں جاؤں۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔ اللہ کے حوالے۔"

وہ مدھم قدموں سے چلتی ہوئی صحن تک آئی۔ کیاریوں میں کھلے پھولوں پر سے ہوتی اس کی نظریں اوپر آسمان کی طرف اٹھیں نکھرا نکھرا سا نیلا آسمان اور کہیں کہیں سفید چمکیلے بادل۔

"زندگی خوب صورت ہے تاسین فاطمہ، یہ نیلا آسمان، بادل، پرندے۔" غلام رسول نے جیسے کہیں قریب سے ہی سرگوشی کی تھی۔

"ہاں زندگی خوب صورت ہے غلام رسول۔ نیل گروں کی گلی کے اس گھر میں زندگی خوب صورت ہے بس تم نہیں ہو۔" اس کی آنکھوں میں پانی سا چمکا۔

وہ باہر نکلتی تو لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے کہ وہ غلام رسول کی بیوہ تھی۔ غلام رسول جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے خلاف آواز اٹھائی احتجاج کیا اور اسی کوشش میں جان بھی قربان کر دی تھی۔ اس شہر سے باہر لوگ شاید اسے جانتے بھی نہ ہوں۔ اخبار میں چھپنے والی وہ چھوٹی سی خبر کسی کو یاد بھی نہیں رہی ہو گی لیکن یہاں اس گلی میں اسے کوئی بھی نہیں بھولا تھا۔

"زندگی خوب صورت ہے۔"

اس نے اوپر آسمان کی طرف سفید چمکتے بادلوں سے نیچے پرندوں کے ایک غول کو دیکھا۔ یہ کتنی خوب صورتی سے پرواز کرتے ہیں۔

"تحسین باجی! آجائیں نا۔" گلو بادشاہ نے دروازے سے جھانک کر آواز دی تو اس نے آسمان سے نگاہ ہٹا کر ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھیں۔ اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرائی۔

گلو بادشاہ، مہنگا، طیب، ہادی، حاجی صاحب اس گلی میں کیسے کیسے خوب صورت اور نایاب لوگ ہیں پھر زندگی خوب صورت کیوں نہ ہو۔ ہاں زندگی تاسین فاطمہ کے لیے خوب صورت ہے۔ ہاں اس گھر اس گلی میں۔ غلام دین، صالحہ چاچی اور وہ فخر سے سر اٹھا کر جیتے تھے کہ غلام رسول ان کا تھا۔ وہ بھیگی پلکوں کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھتی۔ چادر درست کرتی گلو کے پیچھے چلتی تھی اور گلو دونوں ہاتھوں پر ننھے کو اٹھائے گنگناتا تھا۔

حبیبی حبیبی یا نور العین
حبیبی یا نور العین یا ساکن خیالی
(میرے پیارے میرے پیارے میری آنکھوں کے نور اے مجسم تصور)

اور راستے میں کھڑا ہادی اور اس سے باتیں کرتا طیب اور شیدا راستے سے ہٹ کر سر جھکائے ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ اور تاسین فاطمہ اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتی تھی اور اس کا دل...... اس کا اداس اور غم زدہ دل غلام رسول کے ہجر میں غم زدہ گلو کے ساتھ پکارتا تھا۔

حبیبی، حبیبی یا نور العین
عیونک معایا و عیونک کفایة
حبیبی...... حبیبی......
(اور تمہاری آنکھیں میرے لیے کافی ہیں۔)

اور وہ رب کا شکر ادا کرتی گلو کے پیچھے چلتی تھی۔ اس نے شکر کرنا اور صبر کرنا سیکھ لیا تھا۔

☆☆

عذرا فردوس

فضا میں خنکی رچی ہوئی تھی۔ موسم نے ایک دم کروٹ بدلی تھی۔ آج صبح کا آغاز ٹھنڈی ہواؤں سے ہوا تھا۔ سورج بھی مغرب سے پہلے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ جس سے شام میں رات کا سماں بندھ گیا تھا۔ غازی جو ایسے موسم کا لطف اٹھانے لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا تھا۔ اضطرابی کیفیت کے عالم میں وہ گھر پر موجود تھا۔ اس کا دوست ارسل جس سے اس کی دور کی رشتہ داری بھی لگتی تھی، اس سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ غازی کے سامنے کی میز پر ایک چھوٹی سی مخملی ڈبیا میں ہیرے کی جگمگاتی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ یہ انگوٹھی ارسل نے ایک ماہ پہلے ماہ نور کی خوب صورت مخروطی انگلی میں پہنائی تھی۔ انگوٹھی کی ڈبیا کے نیچے سفید لفافہ رکھا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر غازی کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے غازی خود کو ارسل کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے تین روز پہلے آنے والی کال گھوم رہی تھی جو اس نے اپنی منگیتر رخشی سے جھگڑنے کے بعد ریسیو کی تھی۔ رخشی اسے بد دعا دیتے ہوئے گئی تھی کہ خدا کرے تمہارا آج کا دن بہت برا گزرے۔ کیونکہ بقول رخشی کے غازی نے اس کی تعلیمی کارکردگی پر تبصرہ کر کے اور اسے نری جاہل کا خطاب دے کر اس کا دل دکھایا تھا۔ غازی نے اس وقت تو رخشی کی کہی بات کو خاص اہمیت نہیں دی تھی مگر کچھ دیر بعد غازی کو بیٹھے بٹھائے جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے پیش نظر وہ قائل ہو گیا تھا کہ رخشی یتیم، مسکین ہی نہیں مائی ملنگی بھی ہے۔

رخشی جیسے ہی اس کے کمرے سے رخصت ہوئی تھی، اسی وقت ماہ نور کی کال آئی۔ اس کی اور ارسل کی جوڑی کو دیکھ کر کبھی کبھی غازی کو احساس کمتری محسوس ہوتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنی منگیتر رخشی کا موازنہ ماہ نور سے کرتا تھا۔

ماہ نور حوروں جیسے حسن کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ امریکن نیشنلٹی ہولڈر تھی۔ اس کا انداز گفتگو متاثر کن اور شخصیت میں رکھ رکھاؤ تھا۔ جبکہ رخشندہ عرف رخشی جس سے منگنی غازی نے ابا کے دباؤ میں آ کر کر لی تھی غازی کی پھوپھی زاد تھی۔ اپنے نام کی طرح وہ خود بھی ستر کی دہائی کی ہیروئن دکھائی دیتی تھی۔ غازی جب بھی اس سے کوئی گفتگو کرتا، وہ شرماتے ہوئے اپنے دوپٹے کے کناروں کو مروڑنے لگتی تھی۔

اس وقت بھی جب غازی، ماہ نور سے گفتگو کر رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ اس کی پینڈو منگیتر رخشی میٹرک سے آگے پڑھ لیتی تو ہو سکتا تھا کہ اسے گفتگو کرنے کا کچھ ڈھنگ آ جاتا۔

''غازی! تمہیں میری آواز سنائی تو دے رہی ہے؟'' غازی کی غائب دماغی کو محسوس کرتے ہوئے ماہ نور نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، بالکل۔ تم کہو آج کیسے یاد کیا؟''

''میں لاہور جا رہی ہوں اور جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ وقت بہت کم ہے، تم اگر بزی نہیں ہو تو پلیز جتنی جلدی ہو سکے آنٹی کے گھر پہنچو۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟''

غازی کے لہجے میں حیرانی تھی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ ''ہاں بھئی، تم سے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ آج سے پہلے کیا میں نے تم سے براہ راست گفتگو نہیں کی؟'' اس نے یوں کہا کہ غازی جھینپ گیا۔

''کیا ارسل بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

''نہیں۔'' اس کا مختصر جواب سنتے ہی بے اختیار غازی پوچھ بیٹھا۔

''تم اور ارسل تو کل پکنک منانے جا رہے تھے۔ یہ پروگرام کیسے تبدیل ہو گیا؟''

''بس تبدیل ہو گیا۔ تب ہی تو میں خالہ کے پاس لاہور جا رہی ہوں۔ اور تم سے ملاقات بھی ضروری ہے۔ اب تم مزید وقت ضائع کیے بغیر یہاں پہنچو، میں تمہاری منتظر ہوں۔'' اس نے آخری جملہ ادا کرتے ہی فون آف کر دیا۔

غازی جو اس وقت متحیر سا موبائل کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ ارسل اور ماہ نور کا جھگڑا ہو گیا ہے۔ جس کی نوعیت خاصی سنگین دکھائی دے رہی تھی۔ غازی کے نزدیک ارسل ہی قصور وار تھا۔ یقیناً اس نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی جس پر ماہ نور دل برداشتہ ہوئی ہے۔ اب اگر وہ ارسل سے منگنی ختم کر رہی تھی تو یہ ارسل کی بدقسمتی ہے۔

جب ارسل اور ماہ نور کی منگنی ہوئی تھی تب غازی کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اب ارسل کی زندگی میں کوئی اور لڑکی نہیں آئے گی۔ ارسل کی گزشتہ زندگی میں بے شمار لڑکیوں سے دوستیاں رہی تھیں۔ وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے منسلک تھا۔ کمرشلز میں آنے کی خواہش مند کئی لڑکیاں اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھیں اور ارسل اپنی ہمدردانہ فطرت کی بدولت انہیں چانس دلانے کا وعدہ کرتے ہوئے ان سے دوستی کر بیٹھتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ماہ نور کو اس کی خصلت کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ ماہ نور سے انگیجمنٹ کے بعد بھی ارسل نے اپنی فطرت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ اب بھی دل لگی کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔

دوست ہونے کے ناتے غازی نے ارسل کو سمجھایا بھی تھا کہ اب وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے، اس کی دوسری لڑکیوں سے حد سے زیادہ بے تکلفی کا علم، امریکن معاشرے کی آزادی سے بے زار ماہ نور کو ہو گیا تو وہ انگیجمنٹ توڑنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگائے گی مگر ارسل نے غازی کی یہ بات ہنسی میں اڑا دی تھی۔

☆☆☆

غازی محدود وقت میں بھی بڑی تیاری کے ساتھ ماہ نور کی پھوپھی کے گھر پہنچا تو ماہ نور کو اپنا منتظر پایا۔

ماہ نور تین ماہ قبل پاکستان آئی تھی، یہاں اس کے آنے کا مقصد قریبی عزیزوں سے ملاقات تھا۔ وہ اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ اپنی پاپا کی اچانک موت کے بعد وہ خاصی اپ سیٹ تھی۔ ڈپریشن کی کیفیت میں ایک دن اس نے بیٹھے بٹھائے پاکستان آنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ جب اس کے بابا وصی پاشا کو اس کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔

مجبوراً ماہ نور کو امریکہ سے یہاں تنہا آنا پڑا تھا۔ یہاں وہ پھوپھی کے گھر ٹھہری تھی، پاکستان آنے کے بعد ماہ نور کا ڈپریشن دور ہو گیا تھا۔ اسے لوگوں سے ملنے جلنے میں لطف آ رہا تھا۔

خاندان کی ایک تقریب میں ماہ نور کی ارسل سے ملاقات ہوئی۔ ارسل سے اس کی ننھیال کی طرف سے رشتہ داری لگتی تھی۔ ارسل کی سحر انگیز شخصیت اور انداز گفتگو نے اور لڑکیوں کی طرح ماہ نور کو بھی اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ارسل نے چند ملاقاتوں کے بعد اسے پرپوز کیا تو ماہ نور جو اس کے سحر میں بری طرح گرفتار تھی، اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وصی پاشا آ نہیں سکتے تھے انہوں نے بہن پر ساری ذمہ داری ڈال دی۔ بہت عجلت میں ان دونوں کی انگیجمنٹ ہوئی۔

ان دونوں کی انگیجمنٹ کے بعد غازی کی ارسل سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں غازی نے ارسل کے مزاج میں کسی تبدیلی کے آثار نہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت جلد ماہ نور سے محروم ہو جائے گا۔ اور اب غازی کو لگ رہا تھا کہ وہ وقت آ گیا ہے۔ دوست ہونے کے ناتے وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ وہ ان کے رشتے کو بچانے کی اپنی پوری کوشش کرے گا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ دریافت کر بیٹھا کہ اسے یہاں کس مقصد سے بلایا گیا ہے۔ اپنے چہرے پر حد درجے کی سنجیدگی طاری کیے ماہ نور نے دستی بیگ کھولا اور ایک لفافہ اور ایک چھوٹی سی مخملیں استر والی ڈبیا نکالتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ غازی یہ مخملی ڈبیا فوراً پہچان گیا۔ دو ہفتے پہلے ارسل نے انگیجمنٹ کے موقعے پر اس میں

موجود انگوٹھی ماہ نور کو پہنائی تھی۔
"مہربانی کر کے تم یہ دونوں چیزیں ارسل کو دے دینا۔"
"تم یہ انگوٹھی کیوں واپس کر رہی ہو؟"
دھڑکتے دل سے غازی نے لفافہ اور ڈبیا کو تھامتے ہوئے پوچھا۔
"اس لیے کہ یہ انگوٹھی میں بالکل بھی نہیں پہن سکتی۔ اور تمہارا دوست ارسل نہ جانے کن چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ میں صبح سے اسے ٹرائی کر رہی ہوں، اس کا موبائل آف ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ فون بند کر کے بیٹھ جاؤ، بھلے سے کسی کو آپ سے ضروری بات کرنی ہو۔ کل اچانک وہ آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد چلا گیا ہے، تمہیں علم تو ہوگا۔"
غازی کا سر نفی میں ہل گیا۔
"خیر، ارسل کو یہاں پہنچنے میں تین سے چار روز لگ ہی جائیں گے۔ میں لاہور خالہ سے ملنے جا رہی ہوں، وہیں سے میں امریکہ روانہ ہو جاؤں گی۔ غازی! ارسل جیسے ہی لوٹے تم یہ چیزیں اسے دے دینا، بھولنا نہیں۔ تمہاری بھولنے کی عادت سے میں بخوبی واقف ہوں، سمجھ گئے نا۔"
حیران سے غازی نے ماہ نور کو دیکھا جو منگنی ختم کرتے ہوئے ذرا سی بھی افسردہ نہیں تھی۔ غازی کے بدترین اندیشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔
"تمہارے لیے چائے بنواؤں؟"
"تم لیٹ تو نہیں ہو رہی ہو؟" غازی نے اس کی آفر کے جواب میں پوچھا۔
"نہیں، ابھی اتنا ٹائم ہے کہ ہم دونوں اکٹھے چائے پی سکتے ہیں۔" ماہ نور فوراً اندر گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ اس نے چائے کا کپ غازی کی طرف بڑھایا اور خود اس کے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھ گئی۔
غازی نے بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ ارسل کا ماہ نور سے رشتہ نہ ٹوٹے۔
"سنو، ماہ نور۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ارسل میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم ساتھ کھیلے، کودے اور ساتھ ہی ایک اسکول، کالج میں پڑھے ہیں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بالکل ہیرا۔ تم نے اس کے حوالے سے جو کچھ سنا ہے، اسے بھول جاؤ۔ ارسل کو معاف کر دو۔"
"معاف کر دوں؟" ماہ نور نے عجیب سی نظروں سے غازی کو دیکھا۔
"دیکھو ماہ نور! میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں، یقیناً تمہیں کسی نے ارسل سے جڑے تعلقات کے بارے میں بتایا ہے۔ میں جانتا ہوں تم پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ لڑکیاں جو ارسل کی زندگی میں آئیں، یقین کرو وہ لڑکیاں ارسل کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ تم واحد لڑکی ہو جس سے ارسل محبت کرتا ہے اور یہ انگوٹھی......" غازی نے انگوٹھی کی مخملی ڈبیا پر انگلی پھیری۔ "اس حقیقت کا بہت واضح اور ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ثانیہ، مہک اور بھی کئی لڑکیاں تھیں جن کی ارسل کے ساتھ حد درجے کی بے تکلفی دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ارسل ان میں شادی کے لیے انٹرسٹڈ ہے لیکن ارسل نے ان میں سے کسی کو بھی یہ انگوٹھی پیش نہیں کی، اس کے نزدیک ان لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان لڑکیوں سے دوستی محض دل لگی تھی۔ ارسل ہمیشہ سے ایسا ہے، شوخ اور تفریح باز۔ مجھے امید ہے کہ شادی کے بعد تمہیں اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بڑے بڑے دل پھینک شادی کے بعد کھونٹے سے بندھے دکھائی دیتے ہیں۔"
ماہ نور، غازی کی باتوں کو سن کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔ غازی جو ارسل سے دوستی نباہتے ہوئے اس کے اور ماہ نور کے تعلق کو بچانے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا، اپنی کوشش کو کامیابی سے ہم کنار ہوتے دیکھ کر اسے فتح کا احساس ہوا۔ ماہ نور چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر اس نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے

غازی سے کہا۔
"وہ لفافہ مجھے واپس کردو۔"
غازی نے فوراً جیب سے لفافہ نکال کر اسے دے دیا۔
"ماہ نور! تم واقعی بہت ذہین اور معاملہ فہم لڑکی ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم جو جذباتی فیصلہ کر رہی ہو، اس پر نظر ثانی کرو گی۔"
"یہ تم پڑھو۔" ماہ نور نے سفید لفافہ میں سے ایک کاغذ نکال کر غازی کی طرف بڑھایا۔
"میں یہ خط پڑھ کر کیا کروں گا۔ ویسے بھی مجھے لوگوں کے پرسنل لیٹرز میں کوئی دلچسپی نہیں۔"
"اب اتنے بھی شریف نہ بنو، میں کہہ رہی ہوں غور سے دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔"
غازی نے کاغذ پر سرسری نظر ڈالی۔ ایک دم وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ جیولر کی رسید تھی، جس میں انگوٹھی کا وزن اور اس کی قیمت لکھی ہوئی تھی۔ اس لفافے اور انگوٹھی کو دیکھ کر غازی کے دل میں جس اندیشے نے جنم لیا تھا، وہ غلط تھا۔
"غازی! تم بالکل بونگے ہو۔ بغیر مجھ سے کچھ پوچھے تم نے اندازہ لگا کر اپنے دوست کی صفائیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کی ذات کے ان پہلوؤں کے بارے میں مجھے بتا ڈالا، جن کے بارے میں، میں کشمکش کا شکار تھی کہ مجھے جو سن گن ملی ہے، اس میں کس حد تک صداقت ہے۔ یہ انگوٹھی جب میں نے تمہارے حوالے کی تو تم سمجھ بیٹھے کہ میں انگیجمنٹ ختم کر رہی ہوں کیونکہ مجھے ارسل کی ذات کے تاریک پہلوؤں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ جبکہ میں نے یہی انگوٹھی اس لیے ارسل کو واپس کی کہ یہ میری انگلی میں کچھ تنگ تھی۔ ارسل نے کہا تھا کہ وہ سائز بڑا کروا دے گا۔ خیر، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھے اور جب بھی اسے ایسی لڑکی مل جائے جو اس کی بدمستیاں برداشت کر سکے، اسے یہ انگوٹھی پہنا دے۔"

"ماہ نور! ارسل سے متعلق یہ باتیں میں نے محض مذاق میں کی تھیں۔"
غازی نے فوراً جھوٹ گھڑنے کی کوشش کی تو ماہ نور نے قطع کلامی کی۔
"غازی! تمہیں جھوٹ بول کر سچائی پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے......" وہ موبائل پر کسی سے بات کرنے لگی پھر ارسل سے مخاطب ہوئی۔
"میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اچھا غازی! خدا حافظ۔ تم نے میری آنکھیں کھول دیں ورنہ میں اس لڑکی ...... کیا نام تھا اس کا......" ماہ نور ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔ "ہاں نیناں! میں اس کی کال کو سیریس نہیں لیتی۔"
مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے غازی نے وہاں سے اٹھنا مناسب سمجھا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم کی فضا میں گہرا سکوت طاری تھا جسے ارسل نے توڑا۔
"یار غازی! تو دل چھوٹا نہ کر، جو ہوا یقیناً بہتر ہوا۔ کرنے کو تو میں نے جلدی بازی میں ماہ نور سے منگنی تھی مگر مجھے اندازہ تھا کہ ماہ نور میرے ساتھ نہیں چل سکے گی۔ میرے لیے تو رخشی بھابھی جیسی لڑکی آئیڈیل ہو سکتی ہے۔ جو آنکھیں بند کر کے میری ہر بات پر یقین کر لے۔"
گھنٹے بھر سے اپنی صفائیاں دیتے غازی نے ارسل کی گفتگو کے آخری جملے کو سن کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... حمیرا مغل
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

نازیہ کنول نازی

دوسری قسط

جنہیں راستے میں خبر ہوئی

کبھی یونہی چلتے چلتے
اے کاش ایسا ہو کہ
کسی موڑ پہ رکو تم
جو ہو ساتھ تیرے جاناں
اسے دیکھ کر کہو تم
کبھی ان ہی راستوں پر مجھے اک ملی تھی لڑکی

لڑکی بھی کیا عجب تھی گہرے سمندروں سی
جب بھی کبھی وہ ہنستی مجھے یہ گمان ہوتا
کہ ابھی وہ رو پڑے گی
روتے ہوئے کہے گی
جینا ہے کتنا مشکل، لگتا نہیں کہیں دل
لیکن وہ عجب لڑکی، ہنستی تو ہنستی رہتی
اک لفظ بھی نہ کہتی
میرے دل کی ساری باتیں چپ چاپ سنتی رہتی
اسے دیکھ کر یوں لگتا
کسی ڈوبتی سی کشتی کو کنارہ مل گیا ہو
وہ جو خود سے تھی بیگانی
میرے روپ میں اسے اک سہارا مل گیا ہو
لیکن ہوا پھر ایسا
اسے جب تھمایا میں نے شادی کا اپنا کارڈ
مجھے دیکھتی رہی وہ، کچھ سوچتی رہی وہ
اس کی اداس آنکھیں تھیں حیرانیوں میں ڈوبی
لیکن وہ عجب لڑکی اس دن بھی تو ہنسی تھی
ہنسنے سے اس کے آنسو گالوں پہ آ پڑے تھے
اس کی ہنسی میں مجھ کو اک درد سا ملا تھا
جس کے لبوں پر کوئی شکوہ تھا نہ گلہ تھا

پھر یوں ہوا کہ مجھ سے کہیں کھو گئی وہ لڑکی
اسے ڈھونڈتا ہوں اب تک جانے وہ کب ملے گی
روتے ہوئے کہے گی
جینا ہے کتنا مشکل، لگتا نہیں کہیں دل
کبھی یوں بھی چلتے چلتے، اے کاش ایسا ہو کہ

☆☆☆

بارش تھم چکی تھی۔ موسم کے تیور بھی جارحانہ نہیں

ناولٹ

رہے تھے اس کی قسمت کہ بہت دیر تک ادھر ادھر دیکھنے کے باوجود اسے کوئی اور ذی نفس وہاں سے گزرتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔
بہت زیادہ مجبور ہو کر وہ گاڑی کی پچھلی سائیڈ

پر آئی تھی۔ اس لمحے اسے رہ رہ کر سوزان پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ کہیں سے وہ سامنے آتا اور وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ نہ وہ اسے لینے یونیورسٹی آتا، نہ وہ اس مصیبت میں پھنستی۔ اس کے دماغ میں یہ تو خیال ہی نہیں تھا کہ جلد بازی تو اس نے کی تھی، بلاوجہ شک میں پڑ کر اپنا خون الگ جلایا، حماقت الگ کی اور جو پریشانی اس کی وجہ سے سوزان کو اٹھانی پڑی ہو گی وہ الگ......

''چلو جلدی دھکا لگاؤ بھئی، میں کوئی فارغ آدمی نہیں ہوں کہ تمہارے موڈ کا انتظار کرتا کھڑا رہوں۔'' اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ شخص پھر کرختگی سے بولا تھا۔

انجشاء کڑوا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ گاڑی بند تھی مگر انجن چل رہا تھا اس نے اپنی طرف سے پوری طاقت لگا دی مگر گاڑی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ مفت میں عجیب پریشانی بن گئی تھی۔ وہ جتنا خود کو کوستی کم تھا۔

''کیا بات ہے، کھانا وانا نہیں کھاتی ہو کیا، دیکھنے میں تو اچھی خاصی صحت مند دکھائی دیتی ہو، مگر دھکا لگانے میں زیرو ہو۔'' اسے ہانپتے دیکھ کر وہ شخص مسکراتے ہوئے قریب آیا تھا۔

انجشاء کا غصہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں شعلوں سی آنچ تھی۔

''دیکھیے انکل! آپ کا بہت شکریہ، میری درخواست پر آپ نے میری مدد کرنے کی کوشش کی، وہ کیا ہے کہ غصے میں میرے دماغ کا فیوز اڑ جاتا ہے، سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی، ورنہ آپ کو مدد کے لیے زحمت دینے کے بجائے میں اپنے کزن کو کال کر لیتی، موبائل ہے میرے پاس، اب پلیز آپ جائیں اپنا کام کریں میں ابھی اپنے کزن کو کال کر کے بلا لیتی ہوں۔''

''ارے واہ۔ یہ خوب کہی، دو چار سال بڑے لوگوں کو انکل کہہ دیتی ہیں آپ۔ بھئی! لوگ سچ کہتے ہیں، عورتیں عمر چور ہوتی ہیں۔ خیر اب مدد کے لیے میدان میں کود ہی پڑے ہیں تو مدد کر کے جائیں گے۔ چلو پھر سے کوشش کرتے ہیں۔''

عجیب ڈھٹائی سے کہتا وہ شخص بنا اس کے تیوروں کی پروا کیے اس کی پشت پر آیا اور اگلے ہی پل نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ ہوا کیا ہے۔ اگلے لمحے جیسے ہی حواس نے کچھ کام کیا، اس نے خود کو اس ادھیڑ عمر شخص کی گرفت سے نکالنے کے لیے پوری قوت لگا دی۔ مگر وہ خود کو آزاد کروانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس وقت جو شیطان صفت انسان اس کے قریب تھا وہ اس پر حاوی تھا۔ اور اسے گھسیٹ کر گاڑی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ بند گاڑی کے اندر وہ اپنے ناپاک ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

انجشاء کو لگا جیسے بس زندگی یہیں تک تھی، کتنی عجیب بے بسی تھی کہ وہ خود کو بچا نہیں پا رہی تھی۔ وہ چلانا چاہتی تھی، سارا آسمان ہلا کر رکھ دینا چاہتی تھی مگر......حواس کچھ یوں سلب ہوئے تھے کہ اس سے چلایا ہی نہیں گیا۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر دماغ جیسے مفلوج ہو گیا تھا دل تھا کہ خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کب آنکھوں سے آنسو گرے کب دل نے اپنے خالق حقیقی کو پکارا، کب گڑگڑا کر اس سے مدد کی درخواست کی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ تبھی کوئی وہاں آیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' کڑک آواز میں آنے والے نے پوچھا تھا۔ عین اسی لمحے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو نرم بستر میں موجود پایا۔ اس کی ماں اس کے سرہانے بیٹھی کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھی جبکہ منجھلی بہن متفکر سی اس کی پائنتی کی طرف بیٹھی شاید اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ حیران حیران سی اٹھ بیٹھی۔ تبھی اس کی بہن بولی۔

''لیٹی رہو، ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں

ہے۔"
"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟ اور میں یہاں کیسے آ گئی؟"
"تمہارے ابو لائے ہیں تمہیں، بے ہوش ہو گئی تھیں تم۔"
"اف میرے خدا......"
ماں کی اطلاع نے اسے سب یاد دلا دیا تھا وہ مصیبت بھی جو اچانک گلے پڑ گئی تھی۔ کیا ہوتا اگر اللہ اس کی سچے دل سے نکلی دعا نہ سنتا؟ کیا ہوتا اگر معجزاتی طور پر اس کا باپ وہاں اچانک ٹائم پر نہ پہنچتا؟ یہ تصور ہی کتنا خوف ناک تھا کہ وہ ایک ہنستی کھیلتی زندہ جاوید لڑکی سے چلتی پھرتی لاش میں بدل کر عمر پوری کرتی۔ تصور ہی اتنا خوف ناک تھا اگر جو حقیقت ہو جاتی؟ وہ اچھی خاصی خوف زدہ ہو گئی تھی جب اس کی ماں نے بتایا۔
"ڈاکٹر ابھی پانچ منٹ پہلے چیک کر کے گیا ہے تمہیں، سائرہ اور سوزان بھی آئے ہوئے ہیں تمہارے ابا بات کر رہے ہیں ان سے، تم آرام کرو، میں اب جا کر دیکھتی ہوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"
وہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور سنجیدہ تھیں۔ انجشاء نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اندر کیا معاملات چل رہے ہیں۔ وہ آرام سے پلکیں موندے لیٹی رہی۔
مسز عظیم نے کمرے میں قدم رکھا تو انہوں نے اپنے شوہر کو کہتے سنا۔
"دیکھیں، بہن، بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے کوئی بوجھ تو ہوتی نہیں کہ گلے سے اتار کر ادھر ادھر پھینک دیا جائے۔ نائلہ نے جب انجشاء آپ کے حوالے کی، میں تب بھی خاص رضا مند نہیں تھا، مگر آج میں نے خود اپنی آنکھوں سے جس حال میں اپنی بیٹی کو دیکھا ہے میری روح کانپ گئی ہے اندر سے۔ کیا ہوتا اگر میں پانچ منٹ لیٹ ہو جاتا۔ میری بیٹی کی تو زندگی برباد ہو جاتی، کون ذمہ دار بنتا اس کا؟ کون اپناتا اسے؟ بیٹی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے، اور اس کی حفاظت اس سے بھی بڑی ذمہ داری......"
"آپ صحیح کہہ رہے ہیں بھائی صاحب مجھے آپ کی کسی بات سے کوئی اختلاف نہیں مگر میرا اللہ جانتا ہے۔ میں نے انجشاء کو کبھی پرائی بچی نہیں سمجھا، کبھی اس کی تربیت اور حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہمیشہ اپنی سگی بیٹی کی طرح جان سے لگا کر رکھا ہے۔ آج بھی ٹائم سے پہلے سوزان کو بھیجا، پتا نہیں کیسے وہ اتنا غافل ہو گیا کہ اسے انجشاء کے تنہا گاڑی لے جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔"
مسز ساحر روہانسی ہو رہی تھیں۔ عظیم صاحب نے اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا۔
"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں، میری بچی باحفاظت مجھے مل گئی یہی اللہ کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر شکر ہے اس پاک رب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ لوگ تو سالوں سے نجانے کیسی کیسی باتیں سنا رہے تھے کہ جوان لڑکا ساتھ رہتا ہے اس گھر میں اگر کبھی کسی کمزور لمحے میں شیطان غالب آ گیا تو کیا بنے گا؟ مگر میں نے کبھی کسی کی نہیں سنی، اب مجھے بھی یہی فکر لاحق ہے۔"
"نہیں بھائی صاحب! پلیز ایسا مت کہیں میرا سوزان ایسا نہیں ہے۔" وہ تڑپ ہی تو اٹھی تھیں بیٹے سے متعلق ایسی بات سن کر۔ خود سوزان کا چہرا بھی خفت سے سرخ پڑ گیا تھا مگر وہ خاموش تھا۔
کمرے میں ایک مرتبہ پھر عظیم صاحب کی آواز ہی گونج رہی تھی۔
"ہاں ہاں میں جانتا ہوں، میرے سامنے پل کر جوان ہوا ہے مگر آگ اور گھی کو اکٹھا رکھ کر اگر ہم یہ امید کریں کہ آگ گھی کو نقصان نہیں پہنچائے گی تو یہ ہماری بہت بڑی بے وقوفی ہو گی۔ انجشاء جوان ہے، خوب صورت ہے۔ بچپن کی بات اور تھی اب حالات کچھ اور ہیں۔ میں امید کرتا ہوں آپ میری بات سمجھ رہی ہوں گی برا وقت کبھی بھی کسی سے پوچھ کر نہیں آتا، میں شریف آدمی ہوں ساری عمر کی جمع پونجی بس

یہ عزت ہی ہے۔"

مسز ساحر کے پاس اس مرتبہ کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تبھی سوزان بولا۔

"بہت شکریہ انکل، آپ نے اور آنٹی نے میری امی کی محبت میں، ان کی تنہائی اور تکلیف کا احساس کرتے ہوئے بچپن سے اب تک انجشاء کو ہمارے سپرد کیا۔ آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھول سکتے ہم۔ مگر ایک بات آپ اچھی طرح ذہن نشین کرلیں نہ تو میں بدکردار ہوں، نہ کبھی آپ کی بیٹی کے لیے میرے دل میں بھی کوئی غلط خیال آسکتا ہے۔ آپ کی بیٹی دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوئی تب بھی میری زندگی کا فیصلہ میری ماں کے ہاتھ میں ہی ہوگا۔ کسی کے اعتبار کو ٹھیس پہنچانے والے لوگ نہیں ہیں ہم۔ جہاں تک کل کے واقعے کی بات ہے تو اس میں بھی سراسر آپ کی بیٹی کی بے وقوفی ہے۔ اسے یونیورسٹی سے پک کرنے کے بعد، اسے بتا کر میں اپنے ایک دوست کے گھر اس کی ماں کے لیے دوائیاں پکڑانے گیا تھا، ابھی دس منٹ نہیں ہوئے تھے کہ یہ بنا بتائے گاڑی بھگا کر لے گئی۔ بہرحال مجھے کسی بحث میں نہیں پڑنا آپ کی بیٹی ہے آپ جو چاہے فیصلہ کریں۔ مگر ایک بات ہے کسی کو کوئی چیز خود دے کر واپس لے لینا اچھی بات نہیں۔"

"کوئی چیز نہیں، میری بیٹی ہے وہ......" اس کی لمبی چوڑی وضاحت کے بعد عظیم صاحب کا لہجہ کمزور ہو چکا تھا۔

سوزان اٹھ کھڑا ہوا۔

"خدا آپ کی بیٹی کے نصیب اچھے کرے آمین۔ چلیں امی، بہت دیر ہوگئی ہے، میرے خیال سے اب ہمیں چلنا چاہیے۔" اس کا لہجہ روڈ ہو چکا تھا۔ عظیم صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"ہاں چلو......" مسز ساحر عظیم صاحب کا رویہ محسوس کرتے ہوئے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کی ٹانگیں جیسے ٹوٹ سی گئی تھیں۔

جس چھوٹی سی بچی کو پال پوس کر بڑا کرنے میں اتنے سال لگ گئے تھے اسی بچی کو اصل مالکوں نے پرایا کرنے میں ایک منٹ نہیں لگایا۔ ان کا دل بے حد بوجھل تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئیں تو انجشاء جاگ رہی تھی انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام، کیسی ہو؟"

جانے کیوں اس کے پاس رکتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انجشاء تڑپ اٹھی۔

"آپ رو رہی ہیں، کیوں؟ دیکھیں، میں بالکل ٹھیک زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ امی، چلیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

سوزان کی بات اور لہجے نے اسے چونکایا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے وہ پریشان ہیں مگر سوزان کا رویہ بتا رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

"کیا بات ہے آنی...... کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں ہوا اور تمہیں اب میری ماں کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اپنی ماں کا خیال میں خود رکھ سکتا ہوں الحمدللہ۔" انجشاء کے متفکر لہجے پر وہ تپ کر بولا، جواب میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"سوزان......"

"امی پلیز آجائیں جلدی، مجھے جانا ہے کہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، وہ ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے منع کرتا، اگلے ہی لمحے پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا۔

انجشاء کے آنسو اس کی پلکوں پر ہی اٹکے رہ گئے بے حد حیرانی سے وہ اسے قطعی بدلے ہوئے موڈ میں جاتا دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کسی آسیب کی طرح سارے ماحول پر اپنے پر پھیلائے۔ "ساحر ولا" میں بے سکونی بکھیرنے کو تیار

تھی۔ سوزان گھر پر نہیں تھا۔ انجشاء کے گھر سے واپسی کے بعد وہ مسز ساحر کو گھر ڈراپ کر کے خود نجانے کہاں نکل گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ اکیلی بیٹھی رو رہی تھیں۔ ساحر صاحب کے کچھ پرانے دوست آئے تھے۔ وہ ان سے فارغ ہو کر آئے تو انہیں تنہا بیٹھے روتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟"

"پتا نہیں۔" انہیں دیکھ کر ان کے آنسوؤں میں مزید روانی آئی تھی۔ وہ پریشان ہو گئے۔

"انجشاء کہاں ہے؟"

"اپنے گھر......" منہ پھیر کر بھرائے لہجے میں انہوں نے جواب دیا تھا۔ وہ مزید حیران ہوئے۔

"کیا مطلب اپنے گھر؟ اس کا گھر تو یہی ہے۔"

"اس کا گھر نہیں ہے یہ، اس کے باپ کا گھر ہی اس کا گھر ہے۔ کسی کو پال پوس کر بڑا کر دینے سے وہ آپ کا نہیں ہو جاتا۔"

پہلی مرتبہ مسز ساحر نے اپنے شوہر کے سامنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ انہیں خوشی ہوئی۔

"میں سمجھا نہیں تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔"

"ہاں۔"

"مگر کیوں؟"

اور اس کیوں کے جواب میں مسز ساحر نے انہیں کل سے اب تک کے سارے حالات تفصیلاً کہہ سنائے۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ مگر تمہیں فضول میں رونے کی ضرورت نہیں، میں انجو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں وہ وہاں رہنے والی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میری بیٹی بہت بہادر ہے، دیکھنا وہ سب سے لڑ جھگڑ کر کل صبح ہی واپس یہاں آ جائے گی۔" ساحر صاحب کا لہجہ بے حد مضبوط اور خوش گوار تھا۔ سائرہ بیگم کے دل کو ڈھارس ملی۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

"تو کوئی بات نہیں، ہم اپنی بیٹی کے لیے پھر سے کوشش کریں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ ہنسے تھے۔ مسز ساحر ہکا بکا سی انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں۔

سوزان گھر آیا تو رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ ساحر صاحب اور سائرہ بیگم اس کا انتظار کرتے کرتے ہی سو چکے تھے۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ سیدھا کمرے میں چلا آیا تھا۔ بدن تھکن سے چور جبکہ دل عجیب سے درد سے نڈھال تھا۔ اس وقت اس کی گھر واپسی بھی جگری دوستوں کے ساتھ بلاوجہ جھگڑا کر کے ہوئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔

کمرا صاف ستھرا سیٹ کیا ہوا تھا مگر اسے ایک آنکھ نہیں بھایا، صرف کمرا ہی کیا اسے کوئی چیز بھی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ جوتے اتار کر سلیپر پہنے اور کچن میں آیا، فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔ فریج بند ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ ٹھنڈی نہیں تھی اس نے کھینچ کر دیوار پہ دے ماری۔ فریج بھی زور سے یوں بند کیا کہ سارا ہل کر رہ گیا۔

رات اتنی تکلیف دہ کبھی نہ تھی جتنی اس روز محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کبھی محسوس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اس کے لیے اتنا اہم ہو چکا ہے کہ اس کے نہ ہونے سے سانس سینے میں الجھنے لگے۔

اس روز مہندی کی رات جب اس پر یہ منکشف ہوا تھا کہ انجشاء اس کے لیے کوئی عام لڑکی نہیں ہے بلکہ بہت خاص ہے تو وہ بہت الجھا تھا۔ اس کا میک اپ دھو کر صاف کرنے کے بعد اسے خود بھی اپنی اس حرکت پر غصہ آیا تھا مگر دل کے چور کا کیا کرتا جو بالکل اچانک کود کر سامنے آ گیا تھا۔ بالکل اچانک اس پر یہ منکشف ہوا تھا کہ اگر انجشاء کو کوئی مرد پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے یا سراہے گا تو اس سے برداشت نہیں ہو گا۔ وہ بس اس کی تھی۔ کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس کے وجود کی خوشبو کو بھی پا سکے۔ اس رات بھی وہ بہت مضطرب رہا تھا، ساری رات آنکھوں میں کاٹ کر بھی دل کو قرار نہیں ملا۔ مہندی

کے بعد برات اور دیگر تقریبات بھی یونہی گزر گئیں مگر اسے قرار نہیں ملنا تھا سو نہ ملا۔ شادی کے بعد گھر واپسی کے بجائے شمالی علاقہ جات کی طرف سیر و تفریح کا پروگرام بھی سو فیصد اسی نے طے کیا تھا تا کہ وہ خود کو وقت دے سکے اور جو جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ اسے چاروں شانے چت کر رہا ہے اسے شکست دے سکے۔ مگر اسے اس پلاننگ میں بھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی تو اس نے ہار مان لی۔ اور شمالی علاقہ جات سے واپسی کے سفر کے ساتھ ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اپنی محبت اور اس کی شدت کو ہرگز انجشاء سے مخفی نہیں رکھے گا، بلکہ یہی نہیں وہ مسز ساحر سے بات کر کے اپنے اور اس کے تعلق کو ایک مضبوط حوالہ دے گا تا کہ کوئی ان کے درمیان جدائی کی دیوار کھڑی نہ کر سکے۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ انجشاء اپنی بے وقوفی اور شک سے اس سے پہلے ہی سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دے گی۔

جتنا اس وقت اسے اس احمق لڑکی پر غصہ تھا یقیناً وہ پاس ہوتی تو ضرور اس کے ہاتھوں اپنا منہ تڑوا چکی ہوتی۔

ساری رات یونہی گزر گئی تھی۔ جلتے، سلگتے، کڑھتے، فجر کی اذان ہوئی تو اسے کچھ سکون ملا تب ہی فوراً اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور پھر مکمل دل جمعی کے ساتھ، پورے خضوع و خشوع سے نماز فجر ادا کی۔ صبح کی سپیدی ابھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ بستر پر آیا تو اگلے چند ہی لمحوں میں نیند کی مہربان پری نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

مسز ساحر جس وقت نماز سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں آئیں وہ پر سکون گہری نیند میں سویا ہوا ملا۔ انہوں نے اسے سویا دیکھ کر بے ساختہ اپنے حقیقی مالک کا شکر ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

"کوئی مجھے بتائے گا کہ ابو اور سائرہ آنٹی کے مابین کیا بات ہوئی ہے؟"

سوزان اور سائرہ بیگم کے گھر سے نکلتے ہی انجشاء نے جیسے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ عظیم صاحب شدید غصے سے کمرے سے باہر آئے تھے۔

"ہاں میں بتاتا ہوں، تم آج کے بعد اس عورت کے گھر میں نہیں، اپنے باپ کے گھر میں رہو گی۔"

"کیوں؟" ان کی اطلاع پر وہ بھونچکا ہی تو رہ گئی تھی۔

"کیوں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کل تمہیں جس حال میں، میں گھر لایا سب بھول گیا تمہیں؟"

"نہیں سب یاد ہے، مگر اس سب میں سائرہ آنٹی کا کیا قصور ہے؟"

"کوئی قصور نہیں۔"

"تو پھر آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟"

"کون سی سزا دی ہے اسے، اپنی بیٹی واپس لی ہے۔"

"ان کے لیے یہی سزا ہے آپ کی جس بیٹی کو بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا انہوں نے، ہر ضرورت ہر خواہش پوری کی، اب جب اس بیٹی کا سکھ دینے کا وقت آیا تو آپ کو یاد آ گیا کہ آپ کی کوئی تیسری بیٹی بھی ہے جسے آپ نے واپس لینا ہے۔"

"بس...... زیادہ زبان درازی کی ضرورت نہیں ہے، زبان کاٹ کر ہاتھ میں دے دوں گا تمہارے۔"

"یہی کر سکتے ہیں آپ۔ مگر سن لیں، میں سائرہ آنی اور ساحر انکل کی بیٹی ہوں۔ انہی کا یہ حق ہے کہ وہ میری زندگی کا فیصلہ کریں۔ میرے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں وہ اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں۔ بے فکر رہیے، مجھے اگر کچھ ہو گا تو حرف ان کے نام اور تربیت پر ہی آئے گا آپ کے نہیں۔" وہ شروع سے ایسی ہی جی دار اور منہ پھٹ تھی۔

عظیم صاحب کو اس کی آنکھوں کی بغاوت میں گھر پر اپنی حکمرانی کا وجود خطرے میں پڑتا نظر آیا تبھی کلس کر بولے۔

”دیکھ لیا نائلہ بیگم! دیکھ لیا ایسی نا ہنجار اولاد کو...... کیسے سگے باپ کے سامنے تڑتڑ بول رہی ہے، یہی تمیز دی ہے تمہاری سہیلی اور اس کے میاں نے اسے۔“

”نہیں، یہ آپ کا خون ہے ابا......! جو غلط بات کے خلاف رگوں میں دوڑ رہا ہے۔“

بکواس بند کرا پنی اور دفع ہو جا یہاں سے، آج کے بعد میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا، بہتر ہوتا اگر کل تمہارے ساتھ وہ سب ہو جاتا جو میری وجہ سے نہیں ہوا پھر دیکھتا میں، کیسے تڑتڑ زبان چلتی ہے تیری۔“ عظیم صاحب اب غصے سے ہانپ رہے تھے۔

نائلہ بیگم جو کب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھیں جلدی سے لپک کر آگے بڑھیں اور غصے سے ہانپتے عظیم صاحب کو پکڑ کر ان کے کمرے میں لے گئیں۔

خیر تو ان کی جان کو بھی نہیں تھی مگر بیٹی کی حفاظت ضروری تھی سو انہوں نے اپنی پروا نہیں کی۔

انجشاء نے عظیم صاحب کے الفاظ پر دکھ سے مسکراتے ہوئے پلکوں پر اٹکا ہوا آنسو انگلی پر منتقل کر کے فضا میں اچھال دیا۔

”یہ باپ ہیں ہمارے...... ہائے او ربا، کیا بنتا ہوگا ان بے چاری لڑکیوں کا جن کے باپ ہمارے باپ کی طرح سخت القلب ہوتے ہوں گے۔“ اپنی بہن کی طرف دیکھتے اس نے سرد آہ بھری۔ جواب میں وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ وہ ساحر ولا جانے کے لیے پر تول رہی تھی جب گالوں پر تھپڑوں کے سرخ نشان لیے نائلہ بیگم نے اسے روک لیا۔

”تمہاری طبیعت ابھی زیادہ بہتر نہیں ہے انجو، ابھی رک جاؤ کل چلی جانا، مجھے کچھ بات بھی کرنی ہے تم سے۔“

”ٹھیک ہے امی جیسے آپ کہیں۔“

ان کے گالوں پر تھپڑوں کے سرخ نشانات نے اس کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ وہ سمجھ گئی عورت چاہے جتنی بھی پڑھی لکھی مضبوط کیوں نہ ہو، مرد کی بربریت اسے ریت بنا کر ہوا میں اڑا دیتی ہے۔

اس رات وہ اپنی ماں کے ساتھ انہی کے بستر پر سوئی تھی۔ نائلہ بیگم نے اسے بتایا تھا کہ عظیم صاحب اس کی دونوں بڑی سیدھی سادھی بہنوں کا رشتہ ایک دور پار کے گاؤں میں ان پڑھ لڑکوں کے ساتھ طے کر چکے ہیں صرف اس لیے کہ ان لڑکوں کی بہن کے ساتھ خود ان کے اپنے بھانجے کا چکر چل رہا تھا مگر ان لوگوں کی شرط تھی کہ وہ وٹے سٹے کے بغیر رشتہ نہیں کریں گے لہٰذا صرف بہن کی خوشی کے لیے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ نائلہ بیگم نے جتنا احتجاج کرنے کی کوشش کی اتنی مار کھائی۔ اب تو ان میں مزید احتجاج کرنے کی ہمت بھی باقی نہیں بچی تھی۔

انجشاء کو ہمیشہ کی طرح اپنے باپ کے سفاک رویے نے بدظن کیا تھا مگر وہ کیا کر سکتی تھی سوائے دعا اور تسلی کے۔ لہٰذا ماں کو تسلی دے کر، سب اللہ رب العزت کے سپرد کرنے کا کہا اور سکون سے سو گئی۔ برسوں بعد ماں کے وجود کی خوشبو نے اسے حقیقت کی تلخ دنیا سے خوابوں کی میٹھی وادی تک پہنچانے میں بس چند لمحے لیے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح ماں کے ہاتھ سے صبح سویرے ناشتا کرنے کے بعد بغیر باپ کے منہ لگے اپنی بہنوں سے مل کر اور انہیں ماں کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے وہ ”ساحر ولا“ میں چلی آئی تھی۔

سائرہ بیگم کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں جبکہ ساحر صاحب باہر لان میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ جیسے اس نے گیٹ کراس کیا وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیے، جواباً انجشاء نے انہیں وکٹری کا نشان دکھایا۔

سوزان کمرے میں سو رہا تھا وہ جانتی تھی کہ وہ دیر سے ہی اٹھتا ہے تبھی معمول کی طرح ساحر صاحب سے مل کر سیدھی کچن میں چلی آئی۔

”السلام علیکم، صبح بخیر۔“
سائرہ بیگم اس کی چہکتی آواز پر بے ساختہ چونک کر پلٹیں پھر اسے ہر روز کی مانند نظروں کے سامنے دیکھ کر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئیں۔
”وعلیکم السلام۔ میری بچی، آ گئیں تم؟“
”شاباش ہے بنا بچی کو بتائے بنا بچی کی مرضی جانے اسے چپ چاپ اس ”چڑیا گھر“ میں سر سے اتار کر پھینک آئیں۔ اب یہاں اسی بچی کی محبت میں آنسو بہائے جا رہے ہیں۔“
خود اس کی اپنی آنکھیں ان کی اس درجہ محبت پر بھر آئی تھیں مگر اس نے خود کو چھپا لیا۔ مسز ساحر اس کے شکوے پر مسکرا دیں۔
”سدھر جاؤ انجشاء۔ نہیں تو کسی دن بہت پٹائی لگاؤں گی۔“
”زہے نصیب اچھا بتائیں ناشتا بنا لیا کہ رہتا ہے ابھی؟“
”بنا لیا بس میز پر لگانا ہے۔“
”چلیں وہ میں لگا دیتی ہوں، آپ بیٹھیں چل کر شاباش۔“
وہی اس کا اعتماد، خوش گوار انداز۔ ان کا دل ٹھنڈا ٹھار ہو گیا بے شک ساحر صاحب کا قیاس بالکل درست تھا۔
ساحر صاحب ناشتا کر کے آفس چلے گئے تھے۔ مسز ساحر ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ انجشاء نے کچن اور کھانے کی میز دونوں صاف کر دی تھیں۔ تقریباً بارہ کا ٹائم تھا جب اسے دوبارہ بھوک لگ گئی۔
ابھی وہ ناشتا لے کر بیٹھی تھی جب سوزان فریش ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ نظر اس پر پڑی تو وہ بے ساختہ ٹھٹک گیا۔
”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“
”ناشتا۔“ اس کی خفگی بھرے سوال کا جواب اس نے نہایت اطمینان سے مسکرا کر دیا تو وہ تپ گیا۔
”کیوں؟“
”بھوک لگی تھی اس لیے۔“
”بھوک لگی تھی تو اپنے گھر سے کر کے آتیں۔“
کل رات کا غصہ وہ اب اتار رہا تھا۔ انجشاء کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔
”اپنے گھر میں ہی کر رہی ہوں۔“
”یہ میرا گھر ہے۔“
”اور میرا...... کیا میرا نہیں ہے؟“
ناشتے سے ہاتھ روک کر اس نے بے ساختہ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا، جبکہ اس نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔
”اس سوال کا جواب تمہارے والد صاحب مجھ سے بہتر دے سکتے ہیں تمہیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ رکا نہیں تھا لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ انجشاء کی بھوک اچانک ختم ہو گئی۔ سارا دن یونہی بے کلی کی نذر ہو گیا۔ شام ڈھلی پھر رات بھی آ گئی مگر سوزان نہیں آیا۔ جتنی زیادہ وہ بے قرار و بے چین تھی اتنا ہی وہ بے نیاز بنا ہوا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد اس نے اپنے کان جیسے دہلیز پر رکھ چھوڑے تھے۔ ذرا سی کوئی آہٹ ہوتی اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ دیر تک وہ سائرہ بیگم کے ساتھ ان کے کمرے میں باتیں کرتی رہی صرف اسی امید پر کہ گھر آتے ہی وہ سیدھا ماں کے کمرے میں آتا تھا۔ آٹھ سے نو، نو سے دس اور دس سے گیارہ بجے تک سائرہ بیگم کو بھی نیند ستانے لگی۔ مجبوراً وہ انہیں سونے کی تلقین کر کے وہاں سے اٹھ آئی۔
ساحر صاحب بھی سو چکے تھے مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سارا گھر خاموشی کا قلعہ بنا جیسے اسے نگل لینے کے درپے تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے جس وقت وہ سردی سے کانپتی اپنے کمرے میں آئی تھی جانے سوزان کو کیا ہو گیا تھا وہ کیوں اتنا کٹھور بن گیا تھا۔ کروٹ کے بل لیٹی وہ کب اسے سوچتے سوچتے سو گئی اسے خبر ہی نہیں ہوئی ابھی اسے سوئے بمشکل پندرہ سے بیس منٹ ہی ہوئے تھے جب گاڑی کے ہارن نے لاشعوری میں بھی اسے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنے

پر مجبور کر دیا۔
سوزان گاڑی پارک کر کے لاؤنج میں آیا تو وہ سر پہ دوپٹا جماتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
"یہ کون سا وقت ہے گھر واپس آنے کا؟"
"تمہیں اس سے مطلب؟"
اسے اب تک اپنے گھر میں موجود اپنے لیے جاگتا دیکھ کر جانے کیوں اسے عجیب سی خوشی ہوئی تھی مگر اس نے ظاہر نہیں کی۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی بے حد تھکی ہوئی اور بوجھل تھیں۔ انجشا اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو سوزان؟ کوئی بات ہے کوئی گلہ ہے تو کھل کر کہو یوں اجنبی بن کر کیوں پیش آ رہے ہو میرے ساتھ؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئی اس نے اپنی طرف سے صلح کے لیے پہل کی تھی مگر سوزان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"سو جاؤ چپ چاپ جا کر، ایویں دماغ مت کھاؤ میرا۔"
اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ انجشاء اس کی اس درجہ بے گانگی پر شدید ہرٹ ہونے کے باوجود کچن میں چلی آئی۔
سائرہ بیگم نے بے حد لذیذ ساگ بنایا تھا۔ انجشاء کی جان تھی ساگ میں، اس کی خوشی کے لیے وہ ساگ بناتی تھیں۔ سوزان کو شروع میں ساگ پسند نہیں تھا مگر پھر انجشاء کے ساتھ اکثر لنچ اور ڈنر کرنے کی وجہ سے وہ بھی ساگ پسند کرنے لگا تھا۔ اس وقت بھی انجشاء نے اپنے اور اس کے لیے اکٹھا سالن نکالا پھر گرم گرم مکئی کی روٹی اور چائے بنائی۔ سوزان جب تک فریش ہو کر اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آیا وہ ٹیبل سیٹ کر چکی تھی۔
وہ حیران رہ گیا۔ اسے لگا شاید وہ اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر اپنے کمرے میں جا چکی ہو گی مگر...... وہ تو ٹیبل لگا کر بیٹھی تھی۔ اس کی پچھلے دو روز سے مری بھوک اچانک جاگ اٹھی تھی۔
"تم نے ناحق زحمت کی، میں اپنا انتظام خود کر سکتا ہوں۔" کرسی گھسیٹ کر دھیمے لہجے میں کہتے اس نے باور کروایا۔ انجشاء نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔
"جانتی ہوں، کوئی نئی بات کرو۔"
"نئی بات یہی ہے کہ تمہیں تو اس وقت اپنی امی ابو کے پاس اپنے گھر پر ہونا چاہیے تھا پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"تمہیں کوئی تکلیف ہے میرے یہاں ہونے سے بتاؤ؟"
"نہیں مجھے کیوں تکلیف ہو گی۔"
"جب کوئی تکلیف نہیں تو یوں اجنبی بن کر پیش آنے کا مقصد؟"
"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے، میں جیسے بھی پیش آؤں۔"
"فرق پڑتا ہے تبھی پوچھ رہی ہوں۔"
"کیا فرق پڑتا ہے؟"
"تمہیں نہیں پتا کیا فرق پڑتا ہے؟"
دونوں ایک دوسرے کے دل کا حال سمجھتے اور جانتے تھے مگر دونوں چھپ رہے تھے ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔
ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتے ہوئے سوزان نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔
"آنٹی کیسی ہیں؟"
"ٹھیک ہیں۔"
"اور تم؟"
"میں بھی ٹھیک ہوں۔"
"اچھی بات ہے۔"
"تم ٹھیک ہو؟"
اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی جواب میں سوزان نے لائٹ براؤن آنکھوں میں ہزاروں گلے سمیٹے طنز سے اس کی طرف دیکھا۔
"تم نے ٹھیک چھوڑا ہے مجھے؟"
انجشاء کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی مگر وہ اس

کے سامنے کمزور نہیں پڑی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے کیا کیا ہے؟"
اس کے الجھن بھرے سوال پر اسے ہوش آیا کہ کیا کررہا ہے تبھی سنبھل کر بولا۔
"بغیر کسی غفلت اور قصور کے تم نے سب کی نظروں میں مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ حالانکہ میں تمہیں بتا کر گیا تھا۔"
"میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔" وہ اب نظریں چرا رہی تھی۔ سوزان نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔
"ہاں تم نے کسی سے کچھ نہیں کہا مگر پھر بھی سب مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔"
"تو قصوروار تو تم ہو۔"
"کیوں؟ کیا میں نے تمہیں کہا تھا کہ بنا سوچے سمجھے اکیلی گاڑی بھگا کر لے جاؤ۔"
"کہا نہیں پر مجبور تم نے ہی کیا تھا۔"
"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟"
"نہیں۔"
"تو پھر ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔"
"جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔" "مجھے تم نے کہا تھا کہ دوست کی ماں کو دوائیوں کی ضرورت ہے انہیں دوائیاں پہنچانی ہیں مگر ہوا کیا؟ گیٹ میں جوان خوب صورت لڑکی کھڑی نظر آئی اور تم گھس گئے ان کے گھر میں، یہ سوچے بغیر کہ ایک جوان خوب صورت لڑکی تمہاری گاڑی میں بھی بیٹھی ہے جسے کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔"
"شرم کرو، اتنا بدکردار سمجھتی ہو تم مجھے کہ جہاں لڑکی دیکھی وہیں دل کا سودا کر دیا؟"
"خدا جانے، کوئی مجبوری تو ہو نہیں سکتی تھی ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور پھر گھر میں گھس کر بیٹھ جانے کی۔"
"کب ہنس ہنس کر باتیں کی میں نے؟ تم میرے بارے میں اتنا غلط کیسے سوچ سکتی ہو یار؟"
"ٹھیک ہے نہیں سوچتی میں غلط۔ تم بتا دو تم کیوں گئے تھے ان کے گھر میں، جبکہ اس وقت گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔"
"کوئی مرد نہیں تھا اسی لیے تو گیا تھا۔"
"شاباش ہے۔"
"پہلے پوری بات سن لیا کرو، پھر جتنا گھٹیا سوچنا ہو بیٹھ کر سوچتی رہا کرو۔"
"او کے۔"
"میں ان کے گھر میں شوق سے نہیں گیا تھا بلکہ اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے ڈرپ لگانی آتی ہے میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے ریکویسٹ کردی کہ اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب ہے اور گھر پر کوئی نہیں لہٰذا میں ڈرپ لگا دوں۔ صرف اس لڑکی کی بے بسی اور اس کی ماں کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے ڈرپ لگانے کی حامی بھر لی۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر پیچھے سے تم کوئی انوکھا ہی کارنامہ سرانجام دے بیٹھو گی۔"
اس بار سوزان نے واقعی اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ ایسی کوئی صورت حال ہو سکتی ہے یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ سوزان کو اس کی خاموشی سے تقویت ملی۔
"تم جیسی پاگل لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جن کی عقل کو ان کا شک دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے مگر اس سے وہ کسی کا نہیں صرف اپنا ہی نقصان کرتی ہیں۔ کتنی باتیں تھیں میرے دل میں جو تم سے شیئر کرنی تھیں مگر...... تم نے سب برباد کر دیا۔" اس بار خفگی سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
انجشاء شرمندہ سی بغیر کسی وضاحت کے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہ گئی تھی۔
☆☆☆
میرے ہم سفر تجھے کیا خبر؟
یہ جو وقت ہے کسی دھوپ چھاؤں کے کھیل سا
اسے دیکھتے، اسے جھیلتے
میری آنکھ گرد سے اٹ گئی

میرے خواب ریت میں کھو گئے
میرے ہاتھ برف سے ہو گئے
میرے بے خبر تیرے نام پر
وہ جو پھول کھلتے تھے ہونٹ پر
وہ جو دیپ جلتے تھے بام پر
وہ نہیں رہے، وہ نہیں رہے
وہ جو ایک ربط تھا درمیاں
وہ بکھر گیا
کسی شام ایسی ہوا چلی
کہ جو برگ تھے سرشاخ جاں
وہ گرادیے
وہ جو حرف دشت تھے ریت پر
وہ اڑادیے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشان پا بھی مٹادیے
میرے ہم سفر، ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
وہ ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
تو میرے سفر کا شریک ہے
میں تیرے سفر کا شریک ہوں
تو جو درمیاں سے نکل گیا
کسی فاصلے کے شمار سے
کسی بے یقیں کے غبار سے
کسی راہ گزر کے حصار سے
تیرا راستہ کوئی اور ہے
میرا راستہ کوئی اور ہے
میرے ہمسفر......!

''ایکسکیوزمی سر!''

اپنے آفس میں بیٹھا، نظریں مکمل انہماک سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جمائے وہ تیزی سے کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کررہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی توجہ کام سے ہٹانی پڑی۔

''لیس۔''

اس کے ''لیس'' کہتے ہی سیکریٹری فوراً اندر چلی آئی تھی۔

''جی......!'' ابرو اٹھاتے اس نے سیکریٹری سے مداخلت کی وضاحت مانگی تو وہ بولی۔

''سر! کوئی جبار صاحب ہیں، ایمرجنسی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ انہیں جنگل کی اہم معلومات سے متعلق فوری آپ سے بات کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھیجیں......''

اس کا موڈ آج صبح سے خراب تھا وجہ خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

اگلے دو منٹ کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا محنتی سا شخص اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

''جی جبار صاحب! حکم کریں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟''

''سر! شرمندہ نہ کریں، آپ تو رب کی رحمت بن کر اس علاقے میں آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے، مگر آپ بھی موقع ہی نہیں دیتے۔''

''آپ کی محبت ہی میرے لیے سب کچھ ہے جبار صاحب۔ خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی آپ نے کچھ بتانا تھا جنگل سے متعلق سب خیر تو ہے؟''

''جی سر! ابھی تک تو خیر ہے، مگر آگے خیر ہوتی نظر نہیں آرہی۔''

''کیوں، کوئی مسئلہ ہے؟''

''جی سر......''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں تفصیل سے سمجھاتا ہوں سر! میں اس علاقے اور جنگل کا پرانا مکین ہوں۔ میرے آباؤ اجداد کی عمریں بھی یہیں پوری ہوئیں۔ آپ کے آنے سے پہلے یہاں جو افسر کام کررہے تھے وہ اپنی

ملازمت سے مخلص نہیں تھے، اسی لیے انہوں نے اپنے عہدے کا سودا کرلیا۔ مطلب کچھ لوگ جن کے لیے یہ جنگل اور یہ وادی استعمال کی چیز تھی انہوں نے پیسے لے کر انہیں اجازت دی کہ وہ یہاں کے راستے کو استعمال کریں۔ یہاں سے قیمتی لکڑی چوری کریں اور اپنے غنڈے اوباش نوجوان یہاں جنگل میں پناہ گزین کریں۔ بات اگر یہاں تک رہتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر بات اب بڑھ گئی ہے سر......! وہ لوگ اب جنگل کے معصوم جانوروں کو پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ زیادہ تر نایاب پرندوں اور جانوروں کی تلاش میں رہتے ہیں اکثر کوئی لڑکی بالی کسی کام سے جنگل کا رخ کرے تو وہاں چھپے ان کے کارندے اسے پریشان کرتے ہیں زبردستی دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ہوں، کب سے ہو رہا ہے یہ سب؟"

"پچھلے تین چار سال سے۔"

"کوئی نقصان؟"

"دو لڑکیاں عزت سے ہاتھ دھو بیٹھیں، کئی قیمتی پرندے اور جانور پکڑ کر بیچ دیے گئے، سینکڑوں کے حساب سے کھڑے درخت گرا کر ان کی لکڑی شب کی تاریکی میں چوری کرلی گئی۔"

"ہوں، کچھ بتا سکتے ہیں کون لوگ ہیں یہ؟"

"جی سر! باہر کی پارٹی ہے، ایک لڑکا اسی علاقے کا مکین ہے وہی اس پارٹی اور یہاں کے فارسٹ آفیسر کے درمیان معاملات طے کرواتا ہے۔ بگڑا ہوا نواب ہے، باپ سنا ہے بہت نیک اور پرہیزگار انسان تھا مگر بیٹا اتنا ہی شیطان نکلا۔ کوئی غلط کام نہیں جو یہ نہ کرتا ہو، غریب لڑکیوں کو فون کالز پر پھنسا کر ان کے آگے سودے کر دینا، شراب خود بنا کر سپلائی کرنا، تمام بڑے مجرموں کو پناہ دینا، غرض کوئی ایسا غلط کام نہیں جس میں یہ ملوث نہ ہو۔"

"کیا نام ہے؟"

"سمعان احمد۔"

"عمر؟"

"یہی کوئی پینتیس سے چالیس۔"

"شادی شدہ ہے؟"

"جی سر، ابھی تین چار سال پہلے شادی ہوئی ہے مگر سنا ہے بیوی پر بھی بہت ظلم کرتا ہے۔"

"بچے؟"

"بچے نہیں ہیں سر۔"

"ٹھیک ہے، میری ملاقات سیٹ کروائیں اس کے ساتھ نہیں۔ فی الحال اس کا اعتماد جیت کر پھر چاروں شانے چت کریں گے اسے...... ابھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسے تو شاید پکڑ لیں مگر بغیر ثبوت کے نہ کوئی سزا دلوا سکیں گے نہ اس کے پھیلے ہوئے اڈوں تک رسائی ہو سکے گی۔"

"جی ٹھیک ہے سر! جیسے آپ بہتر سمجھیں۔" تابعداری سے کہتا جبار اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سوزان نے اس شخص کے خلوص اور اتنی اہم معلومات پر نہ صرف اس کا شکریہ ادا کیا بلکہ بھرپور محبت سے مصافحے کے ساتھ اس کا شانہ تھپک کر حوصلہ افزائی بھی کی۔

روکھی پھیکی بے مطلب سی زندگی کو ایک نیا عنوان مل گیا تھا۔ محبت میں نہ سہی کم از کم وہ اپنے فرض میں کامیاب ہو کر دنیا کو یہ ضرور دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ ایک بدقسمت ناکام شخص نہیں ہے مگر...... تقدیر شاید یہاں بھی اس پر مہربان نہیں تھی۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔ سوزان نے ایک نظر رسٹ واچ پر ڈالی پھر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ بالکل اچانک اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ ابھی آفس سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا جب ہادیہ کی کال آ گئی۔

"السلام علیکم۔" اپنی سیٹ سے اٹھتے اٹھتے اس نے اس کی کال پک کی تھی۔ جواباً وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

"وعلیکم السلام، کہاں ہو؟"

"اس وقت کہاں ہو سکتا ہوں سوائے آفس کے۔"

"ہاں یہ تو ہے؟ آج شام کے کھانے بارے کیا پروگرام ہے؟ کہیں باہر ڈنر کرو گے یا......؟"

"کیوں آج شام میں کوئی خاص بات ہے؟" آفس سے نکل کر وہ اب گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔ ہادیہ نے اس کی یادداشت پر ماتم کیا۔

"بالکل خاص بات ہے۔"

"کیا؟"

"جناب کی سالگرہ ہے آج۔"

"اوہ شٹ یار...... تم ہمیشہ یاد رکھتی ہو اور میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔" وہ خفیف سا مسکرایا تھا۔ دوسری طرف ہادیہ ہنس دی۔

"کوئی بات نہیں، بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"بڑے لوگ...... ہاہاہا...... اچھا مذاق ہے۔" اب کی بار وہ کھل کر ہنسا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

"کھانے کا نہیں بتایا تم نے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے یار، لیکن...... اگر کھانے کا بل تم ادا کرو تو میں کھانے کی حامی بھر سکتا ہوں۔"

"واقعی......!"

"بالکل۔"

"چلو ٹھیک ہے تم نکلو آفس سے، میں بس دس منٹ تک جوائن کرتی ہوں تمہیں۔"

"ٹھیک ہے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے تم سے۔"

"خیریت؟"

"ہاں ہاں خیریت ہی ہے تم پہنچو پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے میں معید کو بتا دوں، اس کی کال آرہی ہے۔"

"ہاں بتا دو...... ہونے والا شوہر ہے تمہارا، اتنا حق تو بنتا ہے اس بے چارے کا۔" گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ ہادیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ٹھیک ہے پھر، اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" کال منقطع ہو گئی تھی۔

اگلے پچیس منٹ کے بعد دونوں قریبی ریستوران میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔

"ہاں کہو، کیا بات ہے، کیا انجشاء کے متعلق کچھ......؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔" ہادیہ کی بات درشتی سے کاٹ کر اس نے رخ پھیر لیا تھا۔ اسے فوراً غلطی کا احساس ہو گیا۔

"پھر......؟" وہ قدرے شرمندہ ہوئی تھی مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر کرتی تو سوزان کی تکلیف مزید بڑھ جاتی۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ہوں میرے پیشے سے متعلق خاص بھی ہے۔" وہ اداس ہو گیا تھا ہادیہ کو افسوس ہوا۔

"ایسی کیا بات ہے؟"

"سوات جانا ہے کل مجھے اور تم میرے ساتھ چل رہی ہو میری منگیتر کی حیثیت سے۔" سوزان کا موڈ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔ ہادیہ ضمیر چوہدری کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"کوئی خاص وجہ؟"

"کسی کا اعتماد جیتنا ہے اس لیے۔"

"تمہاری جاب میں اس طرح کے ایڈونچرز کب سے شامل ہو گئے؟"

"ایڈونچر نہیں ہے یہ...... پلان ہے۔"

"کیسا پلان؟ کیا تم کھل کر کچھ بتاؤ گے؟"

"یار تم ہمیشہ بات کی جڑ تک کیوں پہنچنا چاہتی ہو، کبھی کسی بے ضرر انسان پر اعتبار بھی کر لیا کرو۔"

"اعتبار ہے تم پر، مگر تم جانتے ہو میں یہاں تمہاری مدد کے لیے آئی ہوں۔ اگر تم مجھ سے کچھ شیئر نہیں کرو گے تو میں کیسے کچھ کر پاؤں گی تمہارے لیے۔"

"فی الوقت ایسا کچھ نہیں ہے جو میں تم سے شیئر کروں۔"

"ٹھیک ہے نہ کرو شیئر کم از کم منگیتر بنانے کی وجہ ہی بتا دو۔"

"کوئی اعتراض ہے تمہیں میری منگیتر بننے پر؟"

"نہیں، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، البتہ معید

تو ہوسکتا ہے۔"
"اس کی خیر ہے اسے میں سنبھال لوں گا۔"
"جانا کہاں ہے؟"
"ایک رئیس زادہ ہے سمعان، بہت سے غلط کاموں میں براہ راست ملوث ہے۔ اسے اس کے غلط کاموں کی سزا دلوانی ہے۔ تمہاری مدد اس لیے چاہیے کیونکہ وہ شادی شدہ ہے اور تم اس کی بیوی سے دوستی گانٹھ کر کافی معلومات لے سکتی ہو۔"
"اس کی بیوی مجھے اس کے بارے میں معلومات کیوں دے گی؟"
"کیونکہ وہ خود اس کے ظلم کی شکار ہے۔"
"ہوں، چلو دیکھتے ہیں پھر، کل کیا ہونا ہے، بائی داوے نکلنا کب ہے؟"
"صبح نو بجے کے بعد۔"
"ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گی کوئی اور حکم۔"
"کھانا کھاؤ۔"
وہ خود کسی رئیس زادے سے کم نہیں تھا۔ ہادیہ اس کے حکم پر سر ہلا کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔
یونیورسٹی میں سوزان، معید، انجشاء اور وہ ایک ہی گروپ کا حصہ تھے۔ جب تک وہ لوگ یونیورسٹی سے منسلک رہے ان کے گروپ کو ہمیشہ رشک اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ معید اور اس کی منگنی یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی ہوگئی تھی جبکہ انجشاء اور سوزان کے درمیان ہمیشہ جھگڑے ہی رہے۔
اس وقت کھانا کھاتے ہوئے پرانے دنوں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں مسکراتی رہیں جبکہ سوزان اس سے قدرے بے نیاز، اپنی ہی تانے بانوں میں گم برائے نام کھانا کھا کر موبائل میں مصروف ہوگیا۔
کھانے کے بعد ہادیہ نے بل پے کرنے کے لیے پاؤچ کھولا تو اس نے اسے منع کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح خود ہی بل کی ادائیگی کردی۔
شام ریشمی آنچل کی طرح سرکتی جارہی تھی۔ ان دونوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ اگلا طلوع ہونے والا دن اپنے دامن میں ان دونوں کے لیے کیسا طوفان چھپا کر لا رہا ہے۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ وہ دونوں جس وقت سوات پہنچے، وہاں دھند اور برفیلی ہواؤں کا راج تھا۔ ہادیہ کی حقیقی معنوں میں قلفی جم گئی تھی مگر سوزان پر جیسے موسموں نے بھی اثر انداز ہونا چھوڑ دیا تھا۔ جینز کی بلو پینٹ اور سفید شرٹ میں ایک عام سی اونی جیکٹ کے ساتھ سارے راستے وہ بے نیاز بنا چلتا رہا۔
جبار صاحب نے اس کی سمعان احمد سے ملاقات طے کروادی تھی۔ اس وقت وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے اسے اپنے اعتبار کے شیشے میں اتارنا ہے جب ہادیہ نے اس کے خیالات میں خلل ڈالا۔
"قدرت نے اس علاقے کو بہت فیاضی کے ساتھ خوب صورتی سے نوازہ ہے...... ہے نا سوزان؟"
"ہوں۔"
"کتنے دن رکیں گے ہم یہاں؟"
"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا، سمعان احمد سے ملنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔"
"کیا وہ آرہا ہے ہمیں خوش آمدید کہنے۔"
"نہیں، اپنے خاص آدمی کو بھیجا ہے اس نے ہمیں ریسیو کرنے۔"
"اور وہ کہاں ملے گا؟"
"یہیں اسی وادی میں۔"
"یعنی کہ الرٹ ہوجائیں ہم۔"
"بالکل۔"
وہ گاڑی روک چکا تھا۔ ہادیہ نے پرس سے آئینہ نکال کر اپنا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔
وادی کمراٹ کا بے مثال حسن نگاہوں کو خیرہ کررہا تھا۔ وہ ابھی ارد گرد دیکھ رہی تھی جب ایک بلیک شیراڈ سست روی سے چلتی ان کے قریب آکر رک گئی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

سالگرہ نمبر

تہمینہ عباسی

چٹھی

اور پھر وہ ہو گیا جو کبھی عصمت آرا کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ ایسا زور آور جھٹکا...... ایسا تند و تیز دھکا لگا تھا کہ ان کی ذات کے مندر میں استادہ انا اور زعم کی مورتیاں لڑکھڑا کر منہ کے بل پر زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئی تھیں۔ جیت کا جھومر ہمیشہ اپنے ماتھے پر سجا کر رکھنے والی ملکہ کو بساط زندگی پر پہلی بار مات ہوئی تھی۔ مات بھی جیتی ہوئی بازی میں اور ایسی غضب ناک کہ اب کوئی بھی چال اس ہار کو دوبارہ جیت میں نہیں پلٹ سکتی تھی کیونکہ اس بار ان کے مقابل کوئی عام انسان نہیں، ان کا اپنا خون تھا...... ان کا سگا بیٹا......

☆☆☆

عصمت آرا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ڈھیروں مناجاتوں اور منتوں مرادوں کے بعد ماں باپ کو سُونے آنگنوں میں بہار بن کر آتے ہیں اور پھر اکلوتی اولاد ہونے کی حیثیت سے ان کی نوک زباں پر آنے والی ہر خواہش کو تکمیل ملنا لازمی سمجھا تا ہے۔ ”جب جو چاہا وہ پالیا“ کی اسی خوش نصیبی نے ہی عصمت آرا میں من مانی کی عادت کی بنیاد ڈالی تھی اور جب شریک حیات بھی ان کے حسن گلوسوز کا اسیر، ان کی ناز برداری اٹھانے والا ملا۔ اور سسرال کی بڑی بہو ہونے کی حیثیت سے معمولات زندگی میں ایک خاص مان، عزت و مرتبہ ان کی ذات کے لیے مخصوص بلکہ لازمی قرار دے دیا گیا تو دھیرے دھیرے یہی عادت ایک تکبر، خود پرستی اور خود غرضی میں بدلتی چلی گئی۔ دوسروں کے احساسات و جذبات کی پروا کیے بنا ہر فیصلہ اپنی مرضی سے اور اپنے مفاد میں کرنا ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا اور یہ کام وہ کچھ ایسی مہارت سے کرتیں کہ کسی کو ان کی رائے سے مخالفت کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔

سسرال میں مکمل راج گدی ملنے کی ایک وجہ یہ

بھی تھی کہ جس کاروبار پر ان کا شوہر کا کنبہ عیش کر رہا تھا اور جو عالی شان بنگلہ اس کنبے کا سائبان تھا، وہ ان کے شوہر ہی کی محنت مشقت کا ثمر اور ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ اس لیے عصمت آرا کی ساس اور دونوں دیور ان سے دب کر رہتے۔ اور ان کی ذات کے اسی دبدبے کا ہی اثر تھا کہ جب ان کے دیوروں کو رشتہ ازدواج سے منسلک کرنے کا وقت آیا، تب بھی ان ہی کی پسند کو فوقیت دی گئی۔ دونوں ہی دیورانیاں انہوں نے اپنی مرضی کے گھرانوں سے منتخب کیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس قدر اہمیت ملنے اور اس مان اور عزت افزائی پر وہ اپنے سسرالیوں کی مشکور ہوتیں لیکن اپنی فطرت کے زیر اثر انہوں نے الٹا ہی طریقہ اپنایا۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دونوں دیورانیوں کے سب ہی معاملات پر ان کا اختیار قائم رہے اور اس کوشش میں ان کے ہر فعل اور مسئلے میں بے جا مداخلت سے وہ ان کی زندگیوں کو اکثر مشکلات اور پریشانی کا شکار بنائے رکھتیں۔

منجھلی دیورانی صلح جو اور عاجزانہ طبیعت کی مالک تھی جو عصمت آرا کی ہر جائز ناجائز بات کو خاموشی اور صبر سے برداشت کر لیتی مگر چھوٹی دیورانی نے ان کے مزاج سے تنگ آ کر ایک بار ان کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت کر ڈالی اور اس کی اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے دیور اور ساس کی بار بار معذرت کے باوجود عصمت آرا نے اس جوڑے کو گھر اور کاروبار سے بے دخل کروا کر دم ہی لیا۔

جوان بیوی اور چھوٹی سی بچی کے ساتھ اپنے لاڈلے لخت جگر کے در بدر ہونے کا دکھ ان کی ساس کو اس قدر دل برداشت کر گیا کہ ان کی پیٹھ بستر سے جا لگی۔ ایسے میں عصمت آرا کے شوہر اور منجھلے دیور نے انہیں سمجھانے کی از حد کوشش کی کہ وہ چھوٹی دیورانی کو معاف اور ان سے صلح کر کے ان کو واپس آنے دیں مگر عصمت آرا اپنی انا اور ضد کی پکی تھیں، اپنے فیصلے پر اڑی رہیں یہاں تک کہ ساس ہی نے تھک کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

قدرت نے عصمت آرا کو ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ سالار اور سلوئی...... ان دونوں کے معاملے میں یوں تو ان کا رویہ روایتی ماں جیسا محبت اور شفقت سے بھرپور ہی تھا لیکن جب وہ دونوں شادی کی عمر کو پہنچے تو عصمت آرا کی حاکمیت پسندی اس معاملے میں بھی باقی ہر جذبے پر حاوی ہونے لگی۔

سلوئی شکل و صورت اور عادات میں کم و بیش ان ہی جیسی تھی، تھوڑی خود پسند اور مغرور لیکن سالار مزاج کا دھیما، دوسروں کا خیال رکھنے والا اور بے حد خوش اخلاق سا انسان تھا۔ ماں کی یہ خواہش پتا ہوتے ہوئے بھی کہ وہ سلوئی اور اس کی شادی اپنی مرضی سے کریں گی۔ وہ یونیورسٹی کی ایک کلاس فیلو کے آگے دل ہار بیٹھا مگر جب یہ بات عصمت آرا کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس لڑکی سے ملنے تک سے انکار کر دیا اور سالار سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بہو اپنی پسند سے لائیں گی اور اگر اس نے اب اس لڑکی سے رابطہ رکھا تو وہ اسے کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ان کی اس دھمکی کے جواب میں ایک فرماں بردار بیٹا ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تب تو اس نے ماں کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر لیا۔ ماں کی خوشنودی کی خاطر اس نے اپنی محبت سے بے وفائی کر ڈالی لیکن اس کی یہ فرماں برداری بغاوت میں تب بدلی جب عصمت آرا نے سلوئی کی شادی اپنے منتخب کردہ شخص سے کروائی۔

☆☆☆

"میں نے کل رات چھوٹے چچا مرحوم کی بیٹی جویریہ سے نکاح کر لیا ہے۔ وہی جویریہ...... جس کی طلاق ہونے میں اپنے مرکزی کردار کا قصہ آپ کچھ روز پہلے میرے سامنے بہت فخر سے سلوئی کو سنا رہی تھیں۔ سلوئی کی سوچ آپ کی سوچ سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس لیے اسے تو شاید آپ مجرم نہیں لگی ہوں گی لیکن ماما میں خود غرض ہوں، نہ ہی سنگ دل۔ اسی لیے یہ جان کر کہ کسی کی زندگی کی بربادی کی ذمہ دار میری ماں ہے، میرا ذہنی سکون تلپٹ ہو کر رہ گیا۔

ایک بار...... صرف ایک بار آپ کو پلٹ کر، جواب دینے پر آپ نے چچی کو عمر بھر کی قطع تعلقی کی سزا تو دے ہی دی تھی تو کیوں اس بیوہ عورت کی بیٹی کا گھر اجاڑ کر آپ نے ان سے دوبارہ انتقام لینا ضروری سمجھا؟ یہ مقدر کا فیصلہ تھا کہ بابا کے دوست کا وہ بیٹا جسے آپ سلوئی کا جوڑ سمجھتی تھیں، اسے اپنے والد کی اسٹوڈنٹ جویریہ پسند آ گئی۔ لیکن مقدر کے اس فیصلے کو بھی آپ نے چچی کی عداوت سمجھ کر ان سے انتقام لینے اور ان کو نیچا دکھانے کی ٹھان لی۔ آپ اپنی زباں سے اعتراف کر چکی ہیں کہ جویریہ کی ساس یعنی فیضان کی والدہ کو مہرہ بنا کر انہیں جویریہ سے متنفر کر کے کیسے آپ نے اس معصوم لڑکی کی زندگی عذاب بنائی یہاں تک کہ ساس اور بہو کے بیچ بھڑکنے والی نفرت کی آگ نے بالآخر فیضان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔

میں یہ بات شدید کرب کی کیفیت سے دوچار ہو کر لکھ رہا ہوں ماما۔ کہ اگر مجھے سلوئی کی شادی سے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو جاتی کہ آپ نے صرف اپنی انا کی تسکین کی خاطر جویریہ کی طلاق اور سلوئی کا فیضان سے نکاح کروایا ہے تو میں کسی بھی حد تک جا کے اپنی بہن کو آپ کے گناہ کا حصے دار بننے سے روک لیتا۔ صد افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکا۔ آپ کے گناہ نے مجھے کئی راتیں، کئی دن بے چین رکھا ہے ماما۔ اور اس اضطراب کو دور کرنے کا مجھے یہی حل نظر آیا کہ میں جویریہ سے شادی کر کے آپ کے اس گناہ کا کفارہ ادا کروں تاکہ آپ کے اس کیے سے سلوئی کی زندگی مکافات کا شکار نہ ہو۔ ویسے بھی اگر بیٹی کے لیے آپ ایک طلاق یافتہ مرد کو قبول کر سکتی ہیں تو ایک طلاق یافتہ عورت کا آپ کے بیٹے کی بیوی یعنی آپ کی بہو ہونا بھی آپ کے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں ہونی چاہیے۔

میں جویریہ اور چھوٹی چچی کو لے کر آپ کے شہر اور آپ کی زندگی سے دور جا رہا ہوں...... ہمیشہ کے لیے...... بابا کو میں سب کچھ خود بھی بتا سکتا تھا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے جرم کا اقرار آپ ان کے سامنے اپنی زبان سے کریں۔ اب کی بار اپنی فتح کو دہراتے ہوئے خوشی اور تفاخر کے بجائے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے کہ صرف اپنی ذات سے محبت کرنے والا انسان جب اپنے فائدے کے خیال سے کسی کو ضرر پہنچاتا ہے تو اس کی اس خود غرضی کا انجام کبھی نہ کبھی بہت بڑے پچھتاوے کی شکل میں ہی سامنے آتا ہے۔ اپنی آسانی کے لیے میرا یہ خط بابا کو دکھا دیجیے گا۔ مجھے امید ہے کہ سلوئی کی خاطر میری طرح وہ بھی آپ کے گناہ کے کفارے کا کوئی بندوبست کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

آپ کا بیٹا سالار......!"

قدرت خود پسند و خود پرست انسانوں کی انا کو اچھلنے کا خوب موقع دیتی ہے اور جب انا کا یہ اچھلنا اپنی پوری بلندی پر پہنچ جاتا ہے تو ایک ہی پٹخنی سے اسے ایسے زمین پر پچھاڑ دیتی ہے کہ ہر ضد، سارا غرور و تکبر خاک میں مل جاتا ہے۔ عصمت آرا پر ابھی قدرت کی اس پٹخنی کا وقت آ پہنچا تھا۔

ہاتھوں میں بیٹے کا خط تھامے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خط پر لکھی تحریر کو بار بار پڑھتے ہوئے انہیں اپنے اندر دھول ہی دھول اڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ بے یقینی کی دھول، شکستگی کی دھول......

انہوں نے ہمیشہ خود کو سب سے بہتر، برتر اور عقل کل سمجھا تھا اور یہی تکبر آج انہیں ایسے مقام پر لے آیا تھا جہاں ایک طرف اکلوتے بیٹے سے ہمیشہ کی دوری کی تکلیف تو دوسری جانب سب سچائی معلوم ہونے پر شوہر کی نظروں سے گرنے کی ذلت ان کا مقدر بنا دی گئی تھی۔ اور خود کو اس ذلت سے بچانے کی کوئی تدبیر ان کے پاس باقی نہیں بچی تھی، کیونکہ زندگی کے بہت سے موقعوں پر خود کو دوسروں پر غالب رکھنے کی خواہش میں غاصب بن کر اپنے جیسے انسانوں کی دل آزاری کا باعث بننے والی عصمت آرا کی انا کی اس شکست فاش کا انتظام خود قدرت نے کیا تھا۔ صرف ایک پٹخنی کے ذریعے۔

☆☆

سالگرہ نمبر

فرح بخاری

کنارِ خواب جو

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ خالی جیب منتشر دماغ لیے بنا سوچے مری کی کوسٹر میں بیٹھ گیا۔ مری میں ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذر اسے پہلے مہربان دوست کی صورت میں ملے، میاں جی کے توسط سے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔ ہوٹل کے مینیجر رفیق احمد کی بیٹی کنعان کالج میں پڑھتی ہے۔ ماضی کے کسی واقعے نے اسے محبت سے سخت بدگمان کر رکھا ہے۔ لیکن سوار سے پہلی ملاقات ہی اس کے دل کی دنیا کو پریشان کن حد تک تبدیل کر دیتی ہے۔

ثمامہ ایک طرح دار جوان بیوہ ہے۔ جس نے مرحوم شوہر کی جائیداد سے مری میں نیا فائیو اسٹار ہوٹل کھولا ہے۔ وہ بھی مری میں نو وارد ہے۔

شازمہ جس نئے محلے میں اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوئی ہے وہاں تنہائی اور اکیلا پن اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا کیونکہ شوہر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔
ثمامہ کو ہوٹل کے افتتاح میں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔

مکمل ناول

رفیق احمد کے پیر میں سیڑھیاں اترتے شدید فریکچر آ گیا۔ سوار نے ان کی بہت مدد کی۔ شازمہ کی محلے میں آمنہ بھابی سے دوستی ہوئی جو کہ مولوی فیض الحسن کی بہو ہیں۔
ثمامہ نے مری کے راستوں پر سوار کو دیکھا، یہ اس کا سوار سے دوسرا سامنا تھا اور معلوم نہیں کیوں لیکن وہ اسے بہت خاص لگا۔
کنعان کی رابعہ پھوپھو ان کے گھر آئیں تو کنعان کے پکائے بدمزا کھانوں کی وجہ سے دیا اور کنعان دونوں کا داخلہ کوکنگ اسکول میں کروا آئیں کنعان نے وہاں پر سوار کو دیکھ کر خوشی محسوس کی۔
سوار کی جاب از میر ہوٹل سے ختم ہوئی تو ثمامہ نے اسے ''پیٹران'' میں منیجر کی پوسٹ پر اپوائنٹ کر لیا۔ سوار علی پہلی ملاقات میں ہی اسے پسند آ گیا تھا۔
رفیق سر کی طبیعت خراب ہوئی تو سوار ہاسپٹل آیا۔ واپسی میں جس ٹیکسی میں وہ کنعان کو گھر چھوڑنے آیا اس کے ڈرائیور نے کنعان کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیں۔ کنعان نے اپنی صفائی میں اپنی بہن کی کہانی سنائی کہ کس طرح اس کی بہن نے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور کنعان اس کا پیچھا کر کے جس ٹیکسی میں واپسی اسے گھر لائی، وہ یہی ٹیکسی والا تھا۔ بہن کی شادی تو کر دی گئی لیکن امی نے مرتے وقت اس سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہو گی لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی۔
وقاص کی ملاقات شازمہ سے کاغان میں ہوئی جہاں اس نے شازمہ کو اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ وقاص نے اس کو اپنے شادی شدہ ہونے کا نہیں بتایا تھا۔ شازمہ کے باپ نے اس کا رشتہ اپنے جیسے سفید پوش گھرانے میں کر رکھا تھا جو اس کو پسند نہیں تھا۔ اسے وقاص اپنے خوابوں کا شہزادہ نظر آیا۔ کاغان سے واپس آنے کے بعد وقاص کی بات چیت شازمہ سے ہوتی رہی بالآخر ایک دن شازمہ اپنے گھر سے بھاگ کر وقاص کے شہر آ گئی۔ وقاص کے پاس سوائے اسے اپنانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔
شازمہ کو وقاص کی پہلی شادی کے بارے میں علم ہو گیا اور اس کی لڑائی وقاص سے ہو جاتی ہے۔
شازمہ نے آمنہ بھابھی کے دیور عبد الاعلیٰ سے جسے سب پیار سے آدی کہتے تھے، ٹیوشن پڑھانے کی درخواست کی۔ آدی رضامند تو ہو گیا لیکن شازمہ کی نگاہوں کے مبہم اور خطرناک پیغام کی وجہ سے وہ اس سے کترانے لگا تھا۔ لیکن شازمہ اسے گھر بلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال ہی لیتی تھی۔
ثمامہ سوار علی کی سالگرہ پر اسے زبردستی ڈنر پر لے آئی اور وہاں پر اس سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی۔
ثمامہ کو سوار کی کنعان سے محبت کا علم ہوا تو اس نے کنعان کو اغوا کروا لیا کہ اغوا شدہ کنعان اس کے دل سے اتر جائے گی۔ سوار کو کنعان کے اغوا کا علم ہوا تو اس نے کوشش کر کے کنعان کو اغوا کاروں کے چنگل سے نکال لیا۔
نویں قسط

گیارھویں قسط

''تم نے پہچانا تھا اس شخص کو؟'' دیا نے پانی کا گلاس کنعان کے منہ سے لگایا جو گرنے کے انداز میں پلنگ پر آ بیٹھی تھی۔ دونوں ابھی ابھی گھر پہنچی تھیں۔

''ہاں، یہ جمشید کا ساتھی تھا۔'' سوار نے اس کی ٹانگ پہ گولی بھی ماری تھی۔

''کیا سوار تب سے ان دونوں کے پیچھے ہے؟'' دیا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سوار وہاں کیسے موجود تھا۔

''معلوم نہیں۔ مجھ سے تو بھی ذکر نہیں کیا، لیکن سوار کا غصے سے تپتا چہرا بتا تا تھا جیسے اس کے لیے بھی سب کچھ اچانک کی بات ہو۔''

''ہوں۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔''

''تمہارا اس سب میں کچھ ہاتھ ہے۔'' سوار کی وہاں موجودگی...... کنعان نے اس بار مشکوک نظروں سے دیا کو دیکھا تو دیا نے بلا اردو کد اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا۔

''تمہاری قسم۔ مجھے کچھ نہیں پتا، نہ ہی میں نے

تم سے وعدے کے بعد کبھی سوار سے رابطہ کیا۔"

"سوری۔" کنعان شرمندہ ہوگئی۔ "میں ہم سب کے ایک ساتھ وہاں جمع ہونے پر حیران ہوں۔" اس نے اب اچانک کچھ یاد آنے پر ماتھا ہاتھوں پہ گرالیا۔ سوار کے آدم خان کے پیچھے دوڑتے دور سڑک پر غائب ہونے کا منظر بار بار آنکھوں کے آگے روشن ہونے لگتا۔

"سوار کی خیریت پوچھ کر بتا سکتی ہو؟" اس نے سر اٹھا کر منت بھرے انداز میں دیا کو دیکھا اور دیا کے لب بڑی دیر بعد پہلی مرتبہ مسکرائے۔

"تم خود بھی پوچھ سکتی ہو۔"

"پلیز دیا......" کنعان نے سر اٹھایا تو پانی بھری آنکھوں میں التجا تیر رہی تھی۔ "سوار کسی مشکل میں نہ ہو، معلوم نہیں وہ کتنے لوگ تھے۔ فی الحال اس کی خیریت جاننا ضروری ہے، اس نے ہماری وجہ سے خود کو مشکل میں ڈالا ہے۔"

"ہوں۔" دیا نے بھی اس بار بنا کچھ کہے نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگایا۔

"بیل جارہی ہے لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا۔" اس نے کنعان کی طرف دیکھا۔

"اللہ خیر۔" دل بری طرح دھڑکا اور چہرا مزید اتر گیا۔ سوچیں لمحوں میں نجانے کہاں تک ہو آئیں۔

"دوبارہ ملاؤ۔ پلیز......"

"اتنی جلدی کیا فائدہ، ابھی تو میں گھر کے لیے نکلتی ہوں۔" وہ ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکا کر جانے کے لیے تیار نظر آئی۔

کنعان کے پاس کہنے کو الفاظ ختم ہو گئے۔ وہ تو بس سوار کی آواز سن کر اس کی خیریت جاننا چاہتی تھی۔ ایک بار اگر دیا چلی گئی تو...... تو یہ کیسے ممکن ہوگا، وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ڈونٹ وری میں کوشش کرتی رہوں گی۔" دیا نے اس کا کندھا تھپک کر تسلی دی۔

"مجھے بتانا ضرور۔" وہ بے چینی سے دروازے تک چلی آئی۔

"ہوں۔" دیا نے دل میں کچھ سوچا لیکن ظاہر نہ کرتے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آدم خان اب مال روڈ چھوڑ کر نیچے بس اسٹینڈ کو جاتے راستے پر اتر چکا تھا، سوار اگرچہ ابھی تک اسے پکڑنے میں ناکام رہا تھا لیکن اس نے آدم کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا، درمیان میں زیادہ رکاوٹ لوگوں کی وجہ سے آرہی تھی لیکن اب وہ دونوں بینک والی جگہ بھی کراس کر گئے تھے۔ یہاں رش کم تھا اور بھاگتے بھاگتے سوار کو میاں جی کا خیال آیا۔ برف کی وجہ سے آدم روڈ کی صاف جگہ پر ہی دوڑے چلے جانے پر مجبور تھا۔ آس پاس سب پھسلن تھی۔ ڈھابا اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے سوچنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے دوڑتے دوڑتے موبائل نکال کر میاں جی کا نمبر ملایا جو خوش قسمتی سے دوسری بیل پر اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو سوار۔ کیسے......"

"میاں جی! رب نواز کو لے کر جلدی سے روڈ پر آئیں۔ بینک کی طرف سے آپ کو ایک لمبا اونچا آدمی بھاگ کر آتا ہوا دکھائی دے گا، اسے فوراً پکڑیں...... وہ جمشید کا ساتھی ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوں۔ جلدی......" سوار نے کال آف کرتے اسپیڈ تیز کر دی۔

اگلے موڑ کے بعد ڈھابا فوراً ہی آجاتا تھا۔ اگر میاں جی نے ذرا سی بھی دیر کر دی تو آدم خان نے وہاں سے بھی نکل بھاگنا تھا۔ لیکن صد شکر کہ موڑ کاٹتے ہی اسے رب نواز اور پیچھے میاں جی دکھائی دے گئے۔ اور آدم خان تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سامنے سڑک کنارے نارمل انداز میں کھڑے وہ دو شخص اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ سوار کے چنگل سے بچ نکلنے کے لیے تیزی سے اسی سمت رواں تھا اور جلد ہی رب نواز اور میاں جی کے شکنجے میں آگیا۔ دونوں نے اس کے سر پہ شال ڈال کر اسے دبوچ لیا تھا۔ اور جونہی سوار نزدیک آیا وہ تینوں اسے تقریباً اٹھا

کر ڈھابے تک لے آئے اور اسی پر اکتفا نہ کرتے اسے اندر کے چھوٹے کمرے میں بند کر دیا۔ سوار کی اپنی حالت بھاگ بھاگ کر غیر ہو چکی تھی۔ نڈھال سا چارپائی پر آکر بیٹھتے اب وہ آگے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

''اس لڑکی کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟''

سوار نے ریوالور اپنی انگلیوں پر گھماتے بوٹ کی ٹوہ آدم خان کے پیر پہ چبھوئی اور جواباً وہ کراہ کر رہ گیا۔ رب نواز اور میاں جی نے اسے ایک کرسی پہ باندھ کر بٹھا دیا تھا۔ بنا گولیوں کا ریوالور بھی سوار نے میاں جی سے حاصل کیا تھا محض آدم کو ڈراوا دینے کے لیے۔ آج تو اسے آدم خان سے بہت ساری باتیں پوچھنی تھیں۔ کنعان کو گھر واپس لانے کے بعد وہ بہت دنوں تک جمشید کو تلاش کرتا رہا تھا لیکن اس کے بس اسٹینڈ کے دوستوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ اس لیے سوار کو خاموش بیٹھنا پڑ گیا تھا۔ لیکن آج آدم کے ہاتھ لگنے پر یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے یونہی چھوڑ دیتا۔

''مجھے سختی پہ مجبور مت کرو آدم خان۔ میرے ہاتھوں ایک گولی تم اپنی ٹانگ پر کھا چکے ہو، آج اتنی مہلت بھی نہیں دوں گا۔ اور اب ایک نظر یہاں......''

سوار نے آگے بڑھ کر کھڑکی پہ پڑا موٹا پردہ ایک سائیڈ پر ہٹایا۔ ''اس جنگل اور اس گہری کھائی کو دیکھو آدم۔ بنا گولی وولی چلائے اگر ایک دھکا بھی دے دیا تو تمہاری یہاں چیخ بھی کسی کو سنائی نہیں دے گی، اس لیے شرافت سے بولتے جاؤ۔'' سوار نے پستول کی نال اس کی ٹھوڑی پہ رکھ کر دبائی۔

''پ...... پوچھو......'' آدم خان کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ وہ لوگ یقیناً اسے جان سے مار سکتے تھے، کم از کم کھائی دیکھنے کے بعد ضرور یہ خیال پختہ ہوا تھا۔

''کس کے کہنے پر یہاں آئے ہو اور اس لڑکی کا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔ جمشید کہاں ہے؟''

''نہیں...... میں کسی کے کہنے پر اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ میں تو یونہی شہر آیا تھا، اس لڑکی پر نظر پڑی تو تجسس سے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں اس کو پہچان چکا تھا بس اس لیے۔''

''بکواس مت کرو......'' سوار نے پستول چھوڑ کر ہاتھ سے اس کی گردن دبائی۔ ''خبردار جو مجھے جھوٹ سے بہلانے کی کوشش کی، سب کچھ سچ سچ بتا دو۔''

''دیکھو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم آرام سے میری بات سن لو، میں مری کسی اور کام سے آیا تھا، وہ لڑکی مجھے اتفاقاً نظر آ گئی۔''

''اتفاقاً نظر آ گئی، اور تم اس کا پیچھا کرنے لگے۔''

''ہاں، میں نے سوچا شاید یہ لڑکی اس میڈم کو پہچانتی ہو۔ جس نے جمشید کو رقم دی تھی۔''

''کون سی میڈم؟'' سوار بے طرح ٹھٹکا۔

''ارے، وہی عورت جس کے کہنے پر جمشید نے اس لڑکی کا اغوا کیا تھا۔'' آدم اس کی کم علمی پر ماتم کر رہا تھا جبکہ سوار کا سچ مچ دماغ گھن چکر بننے لگا کہ اب یہ کیا مسٹری تھی۔

''کون ہے وہ عورت؟''

''مجھے پتا ہوتا تو روزانہ اسے ڈھونڈنے یہاں آتا۔''

''اور تم اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟''

''جمشید نے ایک عورت کے کہنے پر اس لڑکی کو اغوا کرایا اور اغوا سے ملنے والی رقم اس نے جمشید کو معاوضے کے طور پر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب تم لڑکی کو چھڑوا لے گئے تو ہمیں تاوان کی رقم بھی اب نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے جمشید نے میڈم سے رقم مانگی، مجھے اس نے پچاس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگلے روز جب وہ مری رقم لینے گیا تو میں بھی چوری چھپے اس کے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ مجھے جمشید کی نیت پہ شک تھا۔ مجھے لگتا ہے اصل رقم زیادہ ملنی تھی اور جمشید نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''ہوں...... پھر......'' سوار کو اس کے لہجے میں سچائی نظر آ رہی تھی اور اب وہ آگے جان لینا چاہتا تھا۔

''میں جمشید کے پیچھے پیچھے مری تک تو آ گیا لیکن میڈم اور اس کے بیچ کیا باتیں ہوئیں، میں دور ہونے کی وجہ سے سمجھ نہیں سکا۔ وہ عورت برقع میں تھی۔ میں اسے دیکھ بھی نہیں پایا، اور جب میں دوسرے راستے سے ہو کر گھر پہنچا تو جمشید اپنے گھر والوں سمیت گاؤں کے لیے نکل چکا تھا۔ اس خبیث نے مجھے میرے پچاس ہزار بھی نہیں دیے، موبائل نمبر بھی بند کر دیا ہے اپنا۔''

''لیکن تم کہہ رہے تھے کہ تم اس عورت کو ڈھونڈنے روزانہ مری آتے ہو، جب دیکھا نہیں، نام نہیں جانتے تو ڈھونڈو گے کیسے؟'' سوار کو لگا وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔

''ہاں، میڈم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، بس اس کی کار دیکھی تھی غور سے، اسی کی تلاش میں آتا ہوں۔''

''اور...... کیا نشانی ہے اس کار کی؟'' سوار نے ابرو چڑھائے۔

''سفید رنگ کی کار ہے، ماڈل وغیرہ کی تو مجھے سمجھ نہیں آئی، نمبر بھی دیکھ نہیں پایا۔'' بس سامنے لگی چیزوں کو ہی غور سے دیکھ پایا۔

''اب یہ کیا بکواس ہے۔'' سوار سخت بدمزا ہوا۔ نہ نمبر معلوم تھا نہ ماڈل...... آخر یہ کون عورت تھی جو کنعان کی اس قدر دشمن تھی کہ اسے اغوا کروا لیا، اور اس نے یہ سب پیسے کے لالچ میں نہیں کیا تھا۔ مطلب وہ کنعان سے کوئی خاص دشمنی رکھتی تھی۔

''میں بھی کیا کروں، جمشید میری رقم کھا گیا ہے۔ اوپر سے اس عورت کے بارے میں بھی میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ برف کے موسم میں تو ہمارا بھی دھندا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ گھر میں چولہا تک جلنے کے لالے پڑ گئے۔'' آدم خان نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

سوار نے ایک گہرا سانس لیتے خود ہی اس کی رسیاں ڈھیلی کرنا شروع کر دیں۔ وہ تو خود مجبور تھا بے چارہ۔ سوار کی تمام تر توجہ بھی ''میڈم'' کی انٹری نے کھینچ لی۔

''اچھا اب رونا بند کرو، پچاس ہزار تو نہیں دے سکتا، یہ کچھ رقم، اپنے بچوں کے لیے رکھ لو۔'' سوار کی نرم طبیعت کو اس کا رونا گوارا نہ ہوا تو بٹوے سے رقم نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی اور آدم خان ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا وہ جو کچھ دیر پہلے اس پر پستول تانے کھڑا تھا۔

''میڈم مل گئی تو تمہارے پچاس ہزار بھی نکلوا لیں گے۔'' سوار نے اس مرتبہ مسکرا کر آدم کی طرف دیکھا تو آدم کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھری۔

''تم کیسے ڈھونڈو گے میڈم کو؟''

''انہی نشانیوں پر جو تم بتاؤ گے۔'' سوار اطمینان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو، اب کار تو سفید ہے۔ بڑی والی، سیٹیں نیلی تھیں۔ اور سامنے شیشے کے ساتھ ایک سفید بھالو لٹکا تھا اور بھالو کے ساتھ ایک ہاتھ کی مٹھی برابر سرخ رنگ کا وہ......'' آدم سوچنے لگا۔ ''وہ چھکا ہوتا ہے نا...... وہ تھا چمکیلے نقطوں والا۔ میڈم جب کار موڑ کر میرے بالکل قریب سے گزری تو میری آنکھوں میں بس وہ سفید بھالو اور سرخ چھکے کی چمک ٹھہر سی گئی۔ اس سے زیادہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کار کا نمبر یاد رکھنے کا جب تک مجھے خیال آیا کار بہت دور جا چکی تھی۔''

''اوکے۔ اب تم میڈم کے ملنے کی دعا کرو، میں یہاں کوشش کرتا ہوں۔ اور دیکھو، دوبارہ اگر اس لڑکی کے پیچھے جانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' سوار نے اس کے لیے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور وہ ہاں میں سر ہلاتے فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

''ارے۔ سوار......'' میاں جی بوکھلا کر سوار کے نزدیک آئے۔ ''یہ کیا کر دیا۔''

''پوچھ لیا جو پوچھنا تھا۔'' سوار لاپروائی سے باہر کھاٹ پر آ بیٹھا۔ اور میاں جی کو اب تک کی تفصیل بتانے لگا۔

''شاید کنعان کو کچھ اندازہ ہو کہ یہ میڈم کون ہو سکتی ہے۔''

''لگتا تو نہیں۔'' سوار نے کندھے اچکائے اور توجہ موبائل کی گھنٹی نے اپنی جانب مبذول کی۔ موبائل جیب سے نکال کر نمبر دیکھا اور آنکھوں میں اچانک ہاتھ آئی خوشی جیسی چمک ابھری، لب اپنے آپ مسکرا دیے۔

''بڑی لمبی عمر ہے۔'' میاں جی کی طرف دیکھ کر کہا اور کال اٹینڈ کرتے ایک سائیڈ پر چلا گیا۔

میاں جی بھی سمجھ گئے کہ کس کا نام ابھی کچھ دیر پہلے زبان پر تھا۔ درمیان میں پیش آئے کچھ اور سنجیدہ واقعات کی تو انہیں ابھی خبر ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ سوار میں انہیں اپنی شادی کے متعلق بتانے کی ہمت بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔

''جی؟'' لہجہ از حد سنجیدہ رکھتے اس نے نہایت اختصار سے کام لیا۔ ورنہ لب دبا کر مسکراتے وہ ابھی بھی اس ''پہل'' کے نشے میں سرشار لگ رہا تھا۔

''آپ...... ٹھیک ہیں؟'' کنعان کی باریک آواز میں بلا کی جھجک تھی۔ دیا کے چلے جانے کے بعد سے وہ مسلسل بے تابی سے اس کی کال کی منتظر تھی لیکن بہت دیر تک جب اس کی کال نہیں آئی تو اس نے خود ہی دیا کا نمبر ملا لیا لیکن نہ صرف اس وقت دیا کا نمبر بند ملا بلکہ لگاتار بہت دیر تک کوشش کرتے رہنے پر بھی یہی رسپانس ملا تو کنعان کو عجیب عجیب سے وہم ستانے لگے، اور پھر مجبوراً اس نے خود ہی اپنے موبائل سے سوار کو کال ملا لی۔

''مجھے کیا ہونا ہے۔ بندے تو آپ کے پیچھے لگے تھے۔'' وہ اسی سپاٹ بلکہ کسی قدر روکھے لہجے میں مخاطب تھا۔ ''دنیا سوار جیسوں سے بھری پڑی ہے محترمہ، منہ اٹھا کر کہیں بھی چل پڑنا ٹھیک نہیں۔''

''آپ کو اس کے پیچھے نہیں جانا چاہیے تھا۔'' کنعان کی آواز کچھ اور مدھم پڑ گئی۔

''بڑی مشکل سے ہاتھ لگا تھا۔ بہت سارے سوال پوچھنے تھے۔'' سوار نے ''میڈم'' کا خیال آنے پر بے ساختہ لب بھینچے۔

''وہ کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔''

''اپنے سے بڑے بڑے بدمعاش سے واسطہ پڑا تھا اس کا۔'' سوار نے برجستہ کہا۔

''آپ کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ اپنی بھرائی آواز اور آنکھوں میں آئے پانی پر قابو نہ پا سکی۔

''آپ حکم کریں۔ کیسی باتیں کروں؟''

''آپ کو میری خاطر کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

''یہ غیر اختیاری عمل ہے، سرزد ہوتا رہے گا، آپ کو ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، دیا نے مجبور کیا تو......''

''خوش نصیب ہیں وہ۔ جن کی آپ فرماں بردار ہیں۔'' وہ پھر بے ساختہ بولا تھا۔ جواباً وہ خاموش ہو گئی، شاید لاجواب۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی کا ایک وقفہ دونوں کے بیچ در آیا۔ اور پھر یہ وقفہ ذرا طویل ہو گیا۔ نہ وہ موبائل آف کر رہی تھی نہ سوار میں اتنی ہمت تھی

''کنعان......'' سوار نے نرم لہجے میں رسانیت سے اس کا نام لیا۔ وہ بھی اتنے دنوں بعد اس کے منہ سے اپنا نام سن رہی تھی۔ دل جیسے گہرائیوں میں ڈوبا، جواباً وہ جی تک نہیں کہہ پائی۔ پلکیں موندے، بس محسوس ہی کیے گئی۔

''آدم خان کہتا ہے تمہارا اغوا کسی عورت نے کروایا تھا۔''

''ہوں؟'' وہ ڈوب کر ابھری۔۔ سوار نے کیا کہا، سر پر سے گزر گیا۔

''یہ جمشید کا ساتھی ہے، جو ابھی تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ آدم خان۔'' سوار نے یاددہانی کے لیے

دہرایا۔ لہجے سے سمجھ گیا تھا کہ وہ کتنی غیر حاضر ہے۔
"اسی سے پتا چلا کہ تمہارے اغوا میں کسی عورت کا ہاتھ تھا۔"
"عورت کا......" وہ سمجھ کر مزید حیران ہوئی۔
"اس بارے میں سوچنا کنعان، وہ کون عورت ہوسکتی ہے جسے تم سے کچھ دشمنی ہے، اور وہ جمشید سے بھی واقف ہے، یعنی جمشید سے تمہاری رنجش سے بھی۔"
"آپ نے نہیں پوچھا آدم خان سے؟"
"اس بات کی تفصیل صرف جمشید کو معلوم ہے۔ آدم ناواقف تھا۔ بہرحال تمہیں کہیں آتے جاتے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، دشمن کا کچھ بھروسا نہیں۔"
"اب تو آپ کو بھی۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔
"کیا کروں گا اپنا خیال رکھ کر۔" اس نے ایک آہ بھری۔
"جس سے منسلک ہونے جارہے ہیں۔" کنعان کا لہجہ نہ چاہتے بھی جلن سے پُر ہو گیا۔
"پھر تو بالکل بھی ضرورت نہیں......" وہ ہلکا سا ہنسا۔ "شاید یوں جان چھوٹتی ہو۔"
کنعان بس لب چبا کر رہ گئی۔ بار بار سوچتی اس نے کال کیوں کرلی، پھر سوچنے لگتی بات کو طول کیوں دیے جارہی ہے اب اجازت کیوں نہیں لے لیتی، لیکن خود کو روک پائی تو بس یہیں تک کہ کبھی کبھی کسی بات پر بالکل چپ ہو رہتی۔
"میں کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا مری کہیں جانے بھی نہیں دیتا۔" وہ جیسے تھک ہار کر بولا تھا۔
"کیوں کیے ایسے فیصلے، جنہیں نباہ نہیں پا رہے۔"
"بس ہو گئے۔ بالکل بے ارادہ۔" وہ مکمل ہار مان گیا۔
"اور......وہ......" کنعان رُکی۔ "وہ خوش ہیں ثمامہ؟"
"ہوں۔ بہت زیادہ۔" وہ کسی لہر میں کہہ گیا۔
کنعان کا دل سلگنے لگا۔ دل میں آیا کہہ دے کہ مجھے تو بھری دنیا میں ایک یہی اپنی دشمن نظر آتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہہ نہیں پائی۔
"اور تم کنعان۔" وہ جیسے لمحوں کے زیر اثر آیا اور انہی لمحوں میں کنعان نے خود کو کسی گہرے اثر سے باہر نکالا، یہ وہ کیا کررہی تھی۔ بھولے عہد یاد آنے لگے۔
"میں خوش ہوں۔" وہ یک لخت سرد ہوئی۔ برف اگر پگھلنے لگی تو سب بہہ جائے گا۔ اور ایسا وہ ہرگز نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ "آپ نے جو فیصلہ کیا وہ بالکل درست ہے، پچھتاوؤں میں گھر کر کسی کا دل مت توڑیں، میں نے صرف یہ کہنے کے لیے کال کرلی کہ میری خاطر آپ کسی مشکل میں مت پڑا کریں۔ شاید میں ایک بھی اور احسان اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ویسے بھی آپ اگر میرے راستے میں آئیں اور یہ بات ابو کو پتا چل گئی تو معلوم نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچیں۔ بعض دفعہ ہمیں صفائی دینے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ باقی آئندہ کے لیے میں مزید محتاط رہوں گی، میری وجہ سے آپ کسی مشکل میں پڑے تو آپ سے زیادہ میں مشکل میں آجاؤں گی۔ آج کی مدد کے لیے بہت شکریہ۔ اللہ حافظ۔"
اس مرتبہ وہ بنا کسی وقفے اور کومے کے بولتی چلی گئی، آخر میں سوار کو جواب کی مہلت بھی نہیں دی اور کال آف کردی۔ سوار نے بھی کچھ دیر خاموشی سے اسکرین کو دیکھا پھر موبائل سائیڈ جیب میں رکھ لیا۔ اب شاید کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ابھی تو اسے میاں جی کو اپنے اور ثمامہ کے رشتے، حتیٰ کہ دو ہفتے بعد ہونے والی شادی کے متعلق بتانا تھا، اُن سے کچھ بعید نہیں تھا آگے سے جوتا ہی کھینچ مارتے......تو چلو یہ بھی سہی۔

☆☆☆

"سوار۔ آپ شام کو ایکسی آجائیں، بلکہ اب

تو روز ہی آجایا کریں، صبح بھی نجانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں دوپہر تک آپ کی راہ دیکھتی رہی۔" وہ بمشکل اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ثمامہ کی کال اور پھر عجلت بھرے احکامات نے آرام کا مزا ہی خراب کر دیا وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آج کے لیے تو بہت معذرت۔ دراصل سر میں بہت درد ہے، میں اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"اوہ۔ اچھا۔" وہ جو نجانے کیا کچھ سوچ بیٹھی تھی ایک دم مایوس اور ڈھیلی ہوئی۔ "امی پریشان ہو رہی تھیں کہ کام اتنے ڈھیر سارے پڑے ہیں اور دن اتنے کم......"

"تو آگے کر دیں۔" بڑا ہی بے ساختہ مشورہ پھسلا تھا سوار کے منہ سے۔ ثمامہ بس صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

"میرا مطلب ہے، کام تو مکمل ہو جائیں گے۔" سوار نے بات سنبھالی۔

"آپ آئیں گے سوار تو کام مکمل ہوں گے نا، بہت سے معاملات مشورے سے کرنے کے ہوتے ہیں۔" وہ نہ چاہتے بھی ہلکا سا شکوہ کر گئی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" سوار بھی قدرے شرمندہ ہو گیا۔ "اچھا کل کچھ کرتے ہیں۔"

"صبح ہوٹل تو شاید میں نہ آسکوں، بہت ساری شاپنگ کرنی ہے۔ آپ یوں کریں صبح میرے ساتھ ہی چلیے، کافی سارا کام کل ہی نمٹ جائے گا۔"

"ہوں صحیح۔" وہ ٹالنے کو عجلت میں بولا تھا۔ بالوں میں انگلیاں گھماتے اب وہ مکمل سونے کے موڈ میں تھا۔ اللہ جانے ثمامہ کو نیند کیوں نہیں آتی تھی۔ اب وہ باقاعدہ جمائیاں لینے لگا تو ثمامہ کو بھی اجازت لینا ہی پڑی۔ وہ سچ مچ اسے سننے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

تیسری اور پھر چوتھی برف باری نے مری کو مکمل ڈھک دیا تھا۔ سیاح مال روڈ پر امڈے پڑے تھے۔ سوار کو رش میں سے کار گزارنا دشوار ہو رہا تھا۔ شکر ہوا کہ ٹریفک وارڈن نے ایک خاص حد سے آگے کار لے جانے سے منع کر دیا تھا۔ اب برف باری میں کاروں موٹروں کی کیا مجال کہ مال روڈ پر چڑھ دوڑیں۔

سوار تو ثمامہ سے پہلے بھی یہی کہہ رہا تھا کہ پیدل جانا چاہیے لیکن وہ ٹھنڈ کی وجہ سے کترا رہی تھی۔ سوار کے اندر غصے کا ابال آیا، اب اتنی ہی خائف ہیں ٹھنڈ سے تو برف کے سیزن میں شادی رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مارچ اپریل تک انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب تو خیر لے دے کہ ٹوٹل آٹھ دن ہی بچے تھے، اتنے سے دنوں میں کیا خاک موسم نے بدلنا تھا۔

وہ کار کو پیچھے ایک جگہ پارک کر کے پیدل نیچے اتر آئے۔ ثمامہ اپنا پرس سنبھالتی اس کے پہلو میں آئی۔ سوار کے صبیح چہرے پر ہلکی سی نگاہ تشویش کی ڈالی۔ لائٹ براؤن شرٹ کے اوپر اپنی مخصوص بلیک لیدر جیکٹ پہنے وہ معمول سے کہیں زیادہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا، داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بجائے کنگھی کرنے کے غالباً انگلیوں سے ہی سدھار لیے گئے تھے۔ سوار علی کا مخصوص نجل، نفیس انداز آج کل کہیں دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ حالانکہ اسے تو ہمیشہ نک سک سے تیار ہوئے ہی دیکھتی آئی تھی لیکن جو سوار اب سامنے ہے۔ وہ ذرا کی ذرا دل میں خوف زدہ ہوئی۔ وہ اگر اس کے ساتھ سے خوش نہیں تھا تو آنے والا کل۔ نہیں...... اس نے سر جھٹک کر خود کو تسلی دی۔ اتنی پرفیکشن بھلا کس کی لائف میں ہوتی ہے۔ پھر اصل خوب صورتی تو "رشتے" کی ہوتی ہے، ہفتے بھر بعد جب وہ محبوب شوہر کے ساتھ پورے حق سے موجود ہوگی تو ناممکن ہے کہ وہ تب بھی ایسا دکھائی دے۔ پھر کوئی کتنا پتھر کیوں نہ ہو۔ محبت ملنے پر موم سا پگھلنے ہی لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے ہی سہی، پر وہ اسے اسیر کرنے میں کامیاب ہو ہی جائے گی۔

"سوار۔" وہ چلتے چلتے چونک کر رکی، پہلو میں

دیکھا۔ سوار ساتھ نہیں تھا۔ گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہ اس سے چھ سات قدم دور جا چکا تھا۔ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

''کاشی...... کاشی......'' جانے کون تھا، جس کو دیکھ کر سوار دیوانہ وار بھاگا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد ثمامہ نے سوار کی عمر کے ایک لڑکے کو بڑے جوش اور خوشی سے اس سے بغل گیر ہوتے دیکھا۔

''ارے۔ آدی...... تم...... مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں ہو رہا۔'' لڑکا اپنی پلکیں جھپکتے حیرت بھری خوشی سے سوار کو دیکھ رہا تھا اور حالت تو سوار کی بھی کم غیر نہیں تھی۔ کاشی کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لیے وہ ابھی تک بے یقینی سے اسے تک رہا تھا۔ چہرا بھی کیسے یک لخت چمک اٹھا تھا۔ یہ وہ سوار تو ہر گز نہ تھا جو دس پندرہ منٹ پہلے اس کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تھا

''کب آئے مری؟ کس کے ساتھ ہو؟ اور...... اور کہاں رُکے ہو؟'' سوار بنا ہجوم کی، بنا ثمامہ کی پروا کیے ایک بس کاشی کی طرف متوجہ تھا، وہ بھی دل وجان سے۔

''یار! آفس کے کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں۔''

''نوکری لگ گئی تمہاری۔ واہ مبارک ہو۔'' سوار خوشی سے چہکا۔

''اچھا چلو نا میرے ساتھ۔ اور دوست...... وہ کہاں ہیں تمہارے؟'' سوار نے آس پاس دیکھا۔

''وہ سب ہوٹل میں ہیں۔ فی الحال یونہی اکیلا نکلا تھا۔''

''تو چلو آؤ، پھر میرے ساتھ۔'' سوار نے اس کا بازو کھینچا۔

''لیکن تم......'' کاشی نے اس کی عجلت نظر انداز کرتے ہاتھ پکڑ کر روکا۔ ''تم یہاں کیسے؟ گھومنے آئے ہو؟''

''ارے نہیں۔'' سوار ہنس پڑا۔ ''آج کل مری میں میزبان ہوں۔ آپ جیسوں کی مہمان نوازی پہ مامور۔'' سوار نے ہنس کر ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ ''تب سے یہیں ہوں۔''

''سوار۔ آپ چاہیں تو اپنے دوست کو ہوٹل لے چلیں۔'' ثمامہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے خود آگے آنا پڑا۔ ان کی باتیں تو کیا ختم ہوتیں، لگ رہا تھا شروع ہی اب ہوئی ہیں۔ سوار بھی خجل سا ہو کہ ہنس پڑا۔ ثمامہ کو وہ واقعی بھول چکا تھا۔

''یہ ثمامہ جی ہیں، ہمارے ہوٹل کی مالکن۔ میں ان ہی کے ہاں منیجر ہوں۔'' سوار نے کاشی سے اس کا تعارف کچھ اس انداز میں کروایا کہ ثمامہ حیرت اور افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ نگاہوں میں مچلتا اس کا خاموش شکوہ سوار نے بڑی شدت سے محسوس کیا لیکن دانستہ نظریں چرا لیں۔

''تو واپس چلیں؟'' ثمامہ نے یاد دلایا۔

''اور آپ کے کام میم؟''

''کوئی بات نہیں، سیکنڈ ٹائم دیکھ لیں گے۔ آیئے واپس گاڑی کی طرف چلتے ہیں۔ ویسے بھی رش کافی زیادہ ہے۔'' وہ ان سے پہلے ہی آگے آگے بڑھ گئی اور اب وہ تینوں واپس ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

''میڈم۔ یہ میرا جگری دوست کاشف ہے۔ ہم ہری پور میں ایک ساتھ رہتے تھے۔'' سوار نے بیک ویو مرر میں دیکھ کر ثمامہ کو بتانا شروع کیا اور میڈم کا لفظ ثمامہ نے کڑوی گولی جیسا اندر اتارا، سوار تو پل میں یوں ہو گیا تھا جیسے اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھا ہو۔ خوشی سے دمکتے چہرے پر اب صرف ''ہری پور'' درج تھا۔ مری تو جیسے کسی نے سلیٹ پہ اسفنج مار کر مٹا دیا ہو۔

''اباجی کیسے ہیں کاشی، اور عمار بھیا؟''

''سب ٹھیک ہیں آدی۔ اپنی اپنی اسی پرانی جگہ پر۔ اب گیارہ ماہ میں بھلا زیادہ کیا بدلا ہوگا۔'' کاشی نے دوستانہ رنگ میں سوار کی ٹانگ کھینچی، لیکن سوار نے حیرت آمیز خوشی سے کاشی کی طرف دیکھا، جس نے روانی میں گیارہ ماہ کہہ کر سوار کو اندر تک پرسکون کر دیا تھا۔ مطلب پیچھے والے بھی حساب

رکھے ہوئے تھے۔ اس سے جدائی کا۔ وہ سب پیٹرا ان کی پارکنگ میں آچکے تھے۔ ثمامہ سب سے پہلے کار سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ سوار کاشی کو لیے ہال کمرے میں آیا لیکن یہاں کارش دیکھ کر اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آبیٹھا۔

"اور...... آمنہ بھابی کیسی ہیں؟" عجیب گم صم لہجے میں جیسے بہت دل سے پکارا تھا۔ آنکھوں کے پردے پر وہ ماں کی صورت اتر آئی تھیں۔ ایک بچے کی طرح اس کا خیال رکھنے والی، مشکل میں آڑ بن کر سامنے کھڑی ہونے والی۔

"بھابی بھی ٹھیک ہیں آدی۔ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ بہت زیادہ...... اور میرا دل چاہ رہا ہے، ابھی کے ابھی سب کو کال کر کے تمہارے مل جانے کی اطلاع کر دوں۔"

"کسی کو کیا فرق پڑتا ہے کاشی۔ وہ سب تو فاتحہ پڑھ چکے اس نافرمان پر۔"

"نہیں آدی۔ تم کچھ نہیں جانتے۔" کاشی نے تڑپ کر اس کا ہاتھ پکڑا، لہجے میں عجلت سی در آئی تھی۔

"تمہارے اباجی، عمار بھیا سب مہینوں سے تمہاری تلاش میں ہیں۔"

"کیا پولیس تنگ کر رہی ہے ان کو؟" سوار کے لہجے سے حقیقی پریشانی جھلکی، اب بھلا اس کی تلاش میں پریشان پھرنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

"تم بھی اپنی جگہ ٹھیک ہو آدی۔" کاشی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "وہ وقت ہی ایسا تھا۔ اس رات اور ان بعد کے دنوں کی طرف مڑ کر دیکھیں تو نری کڑواہٹ گھلتی ہے اندر۔ تمہارے چلے جانے کے بعد بہت برا وقت دیکھا ہے تمہارے گھر والوں نے۔ پولیس دندناتی ہوئی تمہارے گھر میں داخل ہو جاتی تھی۔ عمار بھائی کبھی تھانوں کے چکر، کبھی بڑے لوگوں سے ملاقاتیں کر کے معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ مولوی صاحب نے مسجد جانا تک چھوڑ دیا تھا۔ صبح کے گئے اندھیروں کے وقت کہیں گھر واپس آتے، جیسے محلے میں کسی کو فیس نہ کرنا چاہتے ہوں۔ بڑے دنوں تک علاقے کے گھروں، تکڑ، چوک اور گلیوں میں تم دونوں کے حوالے سے چہ میگوئیاں سنائی دیتی رہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں...... اور دور کیوں جاؤں۔" کاشی نے ایک آہ بھر کر کرسی سے پشت ٹکائی۔ "بھلے تمہارے اس دوست نے تمہیں تکڑ اور چوک پر موضوع تو نہیں بنایا لیکن بدگمان تو میں بھی ہو گیا تھا۔"

"تو کیا غلط کیا میرے دوست۔" سوار نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ "تم مجھ پر تھوک کر بھی چلے جاتے تو میں اسی لائق تھا۔ اپنا بویا ہی کاٹا ہے۔ اب زمانہ پیچھے قاتل سمجھے، بدکار کہے حق بجانب ہے۔"

"لیکن قاتل تو اپنا جرم قبول بھی کر چکا۔" کاشی نے بڑے آرام سے جھٹکا دیا۔ سوار نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"یعنی؟"

"ثنازمہ جیل میں ہے آدی۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیا ہے۔" کاشی جو اتنی دیر سے تمہید باندھے ہوئے تھا تو لب لباب یہ تھا۔ سوار بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ثنازمہ جیل میں تھی۔ سن کر کیسا لگا؟ مختصراً ڈھیر ساری تسکین۔

"وقاص بھائی کا جنازہ ان کے بڑے بھائی کے گھر پر ہوا تھا۔ ثنازمہ اس سے اگلے روز ہی یہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ سب کا گمان تھا کہ تم دونوں کہیں ایک ساتھ ہو۔ لیکن قریب پانچ ماہ بعد عثمان چچا کو وہ مانسہرہ میں نظر آئی، وہ بھی کسی اور آدمی کے ساتھ۔ اس آدمی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ ایک ہوٹل کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ عثمان چچا کی آمد کے بعد یہ خبر بھی آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی کہ تم اور ثنازمہ ساتھ نہیں ہو۔ اور پھر اس واقعے کے قریب تین ماہ بعد کی بات ہے کہ پولیس نے عمار بھیا کو پولیس اسٹیشن بلوا بھیجا۔ ثنازمہ لاک اپ میں تھی، عثمان چچا نے اسے جس آدمی کے ساتھ دیکھا تھا۔ ثنازمہ اسے

قتل کرتے رنگے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھی۔ وقاص کی موت کے بعد شازمہ نے اس سے شادی کر لی تھی اور اب نجانے کیا اختلافات تھے کہ اسے بھی جان سے مار دیا۔ شازمہ کی ذہنی حالت مزید ابتر ہو چکی تھی۔ وقاص کے قتل کا قصہ اس نے تفصیل سے خود ہی بتا دیا کہ کیسے اس نے عبدل کو دھوکے سے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اپنی حفاظت کے بہانے عبدل سے مولوی صاحب کا پستول منگوایا اور جب عبدل سے وقاص کو مارنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر اس نے پہلے وقاص کے سر پر اسٹول مارا اور پھر گولی بھی خود چلائی۔ اسٹول پر فنگر پرنٹس بھی صرف شازمہ کے تھے۔ اور ڈاکٹرز کے مطابق اس کا زیادہ خون سر کے زخم کی وجہ سے بہا تھا۔

عمار بھائی کو پولیس چونکہ مہینوں سے پریشان کر رہی تھی تو معمہ حل ہو جانے کے بعد ان کا مطلع کرنا بھی ضروری تھا۔ عمار بھائی نے خوشی خوشی آ کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔ محلے والے تو بڑے ٹائم سے مولوی صاحب کو امامت کے لیے بلا رہے تھے، وہی ان کی بات ماننے سے انکاری تھے۔ جب پولیس نے تمہیں بے قصور ٹھہرا دیا تو محلے والے گھر آ کر مولوی صاحب کو کندھوں پر اٹھا لے گئے۔ مولوی صاحب بھی اس روز بہت خوش تھے آدی۔'' کاشی کچھ یاد کر کے مسکرایا۔

''میں نے اس روز تمہارے اباجی سے نماز کے بعد پوچھا کہ کیا انہوں نے تمہیں معاف کر دیا تو جواب میں انہوں نے کہا کہ میرا دل پہلے ہی گواہی دیتا تھا کہ میرا سوار بھی قاتل نہیں ہو سکتا، وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔''

''لیکن غلط تو......'' سوار نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ اس سے پہلے ہی کاشی نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بس۔'' وہ تنبیہی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ ''ہر بات زبان سے کہنا ضروری نہیں ہوتا، کچھ راز سینے میں دفن کر لینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ آمنہ بھابھی نے سب سے کہا کہ عبدل اُن کی اجازت سے شازمہ کو پڑھائی میں کچھ ہیلپ دینے جاتا تھا اور اس کے شوہر کو بھی اس بات کا پتا تھا، اس لیے ان دونوں کے بیچ کسی ایسے تعلق کے بارے میں سوچنا غلط ہے۔ اور سنو آدی۔'' کاشی نے گمبھیر سنجیدگی سے سوار کو شانوں سے تھام کر اپنی جانب کیا۔

''جب وہ اوپر والا، خود ہی کچھ باتوں کا پردہ رکھ لیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ بندہ بھی اسے اچھال اچھال کر اپنی معافی کی راہیں خود پر مسدود نہ کرے۔ یہ معاملہ بھی اب تمہارے اور تمہارے رب کے بیچ رہ جانا چاہیے۔ اللہ کی اتنی بڑی کائنات کا یہ کیا ایک ہی راز ہے جو دنیا کے سامنے آنے سے رہ گیا۔ اور اگر جو نہ آیا تو دنیا کسی بڑی قیامت سے ٹکرا جائے گی۔ ہمارے آس پاس بستے لاکھوں کروڑوں لوگ نجانے کیسے کیسے راز صرف اسی لیے دنیا سے چھپائے پھر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کا پردہ رکھا ہوا ہے۔ ورنہ سوچو کہ اس دنیا میں کیا کیا نہیں ہوتا، ہاں بس اللہ ضرور ہمیں بخش دے، دنیا تو کبھی راضی نہیں ہوتی۔'' کاشی فلسفہ جھاڑتے کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا۔ سوار کے بے ساختہ قہقہے نے اسے بریک لگانے پہ مجبور کیا۔

''تھینکس کاشی۔ ویسے راز کو لپیٹ کر اندر کہیں رکھ لینے کی صلاح مجھے دوسری مرتبہ مل رہی ہے، اور وہ دوسرے پیر و مرشد یہیں مری میں گوشہ نشین ہیں۔ سچ کہوں تو ویسے جھوٹ پر اکسانے والے ایسے ہمدرد دوستوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔''

وہ شرارت سے مسکرایا تو کاشی نے سائیڈ ٹیبل سے گلدان اٹھا کر لہرایا۔ دونوں ہی اب اونچا اونچا ہنسے جا رہے تھے۔ کاشی کو سوار کے مل جانے کی خوشی تھی تو سوار کو بہت سارے بھاری بوجھوں سے ایک ساتھ نجات مل جانے کی خوشی تھی۔ بڑی دیر بعد حال میں واپس آنے کے بعد ایک درد البتہ بڑے زور سے اندر کانٹے جیسا چبھا تھا۔

اے کاش کہ ان حقیقتوں سے کچھ دن پہلے پردہ اٹھ گیا ہوتا۔ کاش اگر اسے کچھ دن پہلے مل گیا ہوتا تو وہ اسے ساتھ لیے سیدھا ازمیر ہوٹل چلا جاتا۔ رفیق سر کی بدگمانیاں ان کے شکوے کاشی کی زبانی دور کرواتا۔ اگر پھر بھی یقین نہ کرتے تو انہیں ساتھ لیے ہری پور چلا جاتا، اور جب ابا جی پیار سے ماتھا چوم کر اسے گلے سے لگاتے تو رفیق سر کے سارے خدشے ڈھل جاتے۔ لیکن اب...... اس نے پیٹرا ان کے اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ ثمامہ ابراہیم سے کیا وعدہ اس کے پاؤں کی بیڑی بن گیا تھا۔ اور اپنی نظروں میں وہ لاکھ برا سہی، پر بدعہد کبھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

صدیق نے کچھ دیر رک کر رفیق سر کے معمولات کا جائزہ لیا۔ قاسم دوسری منزل کے خالی رومز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانے گیا تھا۔ عصمت اللہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ فی الحال کچھ دیر وہ اور سر یہاں اکیلے تھے۔ ریسیپشن پر آنے جانے والوں کا رش بھی نہیں تھا۔ اسے لگا بات کرنے کا اس سے بہتر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔

"سر! یہ پارکنگ ایریا کے باہر بلو کار دیکھ رہے ہیں۔" سائیڈ ٹیبل پر کمپیوٹر آن تھا۔ اس نے مونیٹر کی طرف اشارہ کرتے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "سر، اس بندے نے عادت ہی بنا لی ہے، اپنی کار یہاں پارک کرنے کی۔ ہماری پارکنگ میں داخل ہونے والوں کو کافی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور سر! صاف نظر آتا ہے یہ آدمی تنگ کرنے کی نیت سے ایسا کرتا ہے۔ ورنہ دیکھیں آگے کھلی جگہ موجود ہے۔"

"ہوں۔" رفیق سر بغور اس کار اور جگہ کو دیکھتے سوچ میں پڑ گئے۔ "تنگ کرنا تو وجہ نہیں ہو سکتی، یونہی کوئی لاابالی سا جوان ہوگا۔ آرام سے سمجھا لیں گے۔"

"آپ کو نہیں پتا سر۔ لوگوں کے اندر رنجانے کیا کچھ چل رہا ہوتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ہمیں ہوٹل کے اندر آنے والوں کی بھی اب کڑی نگرانی کرنا ہوگی، بنا سامان وغیرہ کی جانچ کیے ہم کسی کو بھی کمرا دے دیتے ہیں۔ سر! یہ سیکیورٹی رسک ہے سر۔" صدیق ذرا زیادہ جذباتی ہو گیا۔ رفیق احمد مسکرانے لگے۔

"اچانک اتنی فکرمندی، خیریت تو ہے۔"

"آپ کو یاد ہے سر۔ پچھلے دنوں مولانا ٹائپ ایک اونچا لمبا آدمی ہوٹل میں آیا تھا۔ آپ نے بعد میں بتایا تھا کہ وہ سوار کا والد تھا۔" صدیق نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں ہاں یاد ہے۔" رفیق احمد اس آدمی کے ذکر پر اپ سیٹ سے ہو گئے۔

"سر۔ وہ آدمی سوار کا والد نہیں تھا۔"

"کیا مطلب...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ان کے ابرو ایک دم کھنچ گئے۔ صدیق کی تمہید بھی اب کچھ مشکوک لگنے لگی اس لیے لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔

"سر۔ اس دن مال روڈ پہ سوار سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے والد صاحب کے آنے کا تذکرہ کیا، باتوں باتوں میں ان کا حلیہ ڈسکس ہوا تو سوار نے کہا کہ یہ ان کے ابا جی کا حلیہ نہیں ہے، وہ تو ایک بھاری جسامت اور میانہ قد کے مالک ہیں، جبکہ یہ آدمی تو اونچا لمبا اور کمزور سا تھا۔ سر! اس آدمی نے آپ سے کیا باتیں کی تھیں، کیا آپ کو لگتا ہے وہ ایک مشکوک آدمی ہو سکتا ہے؟" صدیق اس لمحے بالکل انجان بنا ان سے استفسار کر رہا تھا کیونکہ ظاہر ہے رفیق احمد نے اپنی اور اس کی باتوں کی تفصیل صدیق سے ڈسکس نہیں کی تھی۔

"لیکن کوئی جعلی شخص میرے پاس آ کر جھوٹ کیوں بولے گا؟" وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھے۔

"سر۔ میں سوار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جھوٹ ہرگز نہیں بولتا، کچھ نہ بتانا چاہے تو خاموش رہنا اور بات ہے۔ پھر جھوٹ بھی اپنے والد سے متعلق، ناممکن سر۔" صدیق نے بھی آج جیسے قسم کھائی تھی اپنا مدعا بیان کرنے کی۔ رفیق احمد بالکل خاموش ہو گئے۔ صدیق انہیں سوچتا چھوڑ کر خود بھی

قاسم کے پیچھے چلا گیا۔ دل میں یہ دعا کرتے کہ کاش سوار سے متعلق ان کی سوچ اب مثبت سمت میں سفر کرے۔ بنا سوار کے علم میں لائے اس نے ایک چھوٹی سی کوشش کی تھی۔ آگے تو بس اللہ پاک سے کرم کی امید تھی۔

☆☆☆

"کنعان بیٹا کھانا پھر آدھا چھوڑ دیا۔" اماں نے ٹرے کی طرف دیکھ کر دوسری نظر کنعان کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔

"چھٹیوں کے بعد بچے کیسے صحت مند اور تروتازہ ہو کر اسکول کالجوں کو جاتے ہیں۔ ہفتہ بھر رہ گیا ہے تمہارے کالج کھلنے میں۔ ایسی مرجھائی زرد شکل لے کر جاؤ گی۔" وہ آج اسے امی کی طرح ڈانٹ رہی تھیں۔ کنعان چپ چاپ میز کا کونا کھرچتی رہی۔ گھر میں داخل ہو کر برآمدے کی طرف بڑھتے رفیق احمد کے قدم سست ہوئے۔ اماں کی فکرمندی نے ان کی سوچ کا در بھی وا کیا۔ کتنے دن ہو گئے تھے انہیں کنعان سے بات کیے، اس کے لاڈ اٹھائے اور...... لاڈ تو اب وہ کرتی ہی نہ تھی۔ کیسی خاموش رہنے لگی تھی۔ باپ کے سمجھانے پر فرماں برداری تو دکھا چکی تھی، پر وہ خوش نہیں تھی شاید۔ خوابوں میں جینے کھیلنے کی عمر میں اسے گریز اور بندشوں نے آلیا تھا۔ جانے سوار کے معاملے میں وہ کتنی سنجیدہ تھی، وہ سوار جو خود ان کے دل کے بھی بے حد قریب رہا تھا۔ وہ ذہین آنکھوں والا سعادت مند لڑکا جس نے اپنی اچھی عادات کی بدولت چند دنوں میں ہی ان سب کا دل موہ لیا تھا، کیا وہ اس قدر سازشی ہو سکتا تھا۔

"صدیق کہہ رہا تھا اس کا دوست جھوٹا نہیں ہو سکتا، جبکہ انہوں نے تو بڑے آرام سے اسے اغوا کار بھی سمجھ لیا۔ اور وہ تو یوں لگ رہا تھا نجانے خود بھی کتنے دشمنوں میں گھرا تھا۔ ایک آدمی خود کو سوار کا باپ بتاتے ان کے سر پر پہنچ گیا، اللہ جانے اس نے کتنے جھوٹوں کا سہارا لیا تھا۔ سوار بھی کہتا رہ گیا کہ اس نے کسی کا قتل نہیں کیا۔ جانے ماضی میں سوار سے کن حالات میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں، جانے ایک معصوم پیارا سا بچہ کیسے کیسے حالات کا شکار ہوا، انہیں کم از کم ایک بار تو سوار کو بھی سننا چاہیے تھا...... اور پھر کنعان......" ٹھنڈی آہ بھرتے ان کی سوچ کے دھارے تبدیل ہوئے۔ "اسے بھی بلا سوچے انہوں نے ماہین سے ملا دیا تھا۔ کنعان اور ماہین ان کی دو بیٹیاں لیکن مزاجاً ایک دوسرے سے قطعی مختلف...... کیا واقعی کنعان کا اب تک کا رویہ اس قدر بے اعتباری کا اہل تھا۔ کیا وہ ان کی نیک اور اطاعت گزار اولاد نہیں تھی۔" اماں جی کے دو ہی جملوں نے رفیق احمد کا کلیجہ کاٹ دیا۔ وہ آیا ہو کر اس کے زرد کملائے چہرے کے بارے میں فکرمند تھیں اور وہ باپ ہو کر ان دیکھا کیے جا رہے تھے۔

"کنعان۔" وہ سوچوں میں گم بیٹھی کنعان کے نزدیک آئے۔

"ج...... جی ابو......" وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

"بیٹا۔ اس دن تم دیا کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں تو......"

"میں نے آپ سے پوچھا تھا ابو۔" وہ ایک دم دہل گئی۔

"یہاں آؤ۔" انہوں نے ہلکا سا مسکرا کر ہاتھ سے اپنی طرف بلایا اور وہ سہمے سہمے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔

"میں نے کب کہا کہ تم نے نہیں پوچھا۔" انہوں نے پیار سے کنعان کو اپنے ساتھ لگایا، جس کی پلکیں ایک ہی محبت بھرے جملے سے بھیگنے لگی تھیں۔

"میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے لیے بھی کچھ لے لیتیں، کچھ دنوں تک تمہارے کالج کھلنے والے ہیں۔ کوئی تیاری نہیں کرنی؟"

"جی، میں دیکھتی ہوں۔"

"اور یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں۔ کھانا ٹھیک سے کیوں نہیں کھاتیں۔ ہوں؟"

"ناشتا ہیوی کیا تھا ابو۔ بس اسی لیے بھوک

نہیں لگی۔" وہ بھی اب مسکرا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ اعتماد قدرے بحال ہوا تھا۔
"ہیوی ناشتے کے آثار تو نظر نہیں آتے چہرے پر۔" وہ اب آنکھیں میچے اسے چھیڑ رہے تھے۔ "چلو شاباش پہلے لنچ پورا کرو۔"
"جی۔" اس نے سر جھکایا اور وہ ایک گہری سانس لیتے گھر سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

"یہ دیکھیں سوار۔ کارڈز چھپ کر آ گئے۔" ثمامہ کا چہرا گولڈن اور گرے کارڈز لیے خوشی سے دمک رہا تھا۔ سوار کے گلے میں کچھ پھنسا۔
"کارڈز؟" یہ ثمامہ بھی پتا نہیں کیا کچھ ارینج کیے بیٹھی تھی، نہ اسے مطلع کرتی نہ کچھ مشورہ طلب کرتی، بس ایک "ہاں" کے بعد سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ کارڈز تو سوار کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھے۔
"یہ کس لیے؟" وہ جیسے کسی کنویں سے ابھرا۔
"کیسی باتیں کرتے ہیں سوار۔" وہ منہ بنا کر ہنسی۔ "مہمانوں کو انوائٹ نہیں کرنا کیا۔"
"زیادہ دھوم دھام ہے کیا؟" کارڈ ہاتھ میں لیتے اس نے ضمناً استفسار کیا۔
"نہیں...... لیکن جتنے لوگوں کو بلانا ہے انہیں کارڈز تو دینے ہی ہوں گے۔ میری طرف سے تو یہیں مری کی چھ سات فیملیز ہیں، باقی حسن ابدال سے چند ایک رشتہ دار اور آصفہ آپی اور ان کے سسرالی باقی آپ اپنی طرف سے جتنے لوگوں کو بھی بلوانا چاہیں۔"
"میں نے کسے بلانا ہے۔ بس میاں جی...... وہ رک کر دماغ کھنگالنے لگا۔ "رب نواز، صدیق، قاسم......اور عمران، دلیر بھائی۔" وہ ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا۔
"چلیں ٹھیک ہے، سوچ لیں ابھی۔ کارڈز بھی یہیں آفس میں رکھے ہیں۔" وہ ادھر ادھر سے کچھ ضروری چیزیں سمیٹتی کہیں جانے کی جلدی میں لگ رہی تھی۔ سوار نے اس کے چلے جانے کے بعد کارڈ کھول کر دیکھا۔
سوار عبدالعلی اور ثمامہ ابراہیم نے پانچ دنوں بعد نکاح کے مضبوط رشتے میں بندھ کر ایک ہو جانا تھا۔ سر جھٹک کر سوار نے کارڈ دور ٹیبل پر پھینکا۔ ثمامہ تو تھی ہی بے تاب، قدرت بھی شاید ان دونا موں کو جوڑنے میں سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ اور جانے قدرت کے یہ فیصلے دل کی خواہشوں سے متصادم کیوں ہوتے ہیں۔

☆☆☆

"السلام علیکم آپا۔" رجسٹر پر جھکے رفیق احمد نے نویدہ آپا کی کال کام کرنے کے دوران ہی اٹینڈ کر لی۔
"وعلیکم السلام۔ مصروف تو نہیں ہو۔ ہوٹل میں ہو گے؟"
"جی، ہوٹل میں ہوں، لیکن زیادہ مصروف نہیں۔ آپ بولیے۔" انہوں نے ایک دو ضروری چیزیں رجسٹر پہ اتار کر بند کر دیا۔
"تم نے جس رشتے کا ذکر کیا تھا۔ وہ کشمیری فیملی۔"
"جی جی۔ اپنے قاسم کے سسرالی۔"
"بہت اچھی فیملی ہے بھیا۔ بڑے سیدھے سادے شریف لوگ ہیں۔ لڑکا بھی اتفاق سے موجود تھا۔ اپنی کنعان سے پانچ چھ سال ہی بڑا لگتا تھا۔ بینک میں اچھی نوکری ہے، اور کیا چاہیے۔ وہ لوگ بھی خوش تھے ویسے، جلدی آنا چاہتے ہیں۔" رابعہ آپا نے عجلت میں بتانا شروع کیا تو بنا رکے بولے ہی گئیں۔ رفیق احمد خاموشی سے بہن کو سنے گئے۔
"اچھا سنو، وہ لوگ بھی جلدی آنا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے دن تاریخ بتا دوں انہیں۔"
"دن...... تاریخ......" وہ سوچ میں پڑ گئے۔
"اچھا میں بتاتا ہوں سوچ کر۔"
"ارے اب سوچنا کیا ہے۔ یہی اگلی اتوار کہہ دیتی ہوں۔" رابعہ آپا خود تو لڑکے کو پاس کر چکی تھیں،

اب مزید دیر ان کی طبیعت پہ گراں گزر رہی تھی۔ دیا اور کنعان اسی وقت شیشے کا دروازہ کھول کر ہوٹل کے اندر داخل ہوئیں۔ دونوں ریسپشن پہ چابی دے کر شاپنگ کے لیے نکل رہی تھیں۔ اماں آج بڑے دنوں بعد اسکول دوبارہ کھلنے پر بے بی کیئر کے لیے گئی تھیں۔

"کچھ دن ٹھہر جانے میں کوئی حرج نہیں آپا، مجھے ذرا ماہین اور اعجاز کی رائے لینی ہے۔ میں بتاتا ہوں آپ کو۔" انہوں نے بہن سے اجازت لے کر موبائل آف کیا۔

"تیاری ہوگئی دونوں کی؟" انہوں نے مسکرا کر دیا اور کنعان کو دیکھا۔

"جی ابو۔ بس کوٹ شوز لینے ہیں، ہوسکتا ہے کوئی ہینڈ بیگ بھی اچھا لگ جائے۔"

"اسے کچھ کھانے پینے پر بھی اکسایا کرو دیا بیٹی۔"

"جی انکل۔ آج تو برگر کھانے کا ارادہ ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک۔" وہ مسکرائے۔ "او کے، پھر نکل چلو۔"

"جی ابو۔"

اجازت لے کر واپس پلٹتے بے ارادہ ہی نگاہیں سیڑھیوں کی جانب اٹھیں۔ آج بڑے عرصے بعد ہوٹل کے اندر آنا ہوا تھا۔ پرانے دن ذہن کے پردے پر روشن ہونے لگے۔ سوار جیسے جا کر ابھی یہیں کہیں تھا۔ سفید شرٹ کے کف لنکس لگاتا وہ مسکراتے ہوئے سیڑھیاں اترتا، کنعان پہ نظر پڑتے البتہ مسکراہٹ سمٹ جاتی، کم از کم از میر ہوٹل کی ڈیڑھ مہینہ جاب میں وہ یونہی بی ہیو کرتا تھا۔ یہ سوچ تو اب کنعان کو حیران کرتی تھی کہ وہ تو پہلے دن سے اس کے دل میں بستی تھی۔ وہ بھی اس پہلی ملاقات بلکہ پہلے جھگڑے کی چوٹ سیدھے دل پہ کھا چکا تھا۔ پھر بھی کتنا عرصہ وہ خود سے کیے عہد نباہتے اس سے بے نیازی برتتا رہا تھا۔ کوکنگ اسکول کا آدھے سے زیادہ عرصہ بھی اسی انداز میں گزارتے اس نے سیلف کنٹرول کی عمدہ پریکٹس کی تھی۔ اور پھر وہ اغوا والی رات۔ وہ بھلا اس سوار کو کیسے بھول سکتی تھی۔ بانہوں میں بے ہوش پڑی لڑکی کو جس نے صرف عزت سے سنبھالا تھا۔ کنعان اپنا ساکت صامت وجود لیے اس رات شاید اپنی نظروں میں بھی کھڑی نہ ہوسکتی اگر جو......

"تم نے انکل کو بتائی تھی۔ اس روز جمشید کے ساتھی والی بات؟" دیا نے ہوٹل سے نکل کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ کنعان نے سرنفی میں ہلایا۔

"وہی تو میں سوچ رہی تھی۔ انہیں اگر معلوم ہوتا تو تمہیں ہرگز نکلنے نہ دیتے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ وہ آدمی دوبارہ ہمیں تنگ نہیں کرے گا۔" کنعان کی پر اعتماد تسلی نے دیا کے لبوں پر ہنسی بکھیری۔

"اور کیا کیا یقین دلایا، ہمارے بھائی صاحب نے؟" اس نے ابرو نچائے اور کنعان نے جواباً بس گھور کر دیکھا۔

"اچھا بتاؤ ناں۔ کیا کیا باتیں ہوئیں۔ کیسے تھے وہ؟"

"میں نے تو تمہیں خیریت پوچھنے کا کہا تھا۔" وہ بھی جلی ہوئی تھی۔

"میں نے سوچا جنہیں فکریں لاحق ہورہی ہیں، انگلیوں کو تکلیف بھی وہی دیں۔" دیا ذرا شرمندہ نہیں ہوئی۔ "اچھا۔ اب بتا بھی دو، کچھ حال دل وغیرہ۔"

"شٹ اپ۔" وہ بھنا گئی۔ "اس کی شادی ہونے والی ہے، اسے موضوع بنانا چھوڑ دو، ان فیکٹ میرا بھی عنقریب رشتہ طے ہوجائے گا۔"

"سوار کی شادی......" دیا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ کنعان کے رشتے میں اس نے ذرا برابر دلچسپی نہیں لی۔ "کب...... کس سے......؟"

"جہاں منگنی ہوئی تھی۔ وہی ثمامہ میڈم...... تمہیں ہی تو اطلاع دی تھی اس نے۔" کنعان نے الٹا تعجب سے یاد دلایا۔

''وہ تو خیر یاد ہے، لیکن بچی میں تو اسے سوار بھائی کی طرف سے جلانے اور اکسانے کی کوشش ہی سمجھی تھی۔'' دیا تو مارے افسوس کے بیچ راہ میں ہی ٹھہر گئی۔ ''تو یعنی چل ہی گیا اس کا جادوگرنی کا جادو۔''

''اچھا چلو، ہمیں کیا۔'' کنعان نظریں چرا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ دیا منہ ہی منہ میں غالباً ثمامہ کو گالیاں دینا شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ثمامہ نے سہ پہر کو اسے گاڑی دی تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کو آج ہی جا کر کارڈز دے آئے۔ جس دن سے وہ کارڈز ٹیبل پہ رکھ کر گئی تھی، تین دن ہونے کو آئے کارڈز اسی طرح پڑے اپنی ناقدری کا رونا رو رہے تھے۔ ثمامہ نے اپنے سرخ چہرے کو بڑی مشکل سے کنٹرول میں لاتے سہ پہر کو اسے کارڈز اور چابی ایک ساتھ پکڑائے تھے۔

مہمانوں کو الیونتھ آور میں بلانا بھی بدتہذیبی شمار ہوتا ہے، آخر کو انہوں نے بھی کچھ تیاری کرنا ہوتی ہے۔

''جی۔'' وہ بدستور سر جھکائے ہوئے تھا۔

ثمامہ سے یہ بے اعتنائی بھی بڑی مشکل سے ہضم ہو پاتی تھی۔ اچھی خاصی تو ہوں میں، نظر اٹھا کر دیکھ لینے میں کیا جاتا ہے بھلا۔ وہ بس دل میں سوچ کر رہ جاتی۔ اور اب تو اس نے طے کیا تھا کہ شادی ہونے تک ہوٹل آنا بھی چھوڑ دے گی۔ بڑی بوڑھیاں یونہی تو دلہنوں کو مایوں نہیں بٹھایا کرتیں۔ چودھویں کے چاند میں بھلا کیا حسن رہ جاتا اگر وہ سارا مہینہ آسمان میں چمکتا رہتا۔ چھپ کر دوبارہ نکلنے کی کشش ہی ہماری آنکھوں کو آسمان میں بھٹکاتی ہے۔ اسے بھی اب تین روز غائب رہنے کے بعد ہی اپنا دلہن کا روپ سوار کو دکھانا تھا۔ اگلے روز آصفہ آپی بھی یہاں آ رہی تھیں۔ اب تو تین روز سوار کو دکھائی نہ دے کر اس کے دل میں بے کلی کی جوت جگانی تھی۔ وہ میگزین ٹیبل پہ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک، ہے میں نکلتا ہوں، شام تک ویسے بھی فری ہوں۔''

سوئی سوئی قاتل نگاہ ایک احسان کی صورت ثمامہ کے چہرے پر رکی اور وہ تو جی ہی اٹھی۔ لیمن کلر کی شرٹ اور بلیک جینز میں آج وہ پچھلے کئی دنوں کی نسبت بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ جھاڑ جھنکار جیسی داڑھی بھی نفاست سے بنوار بھی تھی۔ بال سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے تھے۔ ٹریڈ مارک جیسی جیکٹ بھی نہیں پہنی تھی۔ مری میں گزشتہ کچھ روز سے مسلسل دھوپ نکل رہی تھی۔ راستوں کی برف بھی پگھل رہی تھی۔

''جاؤں؟'' اس نے زور دے کر پوچھا۔ ثمامہ کی بے خودی ایسی تھی کہ آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرانے کی ضرورت تھی۔

''ہوں۔ جی۔'' وہ خجل سی ہو کر دائیں بائیں ہونے لگی۔ اور سوار موبائل جیب میں ڈال کر کارڈز اٹھاتے باہر نکل آیا۔

جاتی دھوپ کا سنہری رنگ بہت حسین تھا۔ سوار کے لب بلاوجہ نہیں مسکرائے تھے۔ ٹھنڈ اور بادلوں سے چڑنے والی کنعان کو ہمیشہ ہی دھوپ اپنی سہیلی لگتی۔ اور اسے یہ دھوپ کنعان کی وجہ سے پیاری لگا کرتی۔ شاید دھوپ دیکھ کر وہ بھی خوش ہوئی ہو گی آج۔

''خوش؟'' وہ اپنے ہی جملے پر آپ ٹھٹک کر رکا۔ جانے اب ہم بھی خوش بھی ہوں گے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پلیئر بھی خود بخود آن ہو گیا۔

دل ہے ایسا راہی جس نے منزل کو ہی نہیں جانا
تنہا تنہا گھوم رہا ہے، کب سے یہ دیوانہ

گانے کے پرسوز بول باغی کرنے لگے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پلیئر آف کر دیا۔ میاں جی کا ڈھابا نزدیک آ چکا تھا۔ وہ خود تو موجود نہ تھے۔ رب نواز نے بتایا کہ ابھی ابھی گھر گئے ہیں۔ وہ بلانے کے لیے جانے لگا تو سوار نے ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔ آج وہ جس کام سے یہاں آیا تھا، اس کے لیے میاں

جی کو فیس کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر وہ موجود ہوتے، تب معلوم نہیں کہ وہ کن الفاظ میں اپنے اس فیصلے کا دفاع کرتا لیکن فی الحال ان کا موجود نہ ہونا اس کے حق میں گیا تھا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے نکل آیا۔ باقی کے تین کارڈز میں سے ایک ازمیر ہوٹل کے پورے عملے کے لیے تھا اور باقی دو دلیر بھائی اور عمران کے لیے۔ پہلے اس نے پیچھے کے راستے سے ازمیر ہوٹل جانے کا ارادہ کیا، وہ راستہ یہاں سے نزدیک پڑتا تھا۔

پچھلے راستے سے ڈھلان پر گاڑی چڑھاتے اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ ہوٹل کے اندر جانے کے بجائے صدیق کو کال کر کے باہر بلالے گا۔ رفیق سر سے سامنا کرنے کی دوبارہ بھی ہمت نہیں ہو پائی تھی۔ ہینڈز فری کانوں میں لگا کر اس نے موبائل گود میں رکھ کر صدیق کا نمبر نکالا، بیل جا رہی تھی لیکن صدیق نے کال پک نہیں کی۔ کال بج بج کر خود ہی بند ہو گئی۔ اس نے موبائل یونہی گود میں رہنے دیا۔ ہینڈز فری بھی کانوں میں لگے تھے۔ آہستہ روی سے کار آگے بڑھاتے اس نے ساتھ والی سیٹ کے ڈیش بورڈ میں دوسری سی ڈی نکالنے کے لیے ہاتھ مارا، تبھی موبائل پر صدیق کی کال آنے لگی، اس نے شاید اب اس کی کال دیکھی تھی۔

''ہیلو۔'' سوار نے کال اٹینڈ کر کے بلا ارادہ ہی ہاتھ دوبارہ کھلے ڈیش بورڈ میں گھمایا۔

''تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں بس دو یا تین منٹ میں، اب باہر نکلنے میں دیر نہ لگانا۔''

''اچھا، واہ۔'' صدیق حیرت آمیز خوشی سے چہکا۔ ''کس سائیڈ سے۔''

''پیچھے بس اسٹینڈ۔ اور دیکھو میں اندر نہیں آؤں گا۔ خود ہی باہر آجاؤ، میں نے کچھ دے......''

سوار کے ہاتھ سی ڈی کے بجائے ایک بڑے حجم کی کوئی چیز لگی جسے اس نے باہر نکالا تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ کر دبا دیا۔ سرخ رنگ کا ہتھیلی کے سائز کا، سنہرے ڈاٹس والا چھکا...... اس نے دوبارہ اندر ہاتھ مارا تو اس مرتبہ ایک نرم چیز پہ جا پڑا، اس نے دھڑکتے دل سے باہر کھینچا تو سفید ٹیڈی بیئر۔ اور...... اور یہ کار...... سوار نے کرب سے لب چبائے۔ ثمامہ کی یہ سفید کار آج وہ پہلی مرتبہ استعمال کر رہا تھا اس سے پہلے وہ جب بھی خود ساتھ ہوتی وہ گرے ہوک میں ہوتے۔ یہ کار وہ ڈرائیور کے ہوتے استعمال کرتی تھی اور بہت کم۔ نیلی سیٹوں والی سفید کار کا اسٹیئرنگ سوار کے ہاتھوں میں ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

''ہیلو...... سوار......'' صدیق ابھی تک کال پر موجود تھا۔ لیکن سوار کے سنسناتے دماغ میں اس قدر آندھیاں چل رہی تھیں کہ ہاتھوں کا کنکشن دماغ سے جدا ہوتے جیسے بالکل جامد ہو گیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی مضبوط اعصاب کا مرد رہا تھا لیکن کچھ انتہا کے جھٹکا دیتے لمحوں میں وہ پہلے بھی یونہی پتھر ہوا تھا۔ گاڑی نے اب قدرے اونچائی کی طرف سفر کرتے کچھ دیر بعد دائیں ہاتھ کو مڑنا تھا لیکن ہاتھ کام کرنے سے بالکل ہی انکاری تھے۔ اس لیے کار بجائے آگے کو اوپر چڑھنے کے پیچھے جانے لگی۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ڈھلان نے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ اور پیچھے دائیں طرف روڈ سے لگا پہاڑ تھا تو بائیں ہاتھ پر جنگلے کے نیچے گہری وادی۔ جب تک سوار کو گاڑی سنبھالنے کا ہوش آیا وہ بے قابو ہو کر پیچھے پھسلتے جنگلے سے ٹکرا گئی۔ اور یہی نہیں، کار کے وزن سے جنگلا ٹوٹ چکا تھا اور...... کار کو مزید نیچے جاتا دیکھ سوار نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ لیے۔ صدیق کے کانوں نے ایک زوردار دھماکا سنا، اور سوار کی چیخ......

''سوار......'' وہ کاؤنٹر سے نکل کر دیوانوں کے انداز میں باہر بھاگا تھا، قاسم شیشے کے دروازے تک باہر آیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کی پیٹھ کو دیکھتے چلا رہا تھا لیکن صدیق اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

☆☆☆

کنعان عصر کی نماز پڑھ کر جائے نماز لپیٹتی برآمدے میں آئی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ رکھا ابو کا موبائل کوئی چوتھی مرتبہ بج رہا تھا۔ وہ آج ذرا دیر سے دوپہر کا کھانا کھانے آئے تھے اور اب عصر کی نماز پڑھ کر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ کال ہوٹل سے آرہی تھی، جانے کیا مسئلہ تھا۔ اتنے تواتر سے تو کبھی کسی نے تنگ نہیں کیا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا جب پانچویں مرتبہ گھنٹی بجی۔ کنعان نے ایک نظر اندر جھانکا، ابو کو سجدے میں دیکھ کر اس نے خود ہی کال پک کرلی، تاکہ بتاسکے۔

"ہیلو......"

"ہیلو، کنعان باجی......" وہ شاید قاسم تھا۔ اس کی بیٹھی بیٹھی آواز میں بلا کی گھبراہٹ تھی۔

"ابو نماز پڑھ رہے ہیں قاسم بھائی، کیا بات......"

"وہ...... سوار بھائی کا ایکسڈنٹ ہوگیا ہے، یہیں ہمارے روڈ پر...... صدیق انہیں ہاسپٹل لے گیا ہے۔ سر کو جلدی یہاں بھیجیں۔"

"سوار......" اسے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا۔

"کس...... کا...... ایکسیڈنٹ......" وہ دیوار سے لگتے ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی۔

"باجی، سوار کا...... وہی جو پہلے یہاں کام کرتے تھے۔ مجھے تفصیل نہیں پتا، صدیق ساتھ ہے۔ یہی جی پی او سائیڈ والا نزدیکی ہاسپٹل......"

"ہاسپٹل......"

وہ موبائل وہیں چھوڑتے دروازے کی طرف لپکی تھی۔ ایک نظر پیچھے ابو کو دیکھا، دماغ میں اور بھی بہت کچھ آیا لیکن لگتا اس لمحے اور کچھ بھی اہم نہیں۔ وہ گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بنا کسی کو کچھ بھی بتائے گلی سے نکل کر سڑک پر آگئی تھی۔ اسے ادراک تھا وہ کیا کررہی ہے۔ لیکن سوار...... وہ زندہ ہو، صحیح سلامت ہو...... بس۔ ابھی اس سے اوپر کچھ نہیں تھا۔ وہ از میر ہوٹل کے سامنے سے گزرتی چلی گئی، بہت تیز قدموں سے۔ سائیں سائیں کرتا دماغ لیے۔ آنسو اس کی آنکھوں کو دھندلا رہے تھے، وہ ڈولتی جھومتی جیسے تیسے مال روڈ تک پہنچ گئی اور پھر ہاسپٹل کے راستے کو جاتے اب اس کے قدموں میں بھاگنے جیسی تیزی آچکی تھی۔ سوار، ایکسیڈنٹ، ہاسپٹل کی گردان کانوں کو چیر رہی تھی۔ ہاسپٹل نزدیک آچکا تھا۔ ایک ایمبولینس سائرن بجاتی باہر نکل رہی تھی۔ وہ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تو پھر دوڑتے ہوئے ریسپشن تک پہنچی...... اور وہ...... کاؤنٹر کے اِس جانب وہ ثمامہ تھی۔ سوار کی میڈم...... جو زور زور سے چلا رہی تھی۔

"آپ کو نام کیسے نہیں معلوم پیشنٹ کا؟"

"دیکھیں، میڈم اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

نرس نے لہجہ دھیما رکھا۔ "وہ پیشنٹ آل ریڈی مرچکا تھا۔ ایمبولینس اسی کو لیے بس اسٹینڈ کی طرف گئی ہے۔ ایک لڑکا تھا اس کے ساتھ، وہی لے گیا۔"

"بس اسٹینڈ......" کنعان نے منہ پہ ہاتھ رکھا، وہاں تو میاں جی کا ڈھابا تھا۔ کنعان منہ پہ ہاتھ رکھ کر واپس دوڑی۔ صدیق اسے لے گیا۔ وہ ایمبولینس جو ابھی ابھی نکلی۔ ڈیڈ باڈی...... کنعان کی مری ٹانگوں میں چلنے تو کیا کھڑا ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ اس نے قریب سے گزرتی ٹیکسی کو روکا اور فوراً ہی بیٹھ گئی۔

"بس اسٹینڈ......"

بمشکل کہتے سیٹ کی پشت پہ نڈھال ہوکر سر گرادیا۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ سب کچھ...... ٹیکسی ڈرائیور اس کی حالت کو دیکھتے سرپٹ ٹیکسی دوڑا چکا تھا۔ پیچھے کے راستے سے گزرتے ایک جگہ جنگلا توڑ کر آدھی نیچے کو لٹکی کار اور پولیس کے چند لوگ دکھائی دیئے۔ کار جنگلا توڑ کر بجائے نیچے گرنے کے پیچھے سے نکلتے درخت سے ٹکرا کر بیچ میں لٹک کر رہ گئی تھی۔ ان کے روڈ پر تو یہی ایکسیڈنٹ ہوا تھا، وہ دیوانوں کی طرح پلٹ پلٹ کر اس لٹکی ہوئی کار کو دیکھ رہی تھی۔ ٹیکسی والا اسے بس اسٹینڈ پر لے آیا تو ایک تنگ جگہ سے ایمبولینس نکل کر واپس آتی دکھائی دی۔

"وہاں......" کنعان نے پھٹی آنکھوں کے ساتھ انگلی سے اس تنگ راستے کی طرف اشارہ کیا۔

"اے بھائی۔ مریض کو کہاں چھوڑا؟" ٹیکسی والے نے سر باہر نکال کر ایمبولینس کے ڈرائیور کو دیکھا۔

"مریض نہیں...... مردہ تھا بھائی۔ ادھر دکانوں کے پیچھے دوسرا گھر۔"

ایمبولینس والے نے ہاتھ سے بتایا اور ٹیکسی والا کنعان کو لیے اس جگہ لے آیا۔ وہ بھاگ کر دکانوں کے پیچھے گئی۔ ایک گھر کے دروازے پر خوب رش لگا تھا۔ نزدیک جانے پر رونے کی آوازیں۔ وہ ہجوم کو چیرتی اندر داخل ہوئی۔ چارپائی پر لیٹے اس بے جان وجود پر سفید چادر ڈالی جا رہی تھی۔ حادثے کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے اس بدنصیب کا چہرا کنعان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور وہ...... وہ چہرا...... سوار کا نہ تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا۔

کنعان بھاگ کر دیوانہ وار بازار میں آئی۔ ایمبولینس ابھی وہاں سے گئی نہ تھی۔ بلکہ ایک کھلی جگہ پہ آن رکی تھی۔

"بھائی...... یہ...... یہ مردہ نہیں...... وہ دوسرا شخص...... جس کا ادھر پچھلے راستے پہ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ بھی تو اسی ہاسپٹل......"

"ہاں اچھا۔ وہ......" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ایک وارڈ بوائے ٹائپ لڑکے نے سر آگے کیا۔

"اسے بھی یہیں لائے تھے، ایمبولینس میں۔ وہ ادھر بس اسٹینڈ کے بعد ایک پرانا ہوٹل ہے، سڑک سے اتر کر۔" اس لڑکے نے ہاتھ سے دور جاتی سڑک کی طرف اشارہ کیا اور کنعان بھاگ کر ٹیکسی کی طرف واپس آئی۔

"ادھر جانا ہے۔ تھوڑا آگے۔"

وجود میں ایک پھرتی اور جوش سا امڈ آیا تھا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی تو رواں رواں کپکپا رہا تھا۔ ٹیکسی والا سچ مچ ایک نیک دل شخص تھا۔ خاموشی سے اس راستے چل پڑا۔ اور کنعان ایک دھن ایک جنون میں بس آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ اس کے پاس پرس تھا نہ رقم...... شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ کہیں کہیں مسجد سے مغرب کی اذانیں آنے لگی تھیں۔ ٹیکسی سڑک پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہیں کہیں میاں جی کا ڈھابا تھا۔

"مم...... مجھے ٹھیک سے نہیں پتا۔ یہیں کہیں ایک پرانا ڈھابا ہونا چاہیے۔" کنعان کی پھنسی پھنسی آواز میں اب خوف در آیا تھا۔

"جی، ایک ہی ڈھابا ہے۔ میں لے چلتا ہوں۔" وہ شریف النفس آدمی اتنا کہہ کر کچھ دور اور چلا اور اب ٹیکسی سڑک سے اتر کر ایک کچی ڈھلان سے ہوتے ایک پرانے ہوٹل پہ آ رکی تھی۔ تندور میں آگ جل رہی تھی۔ اکا دکا مسافر چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر تندور کے نزدیک آئی۔ ایک آدمی تیزی سے ہاتھ چلاتے روٹیاں پکا رہا تھا۔ اور ایک دس گیارہ سالہ بچہ چنگیر میں ڈال ڈال کر سرو کر رہا تھا۔ ایک تنہا اکیلی لڑکی کو اس ویرانے میں دیکھ کر رب نواز کا ہاتھ رکا۔ تقریباً سب ہی مرد گردن موڑے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

"سوار......" اس نے تھوک نگلتے ایک امید پہ پکارا۔

"سوار بھیا۔" اس چھوٹے لڑکے نے خالی چنگیر واپس رکھتے جوش سے کنعان کو دیکھا "وہ تو اندر گھر میں ہیں۔"

"اندر۔" کنعان کے ستے وجود میں اس کے یہاں ہونے کا سن کر ایک توانائی سی آ گئی۔

"کہاں؟"

"آ جائیں۔ ادھر پیچھے، ہمارے گھر......" وہ لڑکا آگے آگے بھاگا اور کنعان نے بھی قدم بڑھائے۔

"میڈم...... پیسے؟" ٹیکسی والے نے بڑے طویل صبر کے بعد بالآخر بول ہی دیا۔ اسے تو ظاہر ہے اب یہاں سے جانا تھا۔ لڑکی یقیناً اپنی منزل تک پہنچ گئی تھی۔

''اوہ......'' کنعان نے ڈرتے ڈرتے رب نواز کی طرف دیکھا۔ ''میرے پاس رقم نہیں ہے۔'' آنکھوں میں شرمندگی اور انتہا کی بے بسی تھی۔

''کوئی بات نہیں، میں دیکھ لیتا ہوں۔ آپ سوار بھائی کی مہمان ہیں۔ جائیں۔''

رب نواز نے گلا کھول کر رقم نکالتے ٹیکسی والے کو اشارے سے بلایا اور کنعان فخری کے پیچھے چل پڑی، فخری اسے ہوٹل کے پیچھے ایک کچے مکان میں لے آیا تھا۔ لڑکا بوری کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

کنعان تو پچھلے ایک گھنٹے کے دوران سب کچھ بنا عقل سوچ کو درمیان میں لائے میکانکی انداز میں کیے جارہی تھی۔ لڑکا اندر کہیں لے جانے لگا اور وہ سوار کو صحیح سلامت دیکھ لینے کی اکلوتی خواہش لیے اندر داخل ہوگئی۔ چہرے کے گرد عصر کے وقت سے ہی اپنا بڑا سا کاسنی دوپٹا وہ نماز کے انداز میں لپیٹے ہوئے تھی۔ ایک بزرگ خاتون ہاتھوں میں پانی کا تسلا لیے چلتے چلتے اسے رک کر دیکھنے لگی تھی۔

''نانی۔ یہ سوار بھیا سے ملنے آئی ہیں۔'' فخری نے بتایا تو تسلا نیچے رکھ کر وہ ملنے کے لیے آگے بڑھیں اور کنعان کو گلے سے لگایا۔

''کون ہے فخری؟'' ایک بزرگ آدمی اسی وقت ایک کمرے سے باہر نکلا۔

''مم...... میں کنعان......'' وہ تین اجنبیوں کے درمیان کھڑی اس وقت خود اپنے آپ کو بھی بیگانی سی لگ رہی تھی، گلے سے گھٹی گھٹی آواز میں بس اتنا ہی تعارف نکل پایا۔

''بہت شکریہ کنعان بیٹی۔'' میاں جی نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ''اس وقت اسے تمہاری ہی ضرورت ہے۔ وہاں اندر چلی جاؤ۔''

انہوں نے اسی کمرے کی جانب اشارہ کیا جس سے ابھی ابھی خود باہر آئے تھے۔ اور کنعان اپنی لرزتی ٹانگوں کو کھینچے دل کی زوردار دھمک اپنے

کانوں میں سنتی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔

کمرے میں چھوٹے بلب کی وہ مدھم روشنی تھی جس میں اس نے چارپائی پر لیٹے سوار کو دیکھا۔ سینے تک کمبل ڈالے آنکھیں بند کیے جانے وہ سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بازو پر انگوٹھے سے کلائی کے گرد تک سفید پٹی بندھی تھی۔ چہرے پر کنپٹی کے نزدیک شاید زخم آیا تھا۔ سر کے گرد بھی پٹی بندھی تھی۔

اتنا تو ڈھابے کے اندر آنے تک اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ سوار زندہ سلامت ہے اور کسی بڑی تکلیف میں نہیں ہے کیونکہ یہاں پہنچنے تک سب کچھ معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ دس سالہ بچے کی معیت میں یہاں آنے تک دل کچھ اور مطمئن ہوا تھا کیونکہ چہرے اور رویے کسی بڑے حادثے کا ہرگز اشارہ نہیں دے رہے تھے۔ ہاں لیکن اپنی آنکھوں کا دیکھا کچھ اور ہوتا ہے۔ جب تک اس چاند چہرے کو وہ اپنی نظروں سے نہ دیکھ لیتی، بے کلی سے نجات ناممکن تھی۔ وہ دھیرے دھیرے بے آواز قدموں سے چارپائی کے نزدیک آئی۔ ذہن ابھی بھی خالی سلیٹ تھا۔

وہ سوار کی محبت میں یہاں تک کیوں آئی، خود سے کیے وعدے کب ٹوٹے، دل کے پنچھی نے کھڑکی کھلی دیکھ کر پرواز کے لیے کب پر تولے، پرخار راستوں پہ بچ بچ کر دامن، پلو، پاؤں بچاتے کب برہنہ پا دوڑنا شروع کر دیا۔ جنون نے ہر مصلحت کو کیوں طاق پہ رکھ کر دیوانہ وار اپنے مطلوب تک پہنچایا، وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں کچے بوسیدہ مکان کا یہ کمرا کسی عشقیہ داستان کے سیٹ میں ڈھلنے لگا۔ وہ کسی تھی نہ ہیر، لیلیٰ تھی نہ شیریں، پھر بھی جان سے جاتے محبوب کا عشق اس کی جان نکال لے گیا تھا۔ کنعان نے اپنا کانپتا لرزتا ہاتھ سوار کی پیشانی پہ رکھا، سانسیں لیتے وجود کی حرارت، زندگی کا یقین بن کر اس کی ہتھیلی میں اتر گئی۔ پلکوں سے آنسو موتیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے۔ کنعان کی زندگی بچ جانے پر ایک

دن ایسا ہی ایک آنسو سوار کی آنکھ سے خوشی بن کر کنعان کے چہرے پر گرا تھا۔ سوار کے سینے پر رکھے ہاتھ پہ پانی کے چند گرم قطرے گرے تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ بلب کے سامنے آن کر کی وہ کون تھی جو سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ دھندلی آنکھوں کے سامنے صورت واضح نہیں ہو پا رہی تھی۔ دوپٹے کے ہالے میں یہ چہرا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں کی دھند سے نجات پانے کی کوشش کی۔ نقوش کچھ واضح ہونے لگے۔

''کنعان...... یہ تم ہونا...... میرے پاس؟'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''میں جانتا تھا کنعان۔ تم ضرور آؤ گی، آخری بار ایک تمہیں ہی تو دیکھنا......'' اس کی پلکیں پھر بند ہوئیں اور کنعان نے قریب بیٹھتے اس کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

''سوار...... سوار......'' وہ تو اس کو ٹھیک ٹھاک زندہ سلامت دیکھ کر مطمئن ہوئی تھی۔ لیکن یہ سوار کیا کہہ رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے سوار۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔ آنکھیں کھولیں سوار۔'' وہ پریشانی سے اونچا اونچا بولتی چلی گئی اور جملے سوار کے دماغ پر پتھر سا برس رہے تھے۔ سر پر جیسے لوہے کا ہیلمٹ چڑھا ہو۔ اور پھر وہ اس ایک دم بیدار ہوئے۔ ایک دم پوری طرح۔

''کنعان...... تت...... تم...... یہاں......'' اس نے دیوانہ وار اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکر سا آیا اور بیچ راستے میں ہی واپس گر گیا۔ منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔

''کیا ہوا ہے سوار۔'' اس نے احتیاط سے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

''میری ٹانگ......''

''ٹانگ......'' اس نے کمبل میں ڈھکے جسم کو پریشانی سے دیکھا۔ آنکھیں خوف سے پھیلنے لگیں۔

''کیا ہوا ٹانگ کو؟''

''پلاستر چڑھا ہے گھٹنے تک۔'' وہ کچھ یاد کر کے مسکرایا۔ ''پھنس گئی تھی بریک اور بورڈ کے بیچ......''

''لیکن آپ یہاں کیوں ہیں، آپ کو تو ہاسپٹل میں ہونا چاہیے۔''

''ہاسپٹل سے ہی آیا ہوں۔ صدیق نے بروقت وہاں پہنچا دیا، پلاسٹر ہی لگنا تھا۔ باقی ہڈی پسلی درست تھی سب، تب ہی میاں جی کو بلوا لیا۔'' وہ اب مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''اُف......'' کنعان نے پلکیں موند کر ایک سکون بھرا سانس لیا۔ سوار نے شاید درد کی وجہ سے میری ٹانگ کہا تھا۔ اور نجانے وہ کیا سمجھی تھی۔

''میں بیٹھنا چاہتا ہوں کنعان۔''

''ہاں، جی جی......''

اس نے سوار کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کندھے کے پیچھے اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ پھر تکیوں کو نیچے سے کھینچ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ چارپائی پیچھے دیوار سے لگی تھی۔ سوار اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پیٹھ کو سیدھا کرتے گردن کو دائیں بائیں ورزش کے انداز میں گھما کر جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور ایک گہری سانس لی۔ تناؤ کی کیفیت میں بہت حد تک کمی آئی تھی۔ اب وہ خود کو آرام دہ حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ کچھ وجہ ان پین کلرز کی بھی تھی جو اب اثر دکھا رہی تھیں۔ اب اس کے لیے ہر بات سے اہم کنعان کی وہاں موجودگی تھی۔ روشن دان سے پرے آسمان گہرا کالا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

''تم یہاں کیسے آئیں کنعان؟'' وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ جو، اب چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھی تھی۔

''معلوم نہیں......'' سر نیچے جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتے اس نے آہستگی سے جیسے اپنی کسی غلطی کا اعتراف کیا اور سوار نے اس مختصر اقرار کے اثر کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔

''سر کو پتا ہے...... یا اماں؟'' اس نے سوال کیا۔

کنعان نے سرنفی میں ہلا کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔ سر نیچا کیے وہ رو رہی تھی۔ سوار نے دیکھا اس کے ہاتھوں کی پشت پوری بھیگ گئی تھی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کو رگڑنے لگی۔ لائٹ کاسنی دوپٹے پر پانی صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ شاید خود کو روکنا چاہتی تھی لیکن بے کار تھا سب۔ سوار نے خاموشی سے اسے یہ شغل پورا کرنے دیا، یہ سمجھ میں البتہ نہیں آسکا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

"اگر کسی کو نہیں پتا تو...... کیا وہ پریشان نہیں ہو رہے ہوں گے؟"

"مجھے واپس جانا ہے۔" اس نے گلابی ناک کو پلو سے صاف کیا۔ سوار نے سرہانے رکھا موبائل اٹھا کر رفیق سر کا نمبر نکالا اور بجائے کنعان کی طرف بڑھانے کے اپنے کان سے لگالیا۔ دختر صاحبہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں لگتی تھیں۔

"سوار......" رفیق سر نے کتنے رسان سے اس کا نام لیا تھا۔ سوار کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ان کے پاس بھی یقیناً سوار کا نمبر محفوظ تھا، تب ہی کال آتی دیکھ کر اس کے بولنے سے پہلے ہی نام لیا۔

"جی۔" وہ اس سے زیادہ بول ہی نہیں پایا۔

"کیسے ہو بیٹے؟"

"میں ٹھیک ہوں سر۔ الحمدللہ۔" سوار کا دل اس نرمی پر بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ "وہ...... یہ کنعان بی بی یہاں ہیں، میں نے سوچا آپ پریشان نہ ہوں۔"

"ہاں، پریشانی تو بہت ہوئی، لیکن مجھے تمہاری فکر زیادہ تھی۔ اندازہ تھا کہ ادھر ہی گئی ہوگی۔ صدیق سے ابھی تمہارا تفصیلی حال معلوم ہوا۔ میں نے اس سے میاں جی کے ڈھابے کا پتا پوچھا ہے۔" وہ اسے آرام اور تفصیل سے بتا رہے تھے اور وہ مزید حیران ہوتا جا رہا تھا۔

"آجائیں سر۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ ویسے کنعان بی بی کو میاں جی کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

"تمہاری عیادت بھی تو کرنی ہے۔ اسے میرے آنے تک وہیں رکنے کو کہو۔" اس بار انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"جی سر۔" سوار نچلا لب دانتوں میں دبائے۔

"اس اچانک ملنے والی دوسری...... نہیں...... تیسری خوشی پر بے یقین سا بیٹھا رہ گیا۔ پہلی صدمہ بھری خوشی نے تو ٹانگ پہ پلاسٹر چڑھا دیا تھا۔ دوسری خوف زدہ نظروں سے گھورتی سامنے بیٹھی تھی۔ اور تیسری رفیق سر کے معاف کر دینے کی۔"

اس نے حیرت سے تکتی کنعان کو دیکھ کر ہنستے ہوئے سر جھٹکا حالات تو دو گھنٹہ پہلے ہی اس کے حق میں ہونا شروع ہو گئے تھے، پر سامنے بیٹھی اس گھبرائی ہوئی لڑکی کو اس کی کچھ خبر نہ تھی رونا دھونا بھی غالباً اسی بے خبری کے نتائج تھے۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" اس کی آنکھوں میں واضح گھبراہٹ تھی۔

"یہیں آرہے ہیں۔"

"نہیں نہیں......" وہ جانے کیا سمجھی، بوکھلا کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوار نے بے ساختہ کلائی پکڑ کر روکا، وہ تو بنا کچھ سنے بھاگنے کو تھی۔

"ارے۔ بیٹھو بھئی۔" اس نے کھینچ کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ "یہیں آرہے ہیں لیکن ہمیں کھا نہیں جائیں گے۔ میری عیادت کو آرہے ہیں۔ ان کے آنے تک اب ہلنا بھی مت۔"

سوار نے اس بار غصے سے گھورا لیکن وہ تو یقین نہ آنے والی نظروں سے بس دیکھے ہی جا رہی تھی۔ ابو سوار کی عیادت کو آرہے ہیں، سن کر معلوم نہیں کیسا لگا۔ سوار نے ایک گہرا سانس لیا۔ ابھی تو کتنا کچھ کنعان کو بتانا تھا۔ سوار کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا آغاز کہاں سے۔

تب ہی موبائل کی گھنٹی نے دھیان بٹایا۔ ثمامہ کی یہ کوئی پانچویں یا چھٹی کال تھی اس کے نمبر پر، جسے اب تک اس نے نظر انداز ہی کیا تھا۔ اب سوچا دونوں سے اکٹھے ہی نمٹ لے۔ ایک نظر اس نادان بے خبر لڑکی پر ڈالتے کال اٹینڈ کرلی۔

"ہیلو سوار۔ کہاں ہیں آپ؟" خاموشی بھرے ماحول میں ماؤتھ پیس سے نکلتی آواز کی کھنک کنعان کو بھی صاف سنائی دے گئی۔ آواز بلاشبہ ثمامہ کی تھی۔ نظریں سوار سے چار ہوئیں تو اس نے خجالت سے دوبارہ نیچے دیکھنا شروع کر دیا

"نہیں ہوں اسی دنیا میں۔"

"ہاسپٹل سے کہاں چلے گئے سوار۔ میں یہاں کتنی پریشان ہوں۔ پولیس والے الگ تنگ کر رہے ہیں۔ میری گاڑی کے پیپرز دیکھ کر انہوں نے مجھے بلایا، حادثہ کیسے ہوا، بتائیں نا سوار...... آپ کیسے ہیں؟ میں آنا چاہتی ہوں۔" وہ حقیقتاً اتنی ہی بوکھلائی ہوئی تھی جتنی اپنے لہجے اور آواز سے لگ رہی تھی۔ سوار جواباً استہزائیہ ہنسا تھا۔

"آپ کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، میں اس وقت اپنوں کے بیچ اور اپنوں کے سامنے ہوں۔" اس کی چمکتی مسکراتی سی نگاہ کے حصار میں کنعان تھی جو اس کے ہر جملے پر مزید الجھتی جا رہی تھی۔ مختصر سے وقت میں بہت سوچنے پر یہی سمجھ میں آیا کہ اس کا دیوانہ وار سوار کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ جانا سوار کی خوش فہمی کا باعث بنا تھا۔ اور اگر ایسا تھا تو وہ ایک بار پھر پچھتاؤوں میں گھرنے لگی تھی۔

"آپ کہاں ہیں سوار۔ میں ابھی پہنچتی ہوں۔" ثمامہ کا لہجہ سنجیدہ ہوا۔

"آپ اپنے سب ہی حق کھو چکی ہیں ثمامہ ابراہیم۔"

سوار کا لہجہ ایک دم تبدیل ہوا اور پہلے ہی جملے پر کنعان نے دونوں ہاتھ نفی میں ہلا کر اشارے کرنا شروع کر دیے۔ وہ اسے باز رکھنا چاہتی تھی۔ اسے کسی نئی خوش گمانی سے دور رکھنے کی کوشش۔ سوار نے اس بے وقوف کی حرکت کو ہنسی روک کر دانستہ نظر انداز کیا۔ دھیان دوبارہ ثمامہ کی جانب مبذول کیا، اس کے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ رفیق سر کسی بھی وقت پہنچنے والے تھے۔ اور اس ثمامہ کے باب کو باقی ہر ضروری کام سے پہلے ابھی اسی وقت بند کرنا تھا۔

"آپ کے جھوٹوں کی پول کھل چکی ہے۔ اور اللہ پاک کا احسان ہے کہ بڑے ہی وقت پر کھلی ہے۔ لیکن یاد رکھیے ثمامہ! کہ یہ جھوٹ یہ گناہ اتنے بڑے ہیں کہ دیر سے بھی کھلتے تو انجام وہی ہوتا جو آج ہوا۔ آپ نے مجھ سے شادی کی راہ ہموار کرنے کے لیے رفیق سر کو بدگمان کیا۔ یقیناً اچھا نہیں کیا۔ لیکن کنعان کا اغوا......" زور دے کر دہراتے اس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئیں۔ "ناقابل معافی ہے ثمامہ......!"

"آپ کو شاید کوئی غلط فہمی......" ثمامہ کی سٹی گم ہوئی، آنکھوں کے آگے حقیقی تارے ناچنے لگے تھے۔

"شٹ اپ ثمامہ۔" وہ پوری طاقت سے دھاڑا تھا۔ "آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ آپ نے مجھے کتنی گہری چوٹ پہنچائی ہے۔ میں سمجھتا تھا وہ شازمہ جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو جذبات سے، زندگیوں سے بڑی آسانی سے کھیل جاتی ہیں۔ بلکہ آپ سے تو وہ بھی بہتر تھی، کم از کم مجھ سے کام نکلوانے کے لیے اس نے استعمال بھی میرا کیا۔ پر آپ...... آپ نے میری محبت، میری کنعان کو استعمال کرنے کی بھول کی ہے۔ آپ تو نفرت کے قابل بھی نہیں ہیں ثمامہ۔ یہ درد، یہ چوٹ جو آج آپ کا سچ سامنے آنے پر ملے، میری جان جانے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ شازمہ کے داغ نے میرا گھر، میرے اپنے، میری عزت تک سب کچھ داؤ پر لگا دیا لیکن میرے اعصاب مجھے مرنے کی حدوں تک نہیں لے جا سکے، کیونکہ وہ میری عزت تھی جسے داغ دار کرنے میں کچھ حصہ میرا بھی شامل تھا لیکن کنعان کی عزت......" اس کی سرخ آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"کنعان کی عزت کی خاطر میں سچ مچ کسی کا خون کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ سمجھیں آپ...... اس لیے مجھے ڈھونڈنے مجھ تک پہنچنا تو دور، میرے سامنے تک آنے سے گریز کیجیے گا ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔ اور باوجود اس

کے کہ آپ کے بیچ نے مجھے بہت خوب صورت تحفے سے نوازا ہے، میں نے آپ کو نہ آج معاف کیا ہے نہ آئندہ کبھی اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ کیونکہ اتنا حسین تحفہ کسی صبر آزما انتظار کا ثمر تو ضرور ہو سکتا ہے، کسی غاصب کی مکروہ سازش کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اجازت چاہوں گا اس امید کے ساتھ کہ آئندہ آپ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی کے جذبات کا خون نہیں کریں گی۔ نئے منیجر کی تلاش شروع کر دیجیے، ہو سکے تو جلد از جلد کسی لائف پارٹنر کی بھی۔"

آگ اگلتے جملوں سے ثمامہ کو اپنے آخری فیصلہ سنا کر پیٹرا ان سے، ثمامہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے خود کو آپ ہی نکالتے موبائل آف کر کے قدرے دور پھینک دیا۔

کنعان کے پوچھنے کو بھلا کیا رہ گیا تھا۔ سوار کے پرسکون انداز کی وجہ بھی اب سمجھ میں آنے لگی۔ کڑی آزمائش کا بادل شاید چھٹ جانے کو تھے۔ اور ابو...... اسے کچھ یاد آیا۔

"ابو کو کیسے بدگمان کیا...... انہوں نے؟" وہ ثمامہ کہتے اٹک سی گئی۔

"ہوں۔" وہ جو موبائل دور پھینک کر گہرے گہرے سانس لیتے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، چونک کر کنعان کو دیکھا۔

"ہاں۔" ایک گہرا سانس لیتے وہ اب اپنے زخمی ہاتھ کی پٹی کو دیکھ رہا تھا۔ "صدیق کی مدد سے پچھلے دنوں ہی میرے علم میں آیا کہ تمہارے ابو سے ملنے والا شخص میرے اباجی نہیں تھے۔ لیکن وہ شخص کون تھا اور کیوں اس نے مجھ سے دشمنی کی، تب سمجھنا مشکل تھا لیکن اب تو ظاہر ہے، بہت آسان ہے۔ اور تمہارا اغوا بھی انہوں نے کروایا۔ یہ شاک تو ابھی کچھ دیر پہلے میری جان لیتے لیتے رہ گیا۔" سوار نے اسے آدم خان سے ملنے والے اشاروں اور کار کے ڈیش بورڈ سے ملنے والی اشیاء کی تفصیل بتائی۔

"کس طرح مل جاتے ہیں انہیں اپنے مقصد کے لیے ایسے لوگ۔" اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔

"پیسہ کیا نہیں کروا سکتا ڈیئر۔"

"تو اب...... شادی کینسل ہونے پر وہ دنیا کو کیا جواب دے گی، تیاریاں تو سب ہی مکمل تھیں۔"

"بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔ شادی کرنے کو تو نہیں کہہ رہیں؟" اس نے شرارت سے ابرو اٹھایا اور کنعان نے جھینپ کر سر نفی میں ہلایا۔

"ڈونٹ وری۔ وہ پھر کوئی جھوٹ بول دے گی، اور جھوٹ بھی ایسا کہ مجھے ظالم بنا کر خود مظلوم بنتے ہمدردیاں بھی وصول کرے گی۔"

"وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی سوار۔" کنعان کا خالی خالی لہجہ یاسیت سے پُر تھا۔ سوار نے ایک نظر افسوس سے اسے دیکھا۔

"ایسے منفی جذبوں کے لیے محبت کا لفظ استعمال کر کے اس کی توہین مت کرو۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے بھی یہی سمجھنے کی بھول کی تھی۔ مجھے تو بڑی سخت چوٹ کھانے کے بعد یہ ادراک ہوا۔ اللہ نہ کرے تمہیں زندگی میں کسی تلخ تجربے سے گزر کر سمجھنا پڑے۔ اور یاد رکھو کنعان کہ سچے جذبے ایثار، قربانی اور صبر واستقلال سے سجتے سنورتے ہیں۔ ایسی تباہ کن جذباتیت سوائے خود غرضی اور سفاکی کے کسی اور نام کی حق دار نہیں۔ محبت وہ ہے جو تم نے مجھ سے کی ہے۔ یہ تو وہ ہے جو استدلال سکھاتی ہے، برداشت، احساس، خلوص، سچائی، پاکیزگی ایسے نجانے کتنے ہی خوب صورت نام ہیں محبت کے۔ غلط راہ پہ چلنا کہیں اس کی لغت میں درج نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ "سچی محبت" کیونکہ محبت کا ایک ہی رنگ ہے اور وہی سب سے سچا ہے۔ جھوٹی محبت تو کہیں ہوتی ہی نہیں۔ اور وہ جسے میں نے محبت سمجھنے کی بھول کی تھی، یا اب شاید ثمامہ نے بھی۔ وہ تو کچھ نا آسودہ، ادھوری، تشنہ سی خواہشات ہوتی ہیں جن کی تسکین ہمیں کچھ جذباتی سہاروں کی بدولت وقتی طور پر حاصل ضرور ہو جاتی ہے۔ اور ہم جسے بڑی آسانی

سے محبت کا نام بھی دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ دیرپا ثابت نہ ہوں اور صحیح سمت میں رہنمائی نہ کریں تو محبت ہرگز نہیں ہو سکتے۔"

"محبت صرف وہ نہیں سوار! جو میں نے آپ سے کی ہے۔" کنعان نے اس کے طویل تجزیے میں جو ایک چیز مس کی، وہ شاید سوار اپنے منہ سے کہنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اسے کنعان بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ "وہ بھی ہے جو آپ نے مجھ سے کی......" اس نے ہلکا سا سر اوپر اٹھایا تو سوار نے سر نفی میں ہلایا، چہرے پر کسی یاد کا تاریک سایہ سا لہرایا۔

"میں محبت میں کھرا ہوتا تو اس رات تمہیں پریشان کرنے تمہارے دروازے پر نہ آجاتا۔ ابھی مجھے......"

"نہیں سوار۔ انتظار کی وہ تڑپ میرے نزدیک قابل معافی ہے کیونکہ میری مٹھی میں اس سے کہیں کھرا اور سچا ثبوت موتی بن کے چمکتا رہتا ہے۔"

"اے ے...... سا...... کیا......" سوار بالکل بے یقین تھا۔ کنعان نے مسکرا کر چہرا اوپر اٹھایا تو آنکھوں پہ تارا سا چمکا، پلکیں لرزنے پر دو تین آنسو بے اختیار گال پہ چھلک آئے تھے۔ سوار حیرت سے اس کی روتی مسکراہٹ کا راز جاننے کو بے تاب تھا۔

"اس اغوا والی رات میں جب آپ کی ثمامہ میڈم مجھے اپنے کسی مفاد کے لیے استعمال کر رہی تھی، میں بے رحم بھیڑیوں کے قبضے میں مجبور اور بے بس تھی۔ میرے ساتھ کیا کیا ہو سکتا تھا۔ اس بے حس ظالم عورت نے ایک پل کو بھی نہیں سوچا۔ لیکن اسی بے رحم رات میں اپنی جان خطروں میں ڈال کر میرے مسیحا بن کر ایک آپ سامنے آئے...... نہ صرف میری زندگی میری عزت کو ان درندوں سے بچایا بلکہ ٹھنڈ سے جمے وجود کو صرف آپ کے خلوص آپ کی اچھائی کی گرمی نے پگھلایا۔ آپ نے میری نظروں میں مجھے عزت بخشی تھی سوار۔"

وہ ایک بار پھر روتی جا رہی تھی کہ اس رات کی یادیں جب بھی تازہ ہوتیں کنعان کا دل سوار کے پاؤں چھو کر اسے مان دینے کو چاہنے لگتا۔ "مجھے پہلی بار اپنی پسند اپنی محبت پر فخر دلایا تھا آپ نے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں سوار۔"

وہ اپنی آنکھیں رگڑ کر جس سچے دل سے اقرار کر رہی تھی سوار نے اب سے پہلے شاید اس پر کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور تب ہی کنعان نے باقاعدہ ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے پیروں کو چھو لیا۔

"ارررے...... کیا کر رہی ہو؟" سوار نے جھٹکے سے یوں ٹانگیں سمیٹیں کہ اپنی ٹانگ کا پلاسٹر بھی بھول گیا۔ بے ساختہ آہ نے بیچ راہ میں رکنے پر مجبور کیا۔ کنعان نے گھبرا کر ہاتھ کھینچتے اس کی صورت دیکھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ "تو اس رات کی بارش میں یہ مصلحت چھپی تھی۔" اس نے نچلا لب دانتوں میں دیتے خود کلامی کی تو کنعان نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا مطلب؟"

"اس رات جمشید کے گھر سے نکل کر جب ہم درختوں کے جھنڈ میں چھپے تھے تب ہی تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں آسمان کی طرف دیکھتے بار بار اللہ سے شکوہ کر بیٹھتا کہ میں تو ایک اچھے مقصد کے لیے نکلا ہوں مالک، تو پھر راہ کی یہ رکاوٹیں کیوں؟ لیکن اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس رات تمہارا بھیگنا اور ٹھنڈ کے اتنے شدید زیر اثر آنا اور میری ریسکیو کرنے کی کوشش سوائے ایک امتحان کے اور کچھ نہ تھی۔"

"امتحان میں پڑنے اور اس میں سرخرو ہونے کے۔" کنعان نے اضافہ کیا۔

"اچھا آنکھیں صاف کرو، رفیق سر آ گئے تو کیا سوچیں گے۔" وہ اپنی اتنی تعریف ہضم نہیں کر پایا تو موضوع تبدیل کیا۔

"آپ نے جاب بھی چھوڑ دی سوار۔" کنعان نے اپنا چہرا صاف کرتے ایک دم خیال آنے

پر پوچھا۔

"تو...... کیا نہ چھوڑتا؟" سوار نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں تو کنعان کو ہنسی آگئی۔

"نہیں...... میرا مطلب ہے، آگے کیا سوچا ہے۔"

"رزق تو نصیب سے جڑا ہے ڈیئر۔ اگلی منزل کا تعین وہ اوپر والا کر چکا ہوگا۔ مجھے تو بس ہاتھ پاؤں مارنے ہیں۔ مری میں شاید اتنا ہی دانہ پانی لکھا تھا۔"

"جی؟" اس نے گھبرا کر سوار کو دیکھا۔

"یہاں سے تو جانا ہے کنعان۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "پہلے اپنے گھر، پھر کچھ کام کاج...... ان فیکٹ اسلام آباد میں دو جگہ سے انٹرویو کی کال آئی تھی، میں نے یہاں کے حالات دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن اب میں وہیں سے آغاز لیتا ہوں۔ ابھی کچھ دن ہیں۔"

وہ مطمئن لہجے میں تفصیل بتاتے ٹھٹک سا گیا۔ سر جھکائے ہتھیلیاں مسلتی کنعان کا رنگ فق ہو چکا تھا، چہرے پر عجیب سی ہویدگی چھائی تھی۔ وہ مزا لے کر مسکرایا، لیکن اس سے چھپانے کی خاطر فوراً سمیٹ لی۔

"تمہارے مری سے مجھے بڑے شکوے ہیں۔ جنہیں راس آئی ہے وہ آباد رہیں۔"

"ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں؟" سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں برسات تھیں، سوار کا دل پگھل کر پانی ہوا۔

"واپس آؤں گا کنعان۔ تمہارے بغیر اب کہیں سکون نہیں۔ رونا شروع کر دیا پاگل۔" وہ پیار سے ڈپٹ رہا تھا۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے تھے......" وہ پھر پلو سے آنکھیں خشک کرنے لگی۔

"سوری، تنگ کر رہا تھا۔ یہ ہفتے بھر کا پلاسٹر اتر جائے پھر ہری پور جاؤں گا۔ سنا ہے ابا جی راضی ہو گئے ہیں۔" اس نے کاشی سے ملنے کی تفصیل بھی کنعان کو کہہ سنائی۔

"ابا جی سے مل کر اسلام آباد آؤں گا۔ قسمت میں ہوا تو وہیں جاب مل جائے گی ورنہ کوشش جاری رکھیں گے۔ کہیں کام تلاش کر کے پھر کنعان رفیق کو کنعان سوار بنانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔"

"لیکن اتنی دیر بعد آئیں گے تو وہ قاسم بھائی کے سسرالی......" وہ بول تو فوراً پڑی لیکن بیچ راہ میں ہی اپنی عجلت پر شرمندہ ہو گئی۔ سوار کا قہقہہ بلند ہوا۔

"ننھی سی جان، کیسے کیسے ڈر لاحق تھے۔"

"بھئی، سر سے تو سب سے پہلے یہی بات کرنی ہے۔"

"ہاں، تو بتایا کب......" وہ خفا ہونے لگی۔

"وہ مان گئے تو انگوٹھی بھی پہنا کر جائیں گے۔ ان شاءاللہ۔" وہ اپنے پروگرام آہستہ آہستہ اگلنے لگا۔

"اب تو وہ بھی مان جائیں گے۔" اس کے خفیف ڈمپل مسکرانے سے پہلی مرتبہ گلاب سے کھلے۔

"اور تم؟" سوار کو مان جانے کے ذکر پر کچھ یاد آیا۔ کنعان نے بھی تعجب سے اسے دیکھا۔

"برف پگھل گئی؟" وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کنعان ہنس دی۔

"کنعان کا دل بھی برف نہیں تھا۔ میں نے چناروں تلے آپ کو سنتے اسی لمحے میں اپنا دل صاف کر لیا تھا۔ میں صرف اس سوار کو جانتی ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے دل نے سمجھا۔ اور جس سوار کے بارے میں صرف سنا۔ مری میں تو وہ آیا ہی نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا تھا سوار جو اس جگہ اس ماحول کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ایسا نہ کرتے تو زمانہ اپنی باتوں سے آپ کو کیا سے کیا بنا دیتا۔ تنہائی نے آپ کو اپنا محاسبہ آپ کرنے کا موقع دیا اور آپ گزرتے وقت کے ساتھ سدھرتے چلے گئے۔ لیکن جب دنیا نوکیں چبھوتی ہے تو انسان اپنی ہی غلطیوں پر آپ جواز پیش کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ پھر رفتہ رفتہ خود کو صحیح بھی سمجھنے لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ دو تلخ واقعات پیش آئے، بس اللہ پاک کی مہربانی یہ رہی کہ اس نے پردہ رکھا۔ ماہین باجی کے واقعے نے امی ابو کے ذہنوں میں دنیا کا خوف اس قدر بٹھا دیا تھا کہ امی تو ان ہونے پیش آئے صدمے کے محض خیال سے ہی دنیا چھوڑ گئیں اور ابو......" اس نے ذرا دیر

توقف کیا۔ ”ابو کی آنکھوں میں وہ ڈر ٹھہر سا گیا تھا۔ میں جب اغوا ہوئی تو اس اندھیرے کمرے میں رسیوں سے بندھے مسلسل ایک ہی بات تصور کرتی رہی کہ ابھی کہیں سے پولیس دندناتی ہوئی آئے گی اور مجھے اغوا کاروں کے چنگل سے چھڑوالے جائے گی۔ لیکن گھر واپس آکر جب پتا چلا کہ ابو پولیس وغیرہ سے رابطے میں ہچکچا رہے تھے تو میں نے صحیح معنوں میں ان کے خوف کو جانا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ از میر ہوٹل میں سب کو پتا چل چکا ہوگا۔ آس پڑوس والے جمع ہوں گے لیکن ابو میرے اغوا سے زیادہ دنیا کی نگاہوں سے خوف زدہ تھے۔“

”وہ اپنی جگہ ٹھیک تھے کنعان۔ یہ بھی اوپر والے کی مہربانی ہوئی آپ پر، ہر حال میں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جانتی ہو کنعان۔ میرے ساتھ ماضی میں جو ہوا تھا، شروع شروع میں بہت دنوں تک میں بھی اس بات پر شکوہ کناں رہا تھا۔ باغی دل و دماغ میں فاسد خیالات آتے کہ بھلا اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا، پھر میرا ہی بھرم کیوں ٹوٹا۔ مجھے ہی رسوائی کے داغ، بدنامی کے تمغے کیوں ملے لیکن آج وہی میں سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ اس کی مصلحتوں کو ظاہراً سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں جس گڑھے میں اب سے ایک سال پہلے گر گیا تھا اگر اس کی بھنک بھی کسی کو نہ پڑتی تو آج سوار عبدالعلی کیسی بگڑی ہوئی شخصیت ہوتا۔ بے ضمیر، غیرت سے عاری...... ڈھیٹ اور گناہوں سے لتھڑا۔ بنا رسوا ہوئے میں اس سوار علی سے کبھی مل نہ پاتا جس میں کنٹرول ہے، عورت کو احترام کی نظر سے دیکھنے والی آنکھ ہے...... رشتوں کا تقدس ہے، محنت کا جذبہ ہے...... سب سے بڑھ کر جسے اللہ نے بچی پاکیزہ محبت سے نوازا ہے۔ اور یہی تو نوازتا ہے۔ رب کریم کی ایسی نوازش جس کا میں اہل ہی نہیں تھا۔“

”آپ اہل تھے سوار۔ تب ہی......“

”سوار۔“ میاں جی نے دروازے کے باہر ہلکا سا گلا کھنکارا اور سوار نے کنعان کی طرف دیکھا۔ شاید رفیق سر آگئے تھے۔

☆☆☆

”صاحب میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ مری میں گزرا سوار کی زندگی کا یہ ایک سال...... اس کے چہرے پہ پڑا فریب کا دہرا نقاب نہیں بلکہ گناہ کا احساس، اس کا ازالہ تھا۔ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو گناہ کر کے اس کا دفاع کرتے ہیں، غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ غلطی پر غلطی کرتے اپنی زندگی کیا سے کیا بنا لیتے ہیں۔“ میاں جی نے سبھاؤ سے آغاز لیا اور رفیق احمد بس ہولے سے سر ہلا کر رہ گئے۔

سوار کے پلاسٹر کا آج پانچواں روز تھا۔ رفیق احمد اس شام سوار کی عیادت کر کے کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر معمول کی چند ایک باتیں کر کے کنعان کو ساتھ لیے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کا مثبت رویہ سوار کے لیے نہایت حوصلہ افزا رہا تھا۔ دوسری طرف کنعان نے گھر واپسی پر انہیں پہلی مرتبہ جمشید کے متعلق ہر بات تفصیل سے بتا کر اغوا کے متعلق ان کے ابہام دور کیے۔ ثمامہ کی باتیں بھی انہی باتوں کے دوران کھلتی چلی گئیں۔ وہ چپ چاپ اسے سنتے رہے تھے۔ اور آج پانچویں روز میاں جی ایک مرتبہ پھر ان کے روبرو تھے۔

”صاحب! انسان کو کسی کی کوئی کمزوری کوئی خطا معلوم ہو جائے تو وہ زندگی بھر کے لیے اس شخص کو اسی نظر سے دیکھتا ہے۔ جبکہ ہمارے اردگرد لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور وہ ہمارے سامنے کسی اور روپ میں آتے ہیں۔ بات صرف انسان کی خبر اور بے خبری کی ہے۔ ہو سکتا ہے نا کہ میں نے زندگی میں سوار سے زیادہ بڑے زیادہ بھیانک گناہ کیے ہوں لیکن آپ ان سے واقف نہیں اس لیے آپ کی نظر میں، میں سوار سے زیادہ اچھا ہوں۔ لیکن وہ اوپر والا خلوق کو اس زاویے سے نہیں دیکھتا۔ گناہ کی سزا وہاں بھی ہے لیکن گناہ کر کے پچھتانے اور اسے نہ دہرانے والے کے لیے کوئی سزا نہیں، صرف معافی ہے۔ اور ہم معاف نہیں کرتے، دوسرا موقع نہیں دیتے۔

میں نہ تو سوار کی کوئی گارنٹی دوں گا، نہ بڑے بڑے وعدے...... بس ایک التجا کہ ایک بار اپنے دل سے پوچھ کر دیکھیں، کیا واقعی وہ سوار کو ایک مجرم،

ایک گناہ اور غلط آدمی سمجھتا ہے؟ صاحب! اگر آپ کا دل گواہی دے کہ آپ سوار پہ بھروسا کر سکتے ہیں تو میں ایک مرتبہ پھر اس کی طرف سے رشتے کی پرخلوص درخواست لے کر آیا ہوں۔ آپ سوچیے گا ضرور۔" میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے، آپ بیٹھیے نذر بھائی! میں چائے......"

"نہیں صاحب، بہت شکریہ۔ اس وقت تو جلدی میں ہوں۔ اور اگلی بار وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے سوار کو کھلے دل سے معاف کر دیا تو اس کے والد صاحب کو ساتھ لیے ہی آؤں گا۔"

"میں نے سوار کو معاف کر دیا ہے نذر بھائی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ جاتی۔"

"معاف کر دیا ہے صاحب! تو قبول بھی کر لیں، مجھے یقین ہے سوار آپ کی امیدوں پر کھرا اترے گا۔"

"اللہ پاک بہتری فرمائے گا ان شاء اللہ۔" انہوں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا اور میاں جی انہیں دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

کنعان چائے لے کر کمرے میں آئی تو میاں جی جا چکے تھے۔ بے چینی سے بے اختیار باپ کی طرف دیکھا۔ اس روز بھی تو ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ دل بے طرح گھبرایا۔

"وہ کچھ جلدی میں تھے، میں نے چائے کے لیے روکا لیکن چلے گئے۔" رفیق احمد نے خود ہی وضاحت کرتے کنعان کی پریشانی کم کی۔ اور وہ بھی چپ چاپ وہیں بیٹھ کر ابو کے لیے چائے بنانے لگی۔ رفیق احمد نے ایک نظر کنعان کے جھکے سر کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی اسے میاں جی کی باتیں بتانے لگے۔

"میاں جی ٹھیک کہتے ہیں ابو۔ جب ہمارے علم میں کسی کی اچھائی یا برائی آتی ہے، ہم اسی کے مطابق اسٹینڈرڈ قائم کر لیتے ہیں۔ یہی دیکھ لیں کہ ماہین باجی نے جو غلطی کی تھی اس کا ہم گھر والوں کے علاوہ صرف اس ٹیکسی والے جمشید کو پتا چلا تھا اور اس نے اس کا کتنا غلط استعمال کیا اور ہم سب گھر والوں کو برا بھی سمجھا۔ یہ سچ ہے کہ جس کا کوئی قصور ہمیں معلوم نہیں، ہماری نظر میں وہ فرشتہ ہے۔ اور جس کی کوئی کمی کوتاہی ہمارے علم میں آ جائے، اسے ہم مرتے دم تک فراموش کرتے ہیں نہ معاف۔"

"ماہین میری اولاد تھی نا، اسے تو میں نے بیوی کھو دینے کے باوجود کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ تو کیا سوار کو بیٹا سمجھ کر معاف نہیں کر سکتا۔"

"جی؟" کنعان کا سوار کے نام پہ ہاتھ کانپا۔

"میں نے قاسم کے سسرالیوں کو کل ہی انکار کر دیا تھا۔ میاں جی آج نہ بھی آتے تو میرا سوار اور اس کے والدین سے ملنے کا ارادہ تھا۔" انہوں نے رسان سے بیٹی کو مطلع کیا اور کنعان کی جھکی پلکیں اٹھ نہ سکیں۔

"جیتی رہو میری بچی، اللہ پاک تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے۔" انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا اور کنعان بھاگ کر ان کے قریب آ بیٹھی۔

"مجھے معاف کر دیں ابو۔ اس روز مجھے پتا نہیں کیا ہوا، مجھے آپ کو بتا کر نکلنا چاہیے تھا۔" کنعان کو سوار کے ایکسیڈنٹ والی شام یاد کر کے جی بھر کے شرمندگی محسوس ہوتی۔

"دماغ کام کرتا تو بتا کر جاتیں نا۔" انہوں نے پیار سے کنعان کو چھیڑا اور وہ روتے ہوئے ان کے کندھے سے لگ گئی۔ اس کے بابا سچ اس کے بہترین دوست تھے۔

"آئی لو یو ابو۔" وہ روتے ہوئے ان کے بازو سے چمٹ گئی۔

"لو یو ٹو بیٹا۔" انہوں نے مسکرا کر کنعان کا ہاتھ تھپکا۔ دل نے گواہی دے دی۔

"اب سب کچھ اچھا ہو گا۔ ان شاء اللہ۔"

☆☆☆

ہری پور کی اس مہربان شام کا دامن آج قدرت کے انعاموں سے پُر تھا۔ انعام جو توبہ کے بدلے بخشش اور صبر کے بدلے راحت کی صورت سوار کے دامن میں آئے تھے۔ دل مطمئن تھا کہ غلطی کر کے اس کی معافی طلب کرنے اور اس غلطی کو

دوبارہ کبھی نہ دہرانے کا عزم ہی اس کی بخشش کا یقین بن کر دل میں اترا تھا۔ سوار عبدالعلی آج باعزت طریقے سے اپنے بڑوں کی شفقت ومحبت کے سائے تلے رفیق احمد کے گھر کی رحمت ان کی راحت کو بیاہ کر اپنے گھر لایا تھا۔ چہروں کی رونق بتاتی تھی، بدگمانیوں کے تاریک بادل چھٹ چکے۔ روشنی نے بانہیں کھول کر سوار کی زندگی میں اجالا کر دیا تھا۔

اس سے قبل سوار کچھ ڈیڑھ ماہ پہلے اپنے گھر پہلی مرتبہ واپس آیا تھا۔ اباجی بیمار تھے۔ اور اس کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ انہیں کاشی سے سوار کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تو خود ہی مری جانے کے لیے بے تاب ہو گئے لیکن ان کی طبیعت کو دیکھتے عمار بھیا کاشی کے ساتھ مری آئے اور سوار کا پلاسٹر اترا تو اسے اپنے ساتھ گھر واپس لے آئے۔ اباجی تو اسے صحیح سلامت سامنے پا کر ہی تندرست ہو گئے۔ سوار نے چند دنوں بعد ہی میاں جی کو بلوا بھیجا۔ اور انہوں نے سوار کے گزرے ایک سال کی کہانی جن الفاظ میں مولوی صاحب کو سنائی وہ خوشی سے رو ہی پڑے۔ گزرے ایک سال کے دوران اپنی نافرمان بگڑی اولاد کے بارے میں نجانے وہ کیا کچھ اخذ کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک تو سوار اچانک ایک دن ایک بڑے کریمنل کے روپ میں ان کے سامنے آئے گا اور ان کی بچی کچھی جان بھی نکال لے جائے گا۔ لیکن ان کا بیٹا دور پردیسوں میں اپنا ایک ایک پل گناہوں کے ازالے اور تلافی میں گزارتے صرف اپنے رب کی خوشنودی میں لگا تھا۔ وہاں تو کوئی اس کو جاننے والا نہ تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ تو پھر وہ جی جان سے محنت کر کے، شرافت اور سادگی بھری زندگی آخر کس لیے گزار رہا تھا۔ حالانکہ ثمامہ کی صورت میں راتوں رات امیر کبیر بننے کا شارٹ کٹ بھی مارے باندھے اس کے گلے کا ہار بنتا تھا۔ لیکن وہ اسے بھی جھٹک چکا تھا۔ مولوی صاحب سنتے جاتے اور حیران ہوتے جاتے۔

''اب تو دنیا بھی میرے بیٹے پر انگلی اٹھائے تو دفاع کے لیے پہلے اس کے باپ کو سامنے پائے گی۔''

انہوں نے فخر سے سوار کی طرف دیکھا اور وہ اتنی تعریف پر بس میاں جی کو گھور کر رہ گیا۔ وہی تھے جن کی زبان کو آرام ہی نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا قصے نکال کر بیٹھے تھے۔

چند دن میاں جی کی خوب خاطرداری کر کے وہ اباجی اور میاں جی کو ساتھ لیے دوبارہ مری آیا۔ مولوی صاحب یہاں اس کے سب ہی جاننے والوں سے ملے تو جیسے میاں جی کے کہے کی تصدیق ہو گئی۔ ازمیر ہوٹل میں پہلی بار صدیق قاسم اور عصمت علی کا سوار کے اصل باپ سے تعارف اور ملاقات ہوئی۔ مال روڈ پہ دلیر بھائی اور عمران سے ملنا ہوا، ڈھابے پر رب نواز اور فخری سے۔ مٹھائی کی دوکان پر مشتاق بھائی۔ مولوی فیض الحسن کو لگا پورا مری ان کے بیٹے کے گن گا رہا ہے۔

''تم نے تو بھئی کمال کر دیا۔'' وہ خوشی سے دمکتا چہرا لیے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

''گیارہ عدد باجیوں اور بہنوں سے بھی ضرور ملواتا، اگر جو آپ کوکنگ اسکول کے دنوں میں آتے۔'' اس نے مسکرا کر میاں جی کی تائید چاہی۔

بادلوں بھری اس شام میں وہ ڈھابے کے باہر کھاٹوں پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میاں جی نے کچھ دیر سوچتے ہوئے انگلیوں پر حساب کرنا چاہا پھر سمجھ میں آنے پر سر ہلاتے مسکرا کر سوار کو دیکھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کوکنگ کلاس کے دنوں میں پندرہ لوگوں کا ذکر چلتا جن میں سے تین تو وہ مرد حضرات تھے۔ تو مطلب کنعان کو چھوڑ کر گیارہ بہنیں۔ اب وہ لطف لے کر ہنس رہے تھے۔

مولوی صاحب نے رفیق احمد سے مل کر باقاعدہ رشتے کی بات بھی کر لی تھی۔۔ اور انہوں نے اپنی بہن بیٹی داماد سے مشورے کے بعد اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا تھا۔ باہمی صلاح مشورے سے مہینے بھر بعد شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔

اور آج کنعان دلہن بنی اندر خواتین میں اس کی منتظر تھی۔ رفیق احمد، رابعہ پھوپھو، ماہین باجی، دیا اور اس کی امی دلہن کے ساتھ ہی ہری پور آئے تھے۔ وہ

بھی سوار کے بہت اصرار پر، کیونکہ رشتے وغیرہ کی تمام باتیں مری میں طے پا جانے کے بعد سے وہ لوگ ایک بار بھی یہاں نہیں آئے تھے۔ سوار چاہتا تھا رفیق سرضرور اپنی تسلی کے لیے ان کے یہاں آئیں۔ اور آج ان کے چہرے کی خوشی بتاتی تھی کہ اپنی بیٹی کی قسمت پر وہ رشک کررہے تھے۔ سوار ایک کھاتے پیتے گھرانے کا خوش حال لڑکا تھا۔ ان کا گھر رہن سہن، گھر والوں کی طبیعت۔ سب ان کے اطمینان میں اضافہ کررہے تھے۔

"آ بھی جائیں دولہے میاں۔ وہاں کیوں رُک گئے۔"

آمنہ بھابھی کی شوخ آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ حال میں لوٹا۔ بھابھی سامنے برآمدے میں اسی کے کمرے کے باہر کھڑی تھیں۔

"ہماری بہورانی پہلے ہی اتنے لمبے سفر سے تھک چکی ہے، اب تم نہ انتظار طویل کرواؤ۔" وہ صحن میں نکل کر اسے بازو سے کھینچ کر کمرے کے قریب لے آئیں۔

"بھابھی......" اس نے عجلت میں واپس مڑتی آمنہ بھابھی کو آواز دے کر روکا۔ سوار کے لہجے کی سنجیدگی پر آمنہ تعجب سے مڑیں۔ سوار واقعی سنجیدہ تھا۔

"آپ کا شکر گزار ہوں بھابھی۔ اس رات آپ میری مدد نہ کرتیں تو زندگی کا اس رخ پہ جانا ناممکن تھا شاید......"

"سوار۔" وہ محبت سے کہتے اس کے قریب آئیں۔ اور یہ بھی سوار کی التجا تھی کہ کم از کم گھر والے اب اسے اسی نام سے بلائیں گے۔ "تمہاری امی زندہ ہوتیں تو وہ بھی یہی کرتیں نا؟ تو بتاؤ، کیا میں نے تمہیں بیٹے سے کم سمجھا ہے کبھی؟"

"اسی لیے کنعان کو بہو کہا جارہا تھا۔" وہ اس بار ہلکے پھلکے مسکرا دیا۔

"ہاں۔ کیونکہ اس کا نام لینے کی عادت آہستہ آہستہ ہی پڑے گی۔"

"جی۔ لیکن مجھے کافی پریکٹس ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے سر جھکایا تو بھابھی نے اس کا کان کھینچا۔

"پوری کہانی الف سے یے تک سنانی ہوگی مجھے۔ ایک لفظ کی بھی رعایت نہیں۔"

"جو حکم میری اماں۔" اس نے سر جھکا دیا اور آمنہ بھابھی نے ہنستے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے کچھ دیر تو چوکھٹ پہ کھڑا اندر کی صورت حال دیکھے گیا۔ کنعان سر جھکائے بھی کافی سٹپٹائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ غالباً بھابھی سے باتیں کرتے اس کی آواز سن چکی تھی۔ سوار نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور دوسری تفصیلی نگاہ کنعان کی تیاری پر ڈالی۔

نکاح کی رسم کے بعد چار بجے مری سے ان سب کی روانگی ہوگئی تھی۔ یہاں آکر بھی وہ مردانے میں ہی رہا۔ اب تک کے تمام وقت میں اس کی اڑتی پڑتی سرسری نظر ہی کنعان پر گئی تھی۔ سرخ اور لائٹ گرین لہنگے میں سجی سنوری کنعان آج عام دنوں سے بالکل ہٹ کر بہت الگ دکھائی دے رہی تھی۔ دلہن کے روپ کا بھلا اب تک اس نے تصور ہی کہاں کیا تھا۔ وہ بھی اس کی ہوگی پورے حق اور دنیا کی رضامندی کے ساتھ، ایسا تو سوچنا بھی ناممکنات میں سے لگنے لگا تھا۔

"سب آپ کی مہربانی ہے ثمامہ ابراہیم۔" سوار کا تصور تک تلخ ہوگیا۔ جیت لینے کی راہ میں ایک انتہا کی بے حسی اور اس شدت کی خود غرضی۔ اللہ کے وجود کو بھلا بیٹھی تھیں غالباً۔ وہ اپنی سوچ کی کڑواہٹ پر سر جھٹکتے حال میں واپس آیا۔ اس کی معصوم پری کس شدت سے اس کی آمد کی منتظر تھی۔ سوار علی نے بھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا اس لیے اس کے ساتھ بھی برا نہیں ہوسکتا تھا، یہ یقین بہرحال اندر کہیں زندہ تھا۔

سوار نے مسکرا کر کنعان کی بے چینی اور اضطراب کو جانچا۔ کمرے کے اندر آکر بھی ابھی تک وہ بت بنا کھڑا تھا۔ کنعان اب نروس ہورہی تھی۔ سوار نے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب جاکر گھڑی، موبائل، بٹوہ وغیرہ سامنے رکھتے آئینے میں اس کی لرزتی مضطرب پلکوں کو دیکھا۔ معلوم نہیں آج وہ اتنی

گھبرائی ہوئی کیوں تھی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر یا اجنبی نہ تھے، تعلق تو نہایت دوستانہ رہا تھا۔ وہ تو اس کے مسکرا کر استقبال کرنے کی توقع کر رہا تھا لیکن محترمہ تو نگاہیں اٹھا کر دیکھنے تک کی روادار نہ تھیں۔ سوار نے مسکرا کر گلا کھنکارا۔

"تمہاری خاموشی تو اب مجھے بھی نروس کر رہی ہے۔ کیا ہوا، دولہا پسند نہیں آیا؟" وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ایک ہتھیلی بیڈ پر ٹکاتے اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آخری جملے پر جس کی ہلکی سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی تھی۔

"شکر ہے تم ہنسیں تو...... مجھے تو اب تمہارے کنعان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔" اس نے اپنا شک ظاہر کیا اور کنعان نے بس سوالیہ ایک نظر اٹھائی۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو، لیکن اپنی کنعان...... کنعان سی نہیں لگ رہیں۔" اس نے آنکھیں سکیڑیں، کنعان اس بار ہنسی نہیں روک پائی۔

"ویسے...... آج بولتی کیوں بند ہے؟"

"وہ...... یہ میک اپ، زیور اور بھاری ڈریس......" وہ شرمائی شرمائی سی بمشکل حلق کھول پائی، دل چاہ رہا تھا کہیں غائب ہی ہو جائے۔

"مطلب میک اپ زیور وغیرہ کی وجہ سے بولتی بند ہے؟" سوار خود بھی اچنبھے میں پڑ گیا۔ کنعان کی کھنکتی ہنسی کی آواز کمرے میں گونجی۔

"نہیں...... وہ کنعان لگنے والی بات......"

اس بے چاری کا گھبراہٹ نے چہرا سرخ کر دیا۔

"آں۔ صحیح...... یعنی جب ہمیں اپنی بہت پیاری بہت محبوب ہستی کو اپنا لینے کی یقین دہانی چاہیے، یہ ظالم دنیا شک کے راستے ہموار کر دیتی ہے۔"

"میں کنعان ہی ہوں۔" نہایت معصومیت سے یقین دلایا گیا، سوار نے قہقہہ اندر روکا۔

"اچھا۔" وہ تھوڑا سا آگے کو جھکا اور اس کے گود میں رکھے ہاتھ کو اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا۔ "تو یہاں، میری آنکھوں میں اپنی شفاف چمکتی اپنائیت بھری آنکھوں سے دیکھ کر اپنے ہونے کا یقین دلاؤ۔ میری بے یقینی ان لمحوں میں کسی حسین خواب سے کم نہیں۔ اور یہ خوب صورت حسین خواب تمہیں پہلی مرتبہ دیکھ لینے کی دھند بھری پہلی رات سے پچھلی آخری رات تک بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ آج تم مجسم اس خواب کی تعبیر ہو کنعان تو یقین آنا محال ہے۔ سوار کی خوش نصیبی کہیں آج بھی ایک پر فریب دھوکا ثابت نہ ہو۔ یقین آنے دو کنعان کہ تم واقعی میری خوش بختی ہو۔ کسی شازمہ، کسی ثمامہ کا بچھایا کوئی جال نہیں۔ مجھے یقین آنے میں اس بار شاید ایک مدت درکار ہو کنعان۔ جھوٹ اور فریب کے حسین ریشمی دھاگوں نے میرے گرد بہت کس کے جال باندھے۔ اب میں منزل پر ہوں تو امید وبیم کی کیفیت میرے حواس کھو رہی ہے۔"

وہ نرمی، لطافت اور محبت سے آغاز لیتے نجانے کب پھر سے اتنا متزلزل ہونے لگا۔ آواز بھرائی سی اور لہجہ انتہا کا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کنعان نے اس کا ہاتھ ایک جذب سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آج کے بعد آپ ایسا کچھ نہیں سوچیں گے سوار۔ کنعان دھوکا نہیں، سچ سچ آپ کے ٹھہراؤ...... آپ کی منزل کا نام ہے، وعدہ کریں سوار۔ میری محبت کے سچ کو کسی اور کے جھوٹے ترازو میں تو لنے کی کوشش نہیں کریں گے، میرے وجود میں کسی اور کا عکس، کسی اور کی پرچھائیں بھی محسوس نہیں کریں گے۔ ہماری سچائی ہمارے خلوص نے آج ایک دوسرے کو پایا ہے۔ ہم دونوں ہی اس یقین کے سہارے آگے بڑھیں گے۔ کسی غلط فہمی کسی شک کے بیج کو ہمارے بیچ پروان نہیں چڑھنے دیں گے۔ اور اگر ایسا ہوا، تو یاد رکھیں سوار۔ کنعان اپنی صفائی میں بنا ایک لفظ بولے چپ چاپ آپ سے دور ہو جائے گی۔ میرے پاس سوائے میری محبت، میرے خلوص کے اور کچھ نہیں ہے۔"

وہ سوار کے محض دو ہی جملوں سے یک لخت اتنی سراسیمہ اتنی بے بھروسا ہو گئی تھی کہ لرزتے ہاتھوں سے سوار کے ہاتھ پر مسلسل اپنا دباؤ بڑھاتے روئے چلی جا رہی تھی۔ آنسو ایک تو اتر سے اس کی آنکھوں سے بہنا شروع ہوئے تو بے لگام رخساروں پر بہتے ہی چلے جا

رہے تھے۔ بے ربط ٹوٹے پھوٹے جملوں سے وہ آج اسی لمحے سوار کے ہر وہم ہر خدشے کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ جبکہ سوار اس کے بہتے آنسوؤں، اس کی لڑکھڑاتی زبان، اس کے جملوں پر سخت متعجب، شرمندہ اور بے یقین سا بس اسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔

"میں نے تو بس ایک بات......" وہ اس کی روئی آنکھوں میں تکتے شاید اس لمحے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین مرد سمجھ رہا تھا۔ اس کی کنعان اس سے بڑھ کر اس کے لیے پریشان تھی۔

"یہ ایک بات نہیں ہے سوار۔ شاید آغاز ہے ہماری محبت کے امتحان کا، اور میں کنعان سوار علی اپنی جان دے کر بھی اس امتحان میں پوری......" کپکپاتے لبوں کا وہ اقرار تو سوار کی بھی جان کھینچ لینے کے مترادف تھا۔ بے اختیار اس نے کنعان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ایسا کبھی مت کہنا کنعان۔ میری زندگی میری سانسوں سے جڑی ہو تم۔ مجھے یقین آنے تک۔ میرے پر یقین ہونے کے بعد تک۔ حتیٰ کہ میری زندگی کے اکتا دینے والے وقت تک تم میرا ساتھ دو گی۔"

"اچھا۔" وہ اس کے سینے سے سر لگائے روتے روتے ہنس پڑی۔ "میرے ساتھ سے اکتا بھی جائیں گے ایک دن؟"

"ہاں۔" وہ ایک جذب سے مسکرایا۔ "یہ بھی ایک نیک شگون ہوا کرتا ہے میری جان، ہم دونوں ایک دوسرے سے تھک ہار جائیں تو مطلب وہ بھی ایک طویل سفر کا انجام ہوگا۔"

"یہ آدمی تو سچ میں بے وفا ہوتے ہیں۔ میں تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔"

اس نے سوار کے سینے پر ہلکا سا مکا مارتے شکوہ کیا۔ مسکراتے ہوئے اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ سوار کے بازو کے گھیرے میں قید وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ جھک کر اس کا چہرا دیکھتا سوار بڑا پیارا سا مسکرا دیا۔

"جانتا ہوں۔" اس نے کنعان کا چہرا ایک مان اور غرور سے اوپر اٹھایا۔ "اور یہ بات میری کنعان کے سوا کوئی کہہ بھی نہیں سکتا۔ نہ ان کانوں کو سوائے کنعان کے اب کسی اور سے اظہار سننے کی حاجت ہے۔" اس نے کنعان کے بازو پہ رکھے اپنے ہاتھ کو نرمی اور محبت سے دباتے اسے کچھ اور اپنے قریب کیا۔

"تم بولو کنعان۔ بولتی جاؤ......اور میرا تھکا ہارا مسافر دل بس سنتا چلا جائے۔ تم ہی ہو ندی کنارے کا وہ ٹھنڈا پرسکون گوشہ جس میں پوری ایک عمر قیام کرنے کو یہ مسافر اب اور کسی منزل کی تلاش میں کہیں نہیں جائے گا۔"

"اور مجھے بھی تو آپ کو سننا ہے۔" وہ نیچے دیکھتے شرمیلا سا مسکرا رہی تھی۔ سوار نے کچھ دیر خاموش رہ کر اسے دیکھا لیکن لبوں پر آنکھوں میں بڑی شرارتی سی ہنسی تھی۔ کنعان نے جواب نہ ملنے پر تعجب سے سر اٹھایا تو اس کی ہنسی کو نا سمجھنے والی نظروں سے دیکھے گئی۔

"بس صرف سننا......؟" چمکتی آنکھوں میں مبہم سی تابنا کی لیے وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

کنعان نے گڑبڑا کر نظر ہٹائی، مزاج کے بدلتے رنگ بڑا ہی نروس کر دینے والے تھے۔ ماحول کا رومانوی اثر جو اول اول اس پر بڑی ہی گھبراہٹ طاری کر رہا تھا، گفتگو کے آغاز نے اُسے کچھ دھیما اور سہل کر دیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر بے ساختہ اس سے دور ہوئی۔

"اچھا؟" سوار نے آنکھیں چھوٹی کرتے داڑھی کھجائی۔ "مطلب واقعی صرف سننا؟" لیکن کنعان کوئی جواب نہ دیتے بس دوپٹا اپنی جانب کھینچ کر رہ گئی اور سوار نے دایاں ہاتھ چپکے سے سائیڈ ٹیبل کی طرف لے جاتے ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

زندگی کا یہ نیا سفر، اس بار اپنوں کی خوشی، اُن کی رضامندی کے ساتھ شروع ہوتے ایک سکون اور تکمیل چاہتا تھا۔ ضمیر مطمئن تھا، روح آسودہ تھی۔ خوشیوں کی جانب بڑھتے اس کے ہاتھ میں اس مرتبہ صبر و استقلال کے ثمر کی صورت اُس کی جائز، سچی خوشی تھی۔

☆☆

سالگرہ نمبر
کرن
نورشال
ایسا بھی ہوتا ہے

شہر کے مشہور بزنس مین فاروقی صاحب اس وقت شہر کے مہنگے ترین ہوسپٹل میں انتہائی پریشانی کے عالم میں تقریباً آدھے گھنٹے سے اِدھر سے اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی پریشانی سے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کو مسلتے تو کبھی ایمر جنسی کی طرف دیکھتے۔ کل رات اچانک ان کی ماں کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ فاروقی صاحب جانے مانے بزنس مین تھے اس لیے رات جب ایک بجے ماں کی طبیعت بگڑی تو اسپتال لے آئے اور ایمر جنسی میں انہیں شفٹ کر دیا گیا تب سے لے کر اب تک وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ پڑی تھیں۔ اپنی بیس سالہ بیٹی اور بیگم کو وہ رات ہی گھر بھیج چکے تھے۔

آنکھوں کے سرخ ڈورے ان کے رت جگے کا پتا دے رہے تھے۔ منفی سوچوں میں غلطاں فاروقی صاحب اچانک ایمر جنسی کا دروازہ کھلنے پر تیزی سے اس طرف بڑھے جہاں ڈاکٹر شاہد اقبال متفکر سے نظر آئے۔

''ڈاکٹر صاحب کیا کنڈیشن ہے، ماں جی کو ہوش آیا یا نہیں۔ پلیز بتائیں۔''

''دیکھیں فاروقی صاحب ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں کہ جلد ہوش آجائے لیکن پیشنٹ کی حالت بہت خراب ہے اگر انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آیا تو دماغ کی شریانیں پھٹ سکتی ہیں۔ پھر ان کا بچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ بالفرض اگر انہیں ہوش آبھی جاتا ہے تو نوے فیصد کوے میں جانے کے چانسز ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنے مخصوص پیشہ ورانہ لیکن نرم لہجے میں تفصیل بتائی تو فاروقی صاحب کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

''ڈاکٹر پلیز آپ کو جو کرنا ہے کیجیے لیکن ماں جی کو بچالیں۔ انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ روہانسے ہوئے۔

'' فاروقی صاحب بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے، ہم تو بس وسیلہ بنتے ہیں۔ معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی ضرورت ہے۔ آپ دعا کریں ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' تسلی دیتے ہوئے ڈاکٹر نے فاروق صاحب کا کندھا تھپتھپایا اور آگے کی طرف بڑھ گئے تو فاروقی صاحب نے بمشکل دیوار کا سہارا لیا، اتنی سیریس کنڈیشن کے باوجود ان کی آنکھوں میں اب بھی امید کے دیے جل رہے تھے۔

☆☆☆

مسز فاروق تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو ان کی بیس سالہ بیٹی مناہل جو لاؤنج میں بیٹھی بے دلی سے میگزین کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اس کی نظر ان پر پڑی اور وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''مما کیا آپ ہاسپٹل جا رہی ہیں۔ پلیز مجھے بھی ساتھ لے چلیں مجھے دادو سے ملنا ہے۔''

''نہیں تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں ذرا پارلر جا رہی ہوں۔'' مسز فاروقی نے لاپروائی سے کہا تو وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''لیکن مما آپ بیوٹی پارلر کیسے جا سکتی ہیں؟ دادو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں وہ بھی بہت سیریس کنڈیشن میں، اس وقت پاپا کو ہماری سخت ضرورت ہے۔'' وہ جھنجھلائی۔

''دیکھو بیٹا! ڈاکٹرز کچھ خاص پر امید نظر نہیں آ رہے۔ تمہاری دادو ابھی تک بے ہوش پڑی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا وہ زیادہ دیر تک پائیں گی۔ یہاں بہت کام پڑا ہے۔ ہم جس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں وہاں فوتگی پر بھی شادی کے برابر اخراجات ہوتے ہیں۔ میری اسکن بہت ڈل ہو گئی ہے۔ اس لیے میرا پارلر جانا ضروری ہے۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں سے ہمارا ملنا ملانا ہے۔ وہ کیا سوچیں گے؟''

''مما آپ اتنی سیلفش کیسے ہو سکتی ہیں؟ آپ کو اب بھی اپنی اسکن اور شان و شوکت کی پڑی ہے وہاں دادو ہاسپٹل میں زندگی اور موت کے درمیان جنگ لڑ رہی ہیں۔'' مناہل نے گلوگیر لہجے میں کہا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

''تمہاری دادو عمر کے جس حصے میں ہیں اوپر سے بلڈ پریشر کی مریضہ بھی ہیں تو کسی وقت بھی اللہ کا بلاوا آسکتا ہے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں اس وقت فضول بحث کے بالکل

موڈ میں نہیں ہوں۔ تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ ویسے بھی وہاں تمہارے پاپا اکیلے ہوں گے۔'' مسز فاروقی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور یہ جا وہ جا۔ مناہل تاسف سے سر ہلاتی رہ گئی۔

☆☆☆

مہنگے ترین بیوٹی پارلر سے ''فیشل'' اور ''پیڈی کیور، مینی کیور'' کروانے کے بعد مسز فاروقی جیسے ہی باہر نکلیں، ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ بدقسمتی سے دائیں طرف ٹرن لیا تو سامنے سے اچانک ٹرک آگیا۔ بدحواسی میں ڈرائیور گاڑی کے اسٹیرنگ پر قابو نہ رکھ سکا جس کے نتیجے میں گاڑی بری طرح سے لکڑی سے بھرے ہوئے ٹرک سے ٹکرائی۔ دھماکے کی آواز پر لوگ بوکھلا کر اس گاڑی کی طرف بڑھے۔ لیکن ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ مسز فاروقی وہیں دم توڑ گئیں۔ ان کا چہرہ بالکل بگڑ چکا تھا جس کی وجہ سے پہچان نہ ہو سکی جبکہ ڈرائیور شدید زخمی تھا اسے فوراً قریبی اسپتال میں داخل کیا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے ٹریٹ منٹ کے بعد ڈرائیور کو ہوش آگیا۔ ہوش میں آتے ہی اس سے ایڈریس پوچھ کر مسز فاروقی کی ڈیڈ باڈی کو ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

مسز فاروقی کے کفن دفن کے مراحل سے فراغت کے بعد فاروقی صاحب کے پاس تعزیت کے لیے ابھی تک لوگ آ جا رہے تھے۔ فاروقی صاحب گہرے صدمے سے گزر رہے تھے ان کی زندگی جیسے رک سی گئی تھی۔ عین اسی لمحے ڈاکٹر شاہد اقبال کی فون کال ایک خوش گوار جھونکا بن کر آئی۔ ماں جی کی حالت خطرے سے باہر تھی' ڈاکٹرز نے انہیں کمزوری کی وجہ سے دو دن بعد ڈسچارج کرنے کو کہا۔ فاروقی صاحب خدا کا شکر بجا لائے اگر ایک طرف غم ملا تھا تو دوسری طرف مداوا بھی کر دیا گیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور نہ ہی ظلم کرتا ہے۔ اس بات پر فاروقی صاحب ایمان لا چکے تھے۔ پاس بیٹھی اپنی بیٹی مناہل کو مختصر صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد وہ باہر مہمانوں کے پاس چلے گئے، جو ابھی تک قدرت کے اس فیصلے پر حیران تھی، شاکڈ تھی۔

☆☆☆

آج مسز فاروقی کی پہلی برسی تھی۔ مناہل نے قرآن خوانی کا بھرپور اہتمام کروایا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کی روح کو ان سب کاموں سے ہی سکون مل سکتا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ماں کے نام کا ایصال ثواب اور صدقہ کروا رہی تھی۔ ایک سال کیسے بیت گیا پتا ہی نہیں چلا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی کل کی ہی بات ہو۔ اس حادثے کے بعد مناہل اللہ کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا۔ اور رو رو کر اپنی ماں کی مغفرت کی دعائیں مانگتی رہتی۔

''زمین پر اکڑ کے نہ چلو......

آج زمین تمہارے قدموں کے نیچے ہے اور کل تم اس زمین کے نیچے ہو گے۔''

مناہل کو آج اس کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ وہی ظاہری صورت جسے سنوارنے میں انسان اتنی محنت کرتا ہے۔ دکھاوا کرتا ہے دوسرے ہی لمحے وہ منوں مٹی تلے دب جاتی ہے۔ انسان کون ہوتا ہے زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والا یہ حق تو صرف اللہ کو حاصل ہے۔ انسان کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ موت برحق ہے جو کسی پل بھی آسکتی ہے۔ جو بچپن جوانی اور بڑھاپا نہیں دیکھتی۔ بے شک اللہ بڑا بے نیاز ہے وہ اپنا بھید کسی کو نہیں دیتا۔ انسان کی سوچ بہت چھوٹی اور محدود ہے وہ اتنا ہی جانتا ہے جتنا اللہ چاہتا ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

آہ! زندگی بھی عجیب چیز ہے جس میں سوچا ہوا کچھ اور ملا کچھ اور۔

یہ زندگی بڑی عجیب سی، کبھی گلزار سی کبھی بیزار سی
کبھی خوشی ہمارے ساتھ ساتھ ہے، کبھی غموں کی غبار سی

☆☆

منعم ملک

مونگ پھلیوں کے چھلکوں کو چرمراتے شب کے اولین پہر، کینوؤں کے پُرنم انباروں پر سے پھسلتے اور گاجروں کے پھوگ سے اٹھتے تاریکی کے چہرے پر بارہ بجانے لگے ہیں۔ سرما اپنی ڈھلتی عمر کے باوجود بہار کی رنگین جھلک دیکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہے...... اور رات اس کی

چوری نہ پکڑنے کے لیے اپنے وجود میں کامل سناٹے چھپائے، بہتی جارہی ہے۔

آپ نہ نجانے مجھے کس پہر پڑھ رہے ہیں مگر اتنا یقین ہے کہ میرے قصے کے پچھلے حصے سے میں آپ کو خوب یاد ہوں گا۔ اور یہ بھی آپ سمجھ ہی رہے ہوں گے کہ میرے جیسا شخص موسم کی شوخیوں و شرارتوں کا سوچ کر ہی دل بہلا سکتا ہے...... تو میں بس وہی یعنی شدید قسم کا کنوارہ شخص...... غافل حسین......

تو رات کے چہرے پر بارہ بجے ہیں اور عبید چھت پر میرے ساتھ بیٹھا بڑھ چڑھ کر میرے زخموں پر نمک مرچیں چھڑک رہا ہے۔ بلکہ لیموں نچوڑ رہا ہے۔

"میں تجھے بتا رہا ہوں غافل اس طرح ہوگئی تیری شادی...... یہ سارے بہانے ہیں، قسمت سے اچھی لڑکی ملی تھی مگر وہ بھی گنوادی۔ ویسے یہ بھی ہے کہ ہر کسی کی قسمت میرے جتنی اچھی بھی تو نہیں ہوتی...... اب یہی دیکھو فٹافٹ کیسے میری منگنی ہوگئی اور ساری گلی مٹھائی ڈکارتی پھر رہی ہے...... تجھے کیا خبر ایک مرد کی شان پر کیا اثر پڑتا ہے کہ پہلی ہی واری

اسے پسندیدگی کی سند دے کر کڑی چلتی کر دی جائے۔" عبید نے گلشن کی طرف اشارہ کر کے پہلے میرے حلق میں کڑواہٹ انڈیلی پھر اترا کر سینہ چوڑا کر لیا۔ منحوس کی دو دن پہلے منگنی کیا ہوئی تھی خود کو کسی ریاست کا فاتح سمجھ رہا تھا۔

"اس میں مردانگی کی بات کہاں سے آگئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکی بیٹھے بیٹھے گھر والوں کے سینے پر اتنے مونگ دَل چکی ہو کہ اپنا بوجھ کم کروانے کے لیے گھر والوں نے فوراً تمہارے سر پر منڈھ دیا ہو...... ورنہ شریفوں کا یہ وتیرہ ہے کہ پہلے اچھی طرح تسلی کر لیتے ہیں ہماری طرح......" میں نے اس کی عقل ٹھکانے لگائی مگر وہ بغیر اثر لیے سکون سے گویا ہوا۔

"ناں ناں میرے بھائی! آج کے دور میں قدر دان لوگ یہ کفران نعمت ہرگز نہیں کرتے۔ میری بیوی کی ماں تو میرے آگے پیچھے بچھی جا رہی تھی۔"

"خیر، مجھے ایسی، قالین، چٹائی یا کمبل جیسی ساس درکار نہیں جو بچھ بچھ جائے...... اور منکوحہ کہو! بیوی بنی نہیں تمہاری......" میں نے گھور کر تصحیح کی۔

"ارے بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، اور یہ منگنی بھی ملکیت کی علامت ہوتی ہے...... پانچوں وقت مجھے جاں نثار سے میسج کرتی ہے اور پتا ہے آج کل تو اس کا فیورٹ گیت بھی یہی ہے...... وے توں تقدیر میری...... وے رانجھنا میں ہیر تیری۔ لیکن خیر تو کیا سمجھے گا اس محبت کو......"

"سمجھنا بھی نہیں ہے۔ پہلے ہی کیا کم مغز ماری ہوئی ہے۔" میں نے اکتا کر اس موضوع سے ہٹنا چاہا۔ حالانکہ عبید کی کمینگی سے بھی واقف تھا کہ وہ اس بات کو جانے نہیں دے گا۔

"بے وقوف ہے نا تو! گلشن اچھی بھلی تھی، اگر سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا تو......"

"تو دادا جی اپنا چمڑے والا کھسہ اُتار کر میرے سر پر کھڑے ہو جاتے...... ٹھیک ہے اچھی تھی گلشن مگر اتنی سیدھی بھی نہیں تھی۔ موٹر سائیکل پر گھر چھوڑنے گیا تو سارا راستہ مجھے بھڑکاتی رہی کہ میرے گھر والے جھگڑالو ہیں، کم عقل ہیں میں اس کے ساتھ الگ دنیا بسا لوں...... ایسا بھی ہوتا ہے بھلا، شکل سے معصوم اور عقل سے ایسی کچی عورت۔ کچھ بھی ہو جائے مجھے اپنے گھر والوں سے بہت محبت ہے...... بس یہ ان بن ہے جو رشتوں کی خوب صورتی میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے اور اچھی بات ہے کہ پہلے ہی اس کی نیت معلوم پڑ گئی ورنہ دوسری نسیمہ بھابھی تیار تھی اکھاڑے میں آنے کے لیے...... اور پھر تُو اک پاسے کھڑا بھابھی اور بیوی کی ڈاکومنٹری کر رہا ہوتا۔" عبید نے بے شرمی سے زوردار قہقہہ لگایا۔ "دیکھ اب میرے مشورے پر غور کر، اسی طرح چلتا رہا تو تیرے گھر والے پھر سے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ کیا یہ اچھا لگے گا کہ تجھ سے چھوٹا ہو کر میں پہلے گھوڑی چڑھ جاؤں اور ابا کہلاؤں جبکہ بڑا بھائی......"

ضبط کی انتہا پر جا کر دانت پیستے ہوئے میں نے اس کی بات کاٹی۔

"کیا بڑا، بڑا لگا رکھا ہے تُو کوئی ایسا بھی منا کاکا نہیں ہے۔ دوسری جماعت میں تو پرائمری اسکول کی دیوار پھلانگنے کے لیے اُوپر تو ہی چڑھتا تھا پھر مجھے ہاتھ دیتا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ سے دو چار سال بڑا ہی ہو گا...... آیا ریشم کا جڑواں بھائی۔"

"تو کیا ہوا مڈل اسکول سے اُٹھ کر تو مجھ سے پہلے تو ہی گیا تھا اور جاب بھی پہلے مار لی...... جبکہ میری تعلیم ہوتے ہوتے ہی ہوئی۔"

"نالائق گدھوں کا بھی الگ ہی اسکوپ ہے۔ اب اس معاملے میں ہر کسی کی قسمت میرے جیسی روشن تو نہیں ہوتی...... کیسے کہتے تھے استاد کہ غافل کے نصیب پیشانی پر لکھے ہیں، ابا کا ہونہار بچہ...... تجھے چھتر مار مار کر رعایتی پاس اور دیسی انڈوں کے کریٹوں کے لالچ دے دے کر بھیک میں پاس فیل

کروایا جاتا رہا تو میری عمر کا قصور؟ شاباش بیٹا۔''
میں نے اپنی ساری بھڑاس ایک ہی سانس میں نکال کر اس پر چڑھائی کردی تو وہ سٹپٹا کر ذرا دور ہو کر بیٹھا اور خفت چھپانے کو بات بنانے لگا۔
''کوئی بات نہیں، گرتے ہیں شہسوار ہی میدانوں میں...... اور خرگوش، کچھوے کی دوڑ میں کون جیتا تھا؟ رینگ رینگ کر چلنے والا...... تو تیرا نقصان کیا ہوا؟ تیرے ابا نے تیرے نصیبوں کی پیشانی چوم چاٹ کر یا وہ کی لکیریں ہی مٹا ڈالیں...... اصل قسمت تو یہ ہے جو میری لش پش جگمگا رہی ہے۔ تُو تو لگتا ہے جل بھن ہی گیا......'' عبید نے بات جوڑ توڑ کر کے واپس اپنے مطلب کی بات نکال لی۔ اور ساتھ ہی اپنی بتیسی کی نمائش...... میں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
''تندیِ بادِ مخالف سے نہیں گھبراتے عقاب...... یہ تو چلتی ہے ہمیں اونچا ہاتھ مروانے کے لیے۔ لکھ لے میری بات تجھ سے پہلے میرے روشن نصیب میری دلہن مجھ تک کھینچ لائیں گے۔ پھر تو کھڑا ہو گا راستے میں اور ہم سامنے سے گزر جائیں گے۔''
''ہاہاہا ذرا دھیان سے سامنے دیکھ ضرور لینا جو پورا ٹبر راستہ روک کے کھڑا ہو گا۔ یہ نہ ہو سفید گھوڑا کسی کے گوڈے گٹے پر چڑھاتے جاؤ۔''
اس کے قہقہے کی آواز میں تو کیا فون سے میسج رنگ ٹون سنائی دی تو میں نے کچھ کہنا ترک کیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ رات کی چادر پر سجے نگینوں کی چمک میں سارے محلے کے گھر پر اسرار خاموشی تانے کھڑے تھے۔ رات بھی عجیب تھی ایسا لگتا تھا سارے شور محض اس لیے گونگے ہوئے مانو کوئی ڈائن پھیرا کاٹ گئی ہو۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے نیند کا خیال ذہن میں لانا چاہا جب عبید نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے مجھے جھنجوڑا۔
''یہ دیکھ اپنی بھابی کا میسج...... جب تک مجھ سے کال پر بات نہ کر لے اسے نیند کہاں آتی ہے۔ اب بھی میرے لیے کیسی شعر و شاعری فرما رہی ہے۔''
''تو کر لیتے بات، یہاں میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟''
''سڑی ہوئی چیز چاٹنے سے مجھ کو کیا حاصل، میں تو تمہارا غم غلط کرنے آیا تھا۔ مجھ سے تیری تنہائی دیکھی نہیں جاتی...... کچھ تو تجھ سے بھی مزے دار سا سننے کو ملے۔ یہ دیکھ پروین جی نے میری محبت میں لکھا ہے......

دل درد کرتا ہے صنم کوئی دوا بھیج
کاغذ کے ایک پرزے پر تصویر اپنی بنا بھیج

''استغفر اللہ...... موصوفہ تو دل کی مریضہ لگتی ہے۔ رکشہ ٹرک چھاپ شعر......'' میں بھنا کر بولا۔ عبید فوراً برا مان گیا۔
''بددعا تو نہ نکالو! وہ مریضہ ضرور ہے مگر اسے مرضِ عشق لاحق ہے۔ یہ عشق کا وہ مقام ہے جہاں عاشق کے لیے صرف تصویر ہی دوا شفا سب بن جاتی ہے...... انسان پھر تصویرِ یار میں لور لور پھرتا ہے۔ ایسی ہی الہامی کیفیت میں پھر شعر نازل ہوتے ہیں۔'' عبید پر وجد طاری ہو چکا تھا۔
''اور پھر کاغذ کے پرزے کو پانی میں گھول کر یا گلے میں لٹکا کر عاشق نامراد ہمیشہ کے لیے صحت یاب ہو جاتا ہے ڈاکٹرز تو اویں جھک مارنے کے لیے بیٹھے ہیں...... آئی بڑی ''پروین شاکر'' کہیں کی۔'' رقت آمیز لہجے میں کہہ کر میں نے آخر میں بال نوچ ڈالے۔ اپنے نہیں، خیالوں میں اس نیک پروین کے۔
''پروین شاکر کیوں...... پروین عبید کہو بے غیرت۔'' عبید صاحب کی اونگھتی غیرت زور لگنے پر اچانک ہڑبڑا گئی۔ وہ سینہ تان کر ایسا کھڑا تھا کہ ایک تلی (سنگل پسلی) ہونے کے سبب سینہ باہر کو نکل نہ رہا تھا۔ اس لیے کوشش میں پیروں کی ایڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ جسے دیکھ کر ہی بندے کا ہاسا نکل جائے۔

''چھوڑو یار! کن باتوں میں پڑ گئے، اتنی ہی مجھ سے ہمدردی ہے تو کچھ صلاح دو مجھے...... تمہاری اپنی ہی ڈرامے بازیاں نہیں ختم ہوتیں۔''

''پتر تو بھی میری طرح محبت کر لے۔ آس پاس لڑکیاں تاڑ...... تاکہ تیرے سوہرے والے خود ہی آ کر کہیں ہماری لڑکی سے شادی کرواؤ ورنہ یہ ہماری عزت کو بٹا لگا کر رہے گا۔''

''یعنی بیل سے کہوں آ مجھے مار لے۔ آپا جی کبھی مجھے محبت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتیں...... نسیمہ بھابھی سے اس واسطے بھی انہیں بیر ہے کہ ان کا فرماں بردار بیٹا پھانس لیا ہے۔ اور پہلے ان سب کے شکوے شکایات ختم ہوں تو نئی زندگی پنپنے کا تصور بھی جا گے۔'' میرے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی جسے محسوس کر کے عبید نے کہا۔

''جا پھر اپنی حسرتوں پہ نو، نو آنسو بہا کے سو جا۔''

''آٹھ آٹھ آنسو......'' ایک اضافی آنسو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

''اوئے، تیری طرح یہ آنسو آنسو کا حساب رکھنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ آخر منگنی شدہ ہوں اس صورت میں دل کھلا رکھنا پڑتا ہے میں کوئی کمی کمین نہیں۔ خیر تیرا بھی قصور نہیں، تجھے تجربہ بھی تو نہیں ہوا......'' وہ افسوس سے سر ہلانے لگا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ گلی کی نکڑ سے کسی گاڑی کے پرانے انجن کے چلنے کا احتجاجی شور سنائی دے رہا تھا۔

''اس وقت یہ گاڑی کے انجن کی آواز...... کون ہو سکتا ہے سب خیر ہو۔'' میں نے دیوار سے اُچک کے دیکھتے ہوئے عبید کو آگاہ کیا جو سکون سے بیٹھا رہا۔ بلکہ اس تبصرے پر ناک سے مکھی اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''اس گلی میں اور گاڑی؟ یہ تیرے دادا جی کی مشہور زمانہ کھانسی کی آواز ہے غافل جو تجھے گاڑی کے پرانے انجن جیسی لگ رہی ہے...... اندرونی پرزے گھس چکے ہیں تو ایسی پھنسی پھنسی آواز ہی آئے گی نا یا ساز بجنے لگیں گے......''

میں نے دوسری دیوار سے برآمدے کی طرف منہ نکال کر جھانکا تو واقعی دادا جی پورے جوش و خروش سے کھانسنے کا شغل پورا فرما رہے تھے۔ عبید نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔

''اُفف......'' چکرا کر میں نے سر اپنے ہاتھوں میں گرا لیا۔ ''کیا دادا جی! بات بناتے بھی خود ہیں اور پھر بگاڑتے بھی......!!''

☆☆☆

صبح سویرے بچوں کی چیخ و پکار، بڑوں کی ہاہا کار اور بہنوں کے بے ہنگم قہقہوں میں گھر ہنگامہ خیز میلے کا سا سماں پیش کر رہا تھا۔ دادا جی کی صحت کا تو بہانہ تھا، سب ہی سکون چین کی تلاش میں ایک دوسرے کا آرام برباد کرنے آ گئے تھے۔ تینوں شادی شدہ بہنوں سمیت کرن بھابھی اور مرید بھائی بھی رات سے یہیں تھے اور رات سرما کی سوغاتوں سے پیٹ و نیت بھرنے کے بعد صبح پھر سے پیٹ خالی ہو چکا تھا۔ اور ملا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق سب کچھ نہ کچھ حلق سے اندر منتقل کرنے کے لیے بے چین بیٹھے تھے۔

سرما کو گیس کم، زیادہ اور آتی جاتی رہتی تھی۔ اس لیے بھابھیاں صاف صفائی کے بجائے کچن کی طرف دھیان کرتیں...... لہٰذا ہر سمت ابتری کا شکار تھی۔

''آپا جی! میں اب چلتی ہوں میاں کو آفس جانا ہو گا تو جب تک چکنی چپڑی غذا نہ کھالیں گھر سے قدم نہیں نکالتے...... یہ غافل سے ذرا کہیں مجھے دو ہاتھ دور تک دھکا دیتا آئے۔''

یہ شمیم باجی تھیں جو اپنے بچے کو ڈائپر چڑھا کر کندھے پر آڑا ترچھا سوار کرتے ہوئے اماں جی سے فرمان جاری کر رہی تھیں۔ بات وہ ہمیشہ اسی ڈھنگ میں کرتیں مجال ہے جو سیدھا گھر چھوڑ آنے کا کہیں۔ دو ہاتھ دور دھکا دینا......

''ہاں ہاں شمو...... ابھی بلاتی ہوں۔ تو ذرا یہ

ڈبا دھیان سے اپنے ساتھ رکھ لے۔ گجریلا اور میٹھی دال نکال کر رکھی ہے تیرے میاں کے لیے...... جنت اُو جنت!'' آپا جی نے عجلت میں جنت کو آواز دی جبکہ شمیم باجی ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔

''کیا ضرورت ہے آپا جی! زیادہ سر پر نہ چڑھائیں، سب چیزوں کی تلاشی تو پہلے ساس لے لیتی ہے......اور ویسے بھی میٹھے کی بدولت پہلے ہی طفیل نے سامنے کے دو دانت نکلوائے ہوئے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، قریب بیٹھ کر اچانک ہنس دیں تو تراہ نکال دیتے ہیں۔''

''ارے پگلی! رعب بنا رہتا ہے۔ اور وہ بل دار پراٹھے کھلا کر جو پیٹ کا پہاڑ نکلا ہوا ہے اس سے تو ہمیں پھٹنے کا اندیشہ جاگنے لگتا ہے۔'' آپا جی نے ہنستے ہوئے ڈبے باجی کے ہمراہ کیے اور مجھے سامنے سے گزرتا دیکھ کر آواز دے ڈالی۔

''اے غافل......ادھر آ میرا اپتر شاوا......'' میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ان کے پاس جا بیٹھا۔

''جی آپا جی! میں چھوڑ آتا ہوں باجی کو......'' میں نے پہلے ہی حامی بھری۔

''اس کی گل نئیں کر رہی میں تو تجھے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تُو نے کس غم میں ناسیں چڑھا رکھی ہیں، ہیں؟ پھیکے شلجم جیسی صورت تے نال مولی جیسی ناک......''

''ایسی تو کوئی بات نہیں آپا جی۔'' میں نے گڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

''مینوں سب ملوم (معلوم) ہے کہ کیہڑی بات ہے۔ دیکھ رہی ہوں دو دن سے بولایا بولایا پھر رہا ہے......متھے پہ بل ساتھ نرے کوڑے کوڑے زہر منہ بناتا ہے جیسے ابا تیرے نے چھتر مار دیے ہوں۔ یہ سب اس کلموہی کی وجہ سے ہے نا؟'' آپا جی بڑی سیانی تھیں فوراً معاملہ بھانپ گئیں۔ اور میں سمجھ رہا تھا کہ میری جھنجلاہٹ سے انجان ہیں......لیکن اس وقت میں گھبرا گیا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''نن......نہیں آپا جی! میری تو شکل ہی ایسی ہے اور سردیوں میں تو ویسے ہی خواہ مخواہ نحوست ٹپکتی ہے۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''دیکھ میرا بچہ! تو نہیں سمجھتا ان عورتوں کے مکر......اپنی بھابھیوں سے تو واقف ہے۔ مجھے اب ساری اُمیدیں تم سے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تیری وہٹی ہی ہے جو میری خدمت گزار ہوگی اس لیے میں کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہتی۔ سمجھ رہا ہے نا......؟''

''جی آپا جی......'' میں منمنایا۔

''بالکل آپا جی! اپنے غافل شہزادے کی دلہن کے لیے تو کنویں میں بانس ڈلوائیں گے کوئی ایسے تھوڑی......'' ادھر اُدھر سے چیزیں سمیٹتی شمو باجی نے اپنی خواہش باہر نکالی۔

''کنویں میں بانس......کیا مینڈکوں کے خاندان سے رشتے داری گانٹھنی ہے جو کنویں میں بانس ڈال کر آبی مخلوق کو ڈسٹرب کریں گی۔'' میرا سن کر ہی منہ بن گیا۔

''ہاں اُوئے غافلا تیرے ویاہ......تیرے ویاہ پر......آخوں خوں خوں۔'' دادا جی نے ذرا سا سر اُٹھایا ہی تھا کہ کھانسی پھر سے حملہ آور ہوگئی اور بات قسطوں پر چلی گئی۔ مجھے بیٹھے بیٹھے اُونگھ آ گئی کہ ان کی بات مکمل ہو تو میں اُٹھوں۔

''آپ سکون سے کھانس لیں دادا جی میں آ کر بات سنتا ہوں آپ کی۔''

''اے رُک، میں کہہ رہا تھا کہ......'' اُنہوں نے سانس درست کی۔ ''تیرے ویاہ پر ہم نے بھنگڑے ڈالنے ہیں۔ بج دھج کے شادی کرنی ہے سات پنڈ سے تو باراتی شرکت کریں گے......پھر ناچنے والیاں الگ گانے والیاں الگ اور بجانے والیاں وہ الگ۔''

''ہاہاہا دادا جی! آپ نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو بلوانا ہے، شہزاد زخمی کو یا پھر ذیشان روکھڑی کو۔'' میرا موڈ پل بھر میں خوشگوار ہو چکا تھا۔

''ارے چھڈ ان روکھڑیوں اور زخمیوں کو......

تیری شادی پر تو سیدھا نصیبو لال کو بلواؤں گا میں...... بڑی اپنائیت آتی ہے اس سے۔" دادا جی نے یہ بات کرتے ہوئے حلق سے جھانکتی کھانسی کو بھی پرے دھکیل دیا تھا۔

"ابا جی تسی وی ناں......اس ویلے تک وی شوخیاں کہیں نہ گئیں۔"

آپا جی نے دوپٹے کا پلو منہ پر رکھا اور ہنستی چلی گئیں۔ان کے اس طرح کرنے سے سر سے آنچل سرک گیا جس سے ان کے بلیچ کریم سے رنگے بال ابھی تک جلے جلے سے معلوم ہوتے تھے۔

شمو باجی سب سے مل کر میرے بائیک پر پیچھے آ بیٹھیں تو کرن بھابھی آپا جی کے کمرے میں جھانکتی نظر آئیں۔

"آؤ بیٹھو کرن! دیکھو کتنی اچھی لگتی ہو اپنے گھر میں چلتی پھرتی...... خواہ مخواہ تم نے الگ گھر کی ضد باندھ لی تھی۔" انہوں نے مسکرا کر شکوہ کیا۔ حالانکہ ان کے دل سے تو وہ تب ہی اُتر گئی تھیں جب شادی کے بعد اس گھر میں رہنے سے انکار کر کے میاں کو لیتے چلتی بنیں۔ اب بھی شاذ و نادر ہی ادھر قدم دھرتیں۔

"مجبوری تھی آپا جی نوکری کی...... مرید اور میرا آفس وہاں سے نزدیک پڑتا ہے پھر میری دوستیں اور......" انہوں نے گھر پر طائرانہ نگاہ ڈال کر خود کو معنی خیز خاموشی سے سپرد کر دیا کہ جاننے والے جان ہی لیں گے۔ آپا جی نے کمال حوصلے سے ان کی بات نظر انداز کی۔

"چلو کرن! ذرا ابا جی کے لیے ایک پیالی چائے تو تیار کر دو۔ انہیں دوا لینی ہے...... جنت کے پرچے ہیں، ساری رات بے چاری پڑھتی رہی ہے کہتی ہے پہلا نمبر لائے گی۔ ورنہ تم سے نہ کہتی۔"

"ہونہہ پڑھائی...... ساری رات سلطان راہی کے گرجنے، گولیاں برسنے اور بے ہودہ گانوں کی بھنبھناہٹ نے سونا دوبھر کر دیا...... اول ضرور آجائے گی اگر سوال فلموں سے آ گئے تو۔" کرن بھابھی نے حد درجہ ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکا۔ شوہر کے اصرار پر آ تو گئی تھیں مگر کوئی لمحہ ایسا ہو کہ وہ سر پر پیر رکھ کر واپس بھاگیں۔

"یہ تم کون سے مصلے پڑھنے کھڑی ہو گئی ہو؟"

آپا جی کے ٹوکنے پر وہ ہوش میں آئیں۔

"دراصل دودھ تو ہے نہیں...... ایک ہی گلاس بچا تھا۔ وہ میں نے عادت کے مطابق دودھ پتی بنا کر پی لی۔ اب چائے کیسے بنے گی؟" بے چارگی اُن کے چہرے سے ٹپکنے لگی۔

"ہا ہائے تو ساری خود ہی پی لی...... گھر کے بزرگ کا بھی خیال نہ آیا؟"

"خیال تو آیا مگر سوچا دودھ پتی دادا جی کو کہاں پچے گی...... قہوہ بنا لاؤں کیا؟" بڑی معصومیت سے کہہ کر وہ وہاں سے کھسک لیں اور اپنے مورچے کی طرف بڑھیں جہاں شوہر نامدار ناشتے کے لیے چلا رہے تھے۔

"کیا قیامت آ گئی ہے جو سارے میں ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو...... کہاں سے لاؤں ناشتا اپنا کلیجہ نکال کر بھون دوں؟" وہ سارا لحاظ بھول کر کاٹ کھانے کو لپکیں۔

"بدتمیز عورت، زبان سنبھال کر بات کرو۔ تم سے ایک پراٹھا نہیں تلا جا رہا...... جاؤ جا کر دیکھو کچن میں رات کا کچھ پڑا ہو گا۔" جواب میں مرید بھائی اس سے بڑھ کر چلائے۔

"رات کا سب صفایا ہو چکا ہے اور مجھے کچن میں بھیجنے کا نام بھی مت لو۔ آپ کو ہی شوق تھا یہاں آ کر رات ٹکنے کا...... جا کر جھانکو کچن میں، رات کے گندے برتنوں کا ڈھیر، گاجروں کے پھوگ، چائے کے داغوں سے بھرا چولہا اور پرے گیس کو الگ موت پڑی ہے...... مجھ سے نہیں کھڑا ہوا جاتا ایسی جگہ پر جا کر۔

"ہاں تم تو نوابوں کی بیٹی ہو نا...... ہاتھ پیر ہلا کر دھولو برتنوں کو تمہاری جلد نہیں چھل جائے گی۔"

"ہاں ہوں میں نوابوں کی بیٹی...... کیوں

دھوؤں میں بھنبھناتی مکھیوں والے برتن اور پلیٹیں جو زبان مار مار کر چاٹی گئی ہیں۔ میرے باپ کے گھر ملازم کام کرتے ہیں ...... کہاں میرا ماڈل ٹاؤن کا صاف ستھرا گھر اور کہاں یہ قلعہ نما شاہکار......"

"وہ ماڈل ٹاؤن کا گھر بھی تمہارے ابا نے لے کر نہیں دیا۔ بہت سر چڑھ کر ناچنے لگی ہو تم۔ باندھو اپنا سامان......" مرید بھائی نے خوں خوار لہجہ اپنا کر آخر کار جانے کی نوید سنائی۔

"تو پھر اور کہاں ناچوں! بہت ہی چول ہیں تمہاری فیملی کے لوگ......غضب خدا کا نہ رہنے کا کوئی سلیقہ نہ ڈھب۔ مالٹوں کے چھلکے بار بار پیروں میں آ کر دماغ الٹا رہے ہیں کھانا ہی ہے تو ایک جگہ نہیں ڈال سکتے سارا کچرا...... مجھ سے کوئی اُمید مت رکھو۔"

"میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا کرن......" مرید بھائی نے مرد بن کر مردانہ دھمکی دی۔

"کھینچ کر دیکھ لو...... اور ہی لمبی ہو گی۔" وہ تن فن کرتی باہر نکل گئیں اور باہر سے اس لڑائی کے چسکے لیتے ہوئے نسیمہ بھابھی اور شگفتہ بھابھی نے ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں اشارے کیے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

☆☆☆

"یہ صبح ہی صبح کرن کس ٹون میں بات کر رہی تھی مرید سے......کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

شگفتہ بھابھی ایک ہاتھ میں پیڑے کا ٹکڑا اور دوسرے میں لسی کا گلاس لیے اپنے کمرے میں آئیں تو بڑے بھیا نے تشویش سے پوچھا۔ وہ ناشتا کر چکے تھے اور دکان پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

"ہمیں کون کچھ بتاتا ہے۔ ویسے ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو میاں کو تھلے لگا کر رکھتی ہیں ورنہ ادھر ہم نے تنگ (زبان) سے کچھ نکالا نہیں اور ادھر آپ نے گھوریاں ڈالنا اسٹارٹ کر دیں۔" شگفتہ بھابھی کی اپنی انگریزی عروج پر تھی۔ خفگی سے کہہ کر انہوں نے پیڑے کو دانت سے کترا اور لسی کا سُڑک سُڑک گھونٹ بھر کر منہ چلانے لگیں۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟" وہ حیرانی سے اپنی بیگم کی نئی نئی سرگرمی ملاحظہ کرنے لگے۔

"گیس بہت ہی کم آ رہی ہے۔ رات کا بچا یہ پیڑا پڑا تھا مگر سخت سا لگ رہا تھا...... توے پر سینک کر لسی سے یہی ہضم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

وہ مزے سے کھانے لگیں۔

"یا اللہ...... پراٹھے کو لسی سے کون کھاتا ہے۔" وہ کراہ کر بولے۔

"آپ کھا کر دیکھیے نا...... بڑا ٹیسٹی (ٹیسٹی) سواد آ رہا ہے۔" انہوں نے فوراً ہاتھ آگے کر دیا جیسے وہ لے کر ایک بار ضرور ٹرائی کرنا چاہیں گے۔

"پیچھے کرو بھئی...... تمہیں ہی مبارک ہوں یہ نئی نئی ترکیبیں۔" وہ جھک کر جرابیں پہننے لگے۔

"آپ کی مرضی ہے کر لیں ناقدری...... اپنے بھائی کا حال آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ آپ کو تو اللہ کا تھینکس پے کرنا چاہیے کہ آپ کو اطاعت گزار وائف عطا کی ہے۔"

"تھینکس نہ ہوا ٹیکس ہوا جسے پے کرنا چاہیے۔" وہ سن کر ہی ہنس پڑے۔ جس پر شگفتہ بھابھی نے برا مان کر کہا۔

"ٹھیک ہے آپ کو زیادہ ایڈریس ہو گا...... میں تو جاہل ہوں۔" منہ پھلا کر بیٹھ گئیں۔

"ایڈریس مطلب؟" وہ قطعاً نہ سمجھے۔

"مطلب آپ کو زیادہ "پتا" ہو گا۔ اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی پتا نہیں ایم۔ اے کیا ہے یا بس "ایویں" کیا ہے۔" وہ شوہر کی کم عقلی کا افسوس کرنے لگیں جبکہ بڑے بھیا کی ہنسی کی آواز باہر تک آئی تھی۔

"توبہ یہ تمہاری گلابی انگریزی......"

☆☆☆

صحن صفائی کرنے کے بعد نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ بچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے یہاں سے وہاں بھاگتے پھر رہے تھے۔ سرما کا زور ٹوٹتا نظر آ رہا

تھا اور اس کا ثبوت یہ چمکیلی دھوپ تھی جو حدت دے رہی تھی۔ شگفتہ بھابھی نے موقع دیکھ کر واشنگ مشین لگا لی۔ کھانا پینا کیونکہ ایک ہی تھا اس لیے کپڑے دھونے کی ذمہ داری ایک ہفتہ شگفتہ بھابھی اور دوسرے ہفتے نسیمہ بھابھی کی تھی۔ یہی ترتیب باقی کاموں کی تھی...... صبح کا ناشتا دونوں مل کر بناتیں، میاؤں کو روانہ کرتیں۔ دوپہر کو ایک سالن بنا لیتی تو دوسری آٹا گوندھ کر روٹیاں ڈالتی...... برتن جنت دھو دیتی تھی۔ آپا جی ویلے پن سے اکتا کر سبزی دھو کر کاٹ دیتیں۔ اپنے کمروں کی صفائیاں دونوں الگ الگ کرتیں۔ پھر صحن بنا تو تکرار کے جو پہلے ویلا ہوتا دھو ڈالتا تھا۔ بچوں کی وجہ سے کام بھی بہت تھکا ڈالتا مگر آپا جی کو ملازمہ رکھنا سخت ناپسند تھا گھر کے افراد کے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے۔ اس لیے کسی کے لبوں پر یہ بات بھی نہ چڑھتی کہ ایک مائی رکھ لیں کسی بڑے کام کے لیے۔

نسیمہ بھابھی نے کچن صاف کر کے حلوہ گرم کیا اور ڈونگا دوپٹے میں چھپایا کہ آپا جی کی نظروں سے اوجھل رہے، کمرے میں آگئیں۔ بیڈ پر ان کے سرتاج کوئی رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔

''توحید صاحب! یہ حلوہ کھا لیں، بڑی مشکل سے بچایا ہے اس کو ندیدوں سے۔'' انہوں نے لہجے میں پیار بھر کر سرتاج کے سامنے حلوہ رکھ دیا۔ گزشتہ ہوئے آپا جی سے لیے بدلے اور گلشن کے نکلنے والے واقعے کے بعد سے ان کا موڈ بڑا خوشگوار تھا۔ توحید بھیا مسکرا اٹھے۔

''جیو میری رانی! کتنی اچھی لگتی ہو اس مزاج کے ساتھ، مجھے دوبارہ سے تم سے محبت ہونے لگتی ہے۔''

''حق ہا توحید صاحب! اسی محبت نے ہی تو رول کر مٹی کر دیا ہے ورنہ ہم بھی ہوا کرتے تھے بھی سونے کے...... آپ کی آپا جی نے تو ساری خوش مزاجی ناک کے راستے سے ہوا کر دی ہے۔ میرے ابا جی کہتے تھے نسیمہ تو ایسی مسخری ہے کہ روتے کو ہنسا بیٹھے۔'' بھابھی نے اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ بات مکمل کی اور نگاہیں جھکائے بیٹھی رہیں۔

یہ انداز عین کل رات لگنے والے ڈرامے کا رومانٹک سین تھا جو کئی لوگوں نے آہ بھر کر دیکھا۔ مگر توحید بھیا کے منہ سے نکلنے والا ڈائیلاگ اس سے یکسر مختلف تھا جو جواب میں ہیرو نے اپنی ہیروئن کی کلائی تھام کر ہاتھ چوم لیا تھا جس کی گھومتی چوڑیوں سے دیکھنے والوں کو چکر آ رہے تھے۔

''کیا مذاق کرتی ہو تم بھی نسیمہ! تین چار بچوں کی ماں کو مسخرے پن ویسے بھی سوٹ نہیں کرتے۔ یہ بتاؤ حلوہ کن سے بچا کر لائی ہو، ویسے بہت مزے کا بنا تھا۔'' انہوں نے لگے ہاتھوں تعریف بھی کر دی تو وہ زیادہ بدمزا ہونے سے بچ گئیں۔

''آپ کے لیے بناتے ہوئے تو میں محبت شامل کرتی ہوں نا...... مجھے پتا تھا کہ آپ نے کم کھایا ہوگا اس لیے رات سب سے چھپا کر رکھ لیا۔'' وہ فخر سے بولیں۔

''لیکن نسیمہ، ہو سکتا ہے آپا جی کو کھانے کا دل ہو رات کھانے والے بھی تو زیادہ تھے نا...... جاؤ شاباش، پوچھ کر آؤ ان سے پھر میں کھاؤں گا۔'' وہ فکرمندی سے بولے تو نسیمہ بھابھی کی خوش مزاجی زائل ہونے میں ایک لمحہ لگا۔ تڑخ کر بولیں۔

''کوئی ضرورت نہیں، نہیں کھانا تو مت کھاؤ...... غضب خدا کا دس کلو گاجریں چھیل کاٹ کر دودھ میں چمچہ گھما گھما کر کس طرح گلائیں اور میوؤں کی خوشبو ابھاری، میں ہی جانتی ہوں۔ کندھے پک کر پھوڑا ہو گئے ہیں...... خود منہ بھر بھر کھایا۔ بیٹیوں کے حصے الگ نکالے۔ رات میں نے جگ میں نکال کر چھپایا کہ کسی کا دھیان نہ جائے۔ کیا اس لیے کہ اپنے منہ سے آفریں کرتی پھروں گی۔ مت کھاؤ تم، میں اماں کو بھجوا دوں گی...... آخر میرے گھر والوں کا بھی کچھ حق ہے کہ نہیں۔''

وہ غصے میں انہیں جھاڑ پھونک کر ڈونگا اٹھائے

اب بکسے میں احتیاط سے رکھ رہی تھیں ساتھ ساتھ غصے کا اظہار جاری تھا۔ توحید بھیا نے بے چارگی سے انہیں دیکھا۔

"میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا نسیمہ...... دیکھو تم اگر دل بڑا کر کے ابھی آپا جی سے پوچھ آتیں تو ان کا دل بھی تمہارے لیے کتنا نرم پڑ جاتا۔ پھر شکوے بھی تمہارے ہی رہتے ہیں کہ آپا جی تمہارے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھتیں، کبھی پہل تم کر کے دیکھو......"

"رہنے دو توحید میاں! ان تلوں میں اب تیل نہیں، میں ہزار سونے کی بن کر کھڑی ہو جاؤں ان کے لیے رہوں گی وہی پیتل کی...... اس لیے میں بھی اب ڈنکے کی چوٹ پہ میرا اٹھن بن کر رہوں گی۔" وہ ایک بار پھر اپنے عزائم ظاہر کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

بچوں نے شور ڈالا ہوا تھا۔ دانیال (نسیمہ بھابھی کا بڑا بیٹا) نے دھکا مار کر شگفتہ بھابھی کی بچی کو گرا دیا تو چیختی چلاتی ماں کی سمت بھاگی۔ کپڑے نچوڑتے ہوئے شگفتہ بھابھی نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"ہوگئی تیری ریں ریں شروع، کیا تکلیف ہے اب تجھے؟"

"دانی نے میرا منہ نوچ لیا ہے۔" وہ بھاں بھاں کرتی ایک کی چار لگانے لگی تو شگفتہ بھابھی نے دانت پیس کر قہر برساتی نگاہیں دانیال پر ڈالیں۔

"یہ تو ہے ہی فورسٹی (جنگلی)......" انہوں نے ایک بار پھر اپنی مرضی سے لفظ توڑ کر استعمال کر لیا۔" بلکہ نسیمہ کے تو سارے بچے ہی اسٹوپڈ ہیں۔"

آخری بات نسیمہ بھابھی نے سن لی۔

"نی ذات کی انگریزن! یہ کیا انگریزی میں میرے بچے کو گالی دی ہے ہاں...... بتا مجھے۔" وہ آستینیں چڑھا کر لال پیلا چہرہ لیے بھاگتی آئیں۔

"کیا بھابھی! میں مینٹل (پاگل) ہوئی ہوں کیا...... میں نے کہا نسیمہ کے تو سارے بچے ہی بہت پیارے ہیں۔ لڑائی بھی نہایت پیار سے کرتے ہیں۔" وہ بجھ بجھ گئیں

"ہائے! ارے، وہ میں کہہ رہی تھی کہ رنگت تمہاری کیسے لشکارے مار رہی ہے...... کیا لگا رہی ہو؟" نسیمہ بھابھی بھی فوراً شیر و شکر ہوگئیں۔

"کہاں بھابھی! قدرتی ہی ہے۔" وہ عاجزی سے بول کر کام میں لگ گئیں حالانکہ تھوڑی دیر پہلے ہی کچن سے کافی چیزیں نکال کر ملغوبہ بنائے چوری چھپے منہ مانجھتی رہی تھیں...... چوری چھپے اس لیے کہ کہیں نسیمہ کو بھی دینا نہ پڑ جائے۔

"اے دانیال! ادھر آ چل آکے پڑھ لے......" وہ کھینچ کھانچ کر اسے اپنے مورچے میں ہانک آئیں۔ "یہ تجھے اس لفظ کا نہیں پتا جو تیری تائی نے بولا؟"

"نہیں امی......!" وہ منہ بسورتا کتاب نکالنے لگا۔

"کچھ پڑھ لیا ہوتا تو یہ منحوس شکل نہ بناتا نالائق...... باپ کو تو جیسے کچھ پروا ہی نہیں میں اکیلی جان......" دانیال کی کمر پر دو ہتھڑ اہتمام سے جڑ دیے۔

"اچھا چل وہ کہتی ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ تو نکال کتاب اور پڑھ لے...... تیری ماں کو ٹکے ٹکے کے لفظوں کے لیے محتاجی جھیلنی پڑتی ہے۔ انگریزی سیکھ لے تاکہ میں بھی اس کے منہ پر مار سکوں تجھ سے پوچھ پوچھ کر......"

"امی یہ جملے بنانے ہیں۔" وہ بیزاری سے بولا۔ سارا سال سکول بند رہے تھے اب تو شوق پر ایسے تالے پڑ گئے تھے کہ کتاب کھلتی تو دل بند ہونے لگ جاتا۔

"ہاں شاباش! یہ کون سا مشکل ہیں، ابھی بن جاتے ہیں...... لفظ بتاتا جا اور میرے بتائے جملے لکھتا جا شاباش۔" دانیال نے لفظ پڑھ دیے اور ان کے دکھ کو باہر کا راستہ مل گیا۔

پیروکار۔ سارے کے سارے فسادی میری

دادی کے پیروکار ہیں۔

قدم چومنا۔ کامیابی نے ایک بار میری پھپھی کے قدم کیا چومے اپنا ہیضہ ہی کروا بیٹھی۔

نمک چھڑکنا۔ امی کی ساس کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہی ان کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

سوال پیدا ہونا۔ دادی کو سوال پیدا کرنا کم اور بچے پیدا کرنے کا زیادہ شوق تھا۔

دست بستہ۔ میری دادی کو اسکول کے زمانے میں دست لگے تو انہوں نے اپنا بستہ خراب کر دیا۔

"امی! دادی بچپن میں اسکول جاتی تھیں کیا...... پھر ان کی پٹائی ہوتی؟" وہ قلم روک کر مزے سے پوچھنے لگا

"بکواس نہ کر اپنا کام کر...... استانی تیری دادی نہیں جو فضول سوال پوچھے۔"

"لیکن امی ٹیچر مارے گی تو نہیں۔" دانیال نے ایسے جملے کبھی نہیں سنے تھے۔ اس لیے اس کی فکر جائز تھی۔

"ہاتھ تو لگا کر دکھائے...... کچھ کہے تو کہہ دینا کہ آپ بہت "اسٹوپڈ" ہیں۔ خوشامد سے خوش ہو جائے گی۔" مسکرا کر انہوں نے بچے کو اخلاقی سبق پڑھایا۔

☆☆☆

وہ نیلے رنگ کی ساڑھی جس کے بارڈر پر نفیس سے نگینے جڑے تھے زیب تن کیے، ہونٹوں کو میرون ڈارک سستی لپ اسٹک میں کچے پن سے رنگے جن سے داتن (دنداسہ) سے دانت مانجھنے کے سبب گہرا براؤن کلر زیادہ جھلک رہا تھا...... بالوں میں لمبا سا پراندہ جس کے اختتام پر دھاگوں میں شیشے پھنسے تھے اور وہ دھوپ میں لش پش کرتے آنے جانے والوں کو آنکھ مار رہے تھے۔ پیروں میں ڈبل سول جوتی اور سنبھل سنبھل کر احتیاط سے اٹھتا ہر قدم (کہیں جوتی سے گستاخ پاؤں مڑ ہی نہ جائے)۔ مرجھائی خشک جلد والی کلائی میں پڑی تین چوڑیاں، اپنی پوری تیاری سمیت ساڑھی کا پلو سنبھالے "انارکلی ڈسکو چلی" جونہی دروازے میں نمودار ہوئیں بچوں نے منہ کے اسپیکر کھول دیے۔

"نانی آگئیں...... نانی آگئیں...... نانی۔"

"یہ کہاں سے ٹپک پڑا البوترا بینگن......" توقع کے عین مطابق آپا جی نے سمدھن کی آمد پر سخت ناگواری کا برملا اظہار کر دیا۔ آج وہ چھمک چھلو سے لبوترا بینگن کہلائیں اپنی نیلی ساڑھی کی وجہ سے......

آپ ٹھیک سمجھے، ہماری شمسہ خالہ کے سوا اور کون؟

جب سے اسٹار پلس اور دوسرے پڑوسی ملک کے چینل آنا بند ہوئے تھے ہر طرف سکون ہی سکون آ گیا تھا مگر شمسہ خالہ کی روح کے راوی میں چین رخصت ہوا اور بے چینی ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ بڑی مشکل سے وقت کاٹ رہی تھیں۔ مرکزی دروازے سے داخل ہو کر فوراً غسل خانے کی طرف بھاگیں۔ گلی میں پانی ٹھہرنے کے باعث یقیناً کہیں کیچڑ لگ گیا تھا...... دو منٹ کے بعد جھپک جھپک چلتے ہوئے، گیلی جوتی میں پھسلتے پیروں کے ساتھ گرتے پڑتے آپا جی کے قریب دھپ سے آ پڑیں۔

"آپاں جی! پیر تے ہتھ تے گردن تے لت (لات) میں نے کہا آداب کہتی ہوں جی۔" ناک تک ہاتھ لے جا کر شاہانہ انداز میں سلام کیا تو آپا جی بے اختیار پیچھے ہوئیں۔

"تم میری گود میں سوار ہو جاؤ، ابھی ایک انچ پیچھے کیوں بیٹھی ہو؟" آپا جی نے کھا جانے والے انداز میں کہا تو انہیں اپنے بیچ بے انتہا کم فاصلے کا خیال آیا کہ جوش میں وہ زیادہ ہی ان کے سامنے بیٹھ گئی ہیں، سامنے کی ہوا رک گئی ہے اور آپا جی کا دم گھٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔

"اوو معاف کرنا...... میں نے دیکھا نہیں۔"

وہ ذرا کی ذرا مسکرائیں اور تھوڑا سا پیچھے ہو کر بیٹھیں۔ ساڑھی کے آگے لٹکتا موٹا سا چمڑے کا تعویذ نظر بٹو لگ رہا تھا......!

"یہ آج تم پھر کس خوشی میں یہاں آ گئی ہو۔ بجلیاں گرانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی اسٹار پلسی

بوڑھیوں کی طرح پورے محلے میں جا کر درشن کرواؤ۔ بلکہ کروا کر ہی آ رہی ہو لگتا ہے...... یہ لباس بھی کسی قدر دان نے ہی دیا ہوگا۔" آپا جی کے موڈ خراب ہونے کے لیے سمدھن کا نام ہی کافی ہوتا تھا...... اس وقت تو پھر وہ بنفس نفیس سامنے ہی موجود تھیں۔

"اوہ نئیں نئیں آپاں جی......" وہ قہقہہ مار کر ہنسیں۔ "تسی غلط سمجھے او، یہ تو نسیمہ کے ابا نے مجھے سرپوز دیا تھا۔" انہوں نے وضاحت دی۔

"سر پھوڑ دیا تھا؟ کرتوت تو تیرے ایسے ہی ہیں پر......؟" آپا جی نے حیرت سے نگاہیں سر پر جمائیں۔ جو لگ تو صحیح سلامت رہا تھا۔

"اوہ ہو سرپوز...... وہ ہوتا نئیں ہے جو چھپا کے دیا جاتا ہے خوش کرنے کے لیے تو فا (تحفہ)......"

"سرپرائز......" میں نے ہنسی دباتے ہوتے آپا جی کی طرف جھک کر کہا تو شمسہ خالہ اس پر پھولے نہ سمائیں۔

"وہی وہی...... سچی گل تو اے ہے آپاں جی کہ آج ہم اپنی ویلڈنگ انوری منا رہے ہیں نا تو یہ ساری تیاریاں اس واسطے......" وہ آخر میں شرما کر بہار بیگم کو مات دینے لگیں۔

"کی؟ ویلڈنگ کرنے کی کوئی دکان کھولی ہے انور نے...... پر تم لوگ تو کہتے تھے وہ وکیل بن گیا ہے۔ نی بنگالن پڑھائی جعلی نکلی گئی کیا جو دکان ڈالنی پڑ رہی ہے ہائے ہائے......"

انور شمسہ خالہ کے وکیل بیٹے کا نام تھا جس پر ان کے خاندان بھر کو ناز تھا۔ آپا جی کے لیے یہ خبر بڑی حوصلہ افزا تھی۔

"ارے ارے آپاں جی......" شمسہ خالہ ایکدم بوکھلا گئیں کہ سمدھن یہ کس راہ پر سرپٹ دوڑ پڑیں...... میں اور جنت ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

"ویڈنگ مطلب شادی کی سالگرہ منا رہی ہیں خالہ......وہ پچھلے ماہ سلمیٰ پڑوسن نے نہیں منائی تھی اپنے بیٹے کی۔ اسی طرح جس تاریخ کو شادی ہو تو...... ویسے خالہ شمسہ نے زندگی بھر تو کبھی کیک کا منہ نہ دیکھا ہوگا اب اس عمر میں شادی کی سالگرہ منانے کا خیال آ رہا ہے۔ سو سال پورے ہو گئے؟" جنت نے مزے لے لے کر ساری تشریح حاضرین کے گوش گزار کی اور آخر میں بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"وا ونی میں تیرے صدقے! ذات کی چھپکلی اور اڑان دیکھو...... ساری زندگی ختنے کروا کر اور ڈھول پیٹ کر کھانے والوں کو بھی کیا دور کی سوجھی...... سالگرائیں منائی جا رہی ہیں جب چونڈے بگے سفید ہو گئے۔ کمال ہو گیا بھئی......" آپا جی سنتے ہی بھتے سے اکھڑ گئیں۔ ہاتھ نچا نچا کر خوب لتے لیے...... تاہم شمسہ خالہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں، بغیر برا مانے چڑانے کو گویا ہوئیں۔

"اللہ جب مہربان ہو تو بندہ کیوں ناشکرا بنے...... ویسے بھی آپا جی جب حیثیت ہو تب منا لو، میرے وکیل پتر انور کو تو ہماری شادی سے جڑے واقعے بڑے پسند ہیں...... تو ہم کیوں نا اس یادگار دن کا اہتمام کریں؟ آخر میرے گھر والے نے ریچھ سے مقابلہ کر کے مجھے جیتا تھا۔"

"ریچھ سے......؟" آپا جی اس مبالغہ آرائی پر کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ "تم ریچھ کے خاندان سے ہو؟"

"میرے ابا اللہ بخشے، کہتے تھے اپنی دھی اسی ہاتھ میں دوں گا جو بہادر ہو اور کسی بھی مشکل سے لڑ جائے...... ماجھے نے میری خاطر ریچھ سے لڑ کر اسے ڈھول چٹا دی تھی، اسی لیے میرا ویاہ اسی سے طے پایا۔" ہم دم بخود سے شمسہ خالہ کی گفتگو سن کر رہے تھے جس میں فخر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

"لو کر لو گل، وہ بانس کے کانے جیسا ماجھا جو پانچ کلو کا ڈھول بھی گلے میں لٹکا لے تو دور سے ہی بندہ پہچان لیتا ہے کہ یہ مشکل میں گرفتار ہے وہ ریچھ کو

ڈھول چٹائے گا...... نی شمسی بس کر دے۔'' آپا نے ٹھٹا لگا کر باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تو ہماری ہنسی کے فوارے نسیمہ بھابھی کے کمرے تک ضرور گئے ہوں گے جنہیں شاید خبر نہ تھی کہ ان کی ماں کی کیسی شامت آئی ہوئی ہے۔

''نگوڑی یا پن دنیا تن دیکھے من نہ دیکھے......''
شمسہ خالہ نے شبنم کی طرح لہجہ پُرسوز بنا کر کاجل بھرے نینوں کے کٹورے چھلکا کر شکوہ کناں انداز میں ''دنیا'' یعنی آپا جی کی طرف دیکھا جو ان کی اس زہر زہر اداکاری پر متاثر ہونے کے بجائے سخت تاؤ کھا گئیں۔

''تیری سچ دسچ بھی تو یہی کہتی ہے کہ لوگ تن دیکھیں ورنہ من میں تو کالا پانی ہی بھرا ہے۔'' انہوں نے کوفت سے بات ختم کی۔ نسیمہ بھابھی نے کمرے سے سر نکالا۔ ماں کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور غڑاپ سے اندر غائب ہوگئیں۔

''خیر میں نے تجھے معاف کیا جانتی ہوں پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ کیا ہوا غافل کی دلہن کا، سنا ہے سب کے منہ پر چانٹا مار کر گئی ہے۔'' کھی کھی کرتے انہوں نے دکھتی رگ چھیڑی۔

''میں نے اس کی گت مروڑی ہے۔ میرا پتر تو پورے شہر دا سہرا ہے، اس کی کڑی بھی چن ورگی لاؤں گی تے گنوں کی پوری...... رال ٹپکائے گا پورا محلہ۔ تُو نے اپنے جیسا سمجھا ہے کیا آپا بتول کو......'' وہ نخوت سے بولی تھیں۔

''کچھ بھی کہو آپاں بتولاں۔ اپنے منہ مٹھو والی بات...... قسم سے تیرا تو کلیجہ پھٹ کر ٹوٹے ہوگیا ہوگا۔ یہ تو ہماری بچی ہے کہ نباہ رہی ہے ورنہ یہ زمانہ بڑا خراب ہے، سنبھل کے چلیو۔'' شمسہ خالہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلا ضرورت ہنس دیں۔ آپا جی کا کلیجہ ساڑ دیا۔

''نی تیرے پیٹ میں کس بات کا درد ہے۔ پہلے اپنے کالے کرتوتی پتر کا سوچ...... بابا آدم کے زمانے کا ہے اب تو منہ پر بھی چیچک پڑ رہے ہیں یہ نہ ہو مرگی بھی پڑنے لگے...... میرے غافل کی فکر میں تلکنے کی تجھے کوئی لوڑ نہیں۔ ورنہ گچی مروڑ بیٹھوں گی۔''

شمسہ خالہ اتنی تلخی پر بلبلا اٹھیں اور دروازے سے سنتے ہوئے نسیمہ بھابھی تلملا اٹھیں۔

''ہائے ہائے، پہلے تو غافل کا ہی ذکر چلا۔ جا کر دیکھ محلے میں کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہیں بتولاں...... لوگ کہتے ہیں جس دن غافل کا ویاہ ہوا بتولاں پھڑک کر زہر چاٹ لے گی۔ اور سارے بس بہانے ہیں ورنہ تو پتر کو گھر بار کا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی کہ ساری کھٹی (کمائی) سیاہ سفید کی مالک خود رہے...... ہائے آپاں! کچھ سوچ، یہ ساری باتیں سن سن کر لڑکا کوئی غلط قدم اُٹھانے پر مجبور نہ ہو جائے۔''
انتہائی رازداری سے گفتگو کرتی خالہ نے آخری بات اونچی آواز اور بطورِ خاص میری سمت دیکھ کر کہی تھی...... میرے چہرے کی رنگت لحظہ بھر کے لیے تبدیل ہوگئی۔

''خدا کی مار ہو ان بد ذات فلانی ڈھمکانیوں پر...... میری تو جتی کو بھی پروا نہیں۔ ارے میرے بچے کو کوئی ایسی آگ نہیں لگی کہ تیرے انور کی طرح کرتوت کالے کرتا پھرے۔ نہ ہی وہ ایسا دیدہ ہوائی ہوا ہے کہ اپنے منہ سے ''بر'' مانگے...... یہ آپا جی کی تربیت ہے (سینہ ٹھونک کر) جہاں پھونک کر جس پر ہاتھ اس کی ماں نے رکھا آنکھ بند کر کے قبول کرلے گا۔ مجال ہے بھی محلے کی لڑکی پر نظر رکھی ہو۔ ہر کوئی اطمینان سے گھر آتا جاتا ہے...... یہ حلال خون ہے اور تُو نگوڑی شمسی...... خبردار، جو دوبارہ ایسی واہیات بات منہ سے نکالی۔''
مجھے ان کی باتوں پر گدگدی سی محسوس ہوئی تو ایک مسکان نے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ پھر بھابھی کا خیال آیا جو غصے سے کھول رہی ہوں گی۔
شمسہ خالہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھ کر جنت تو قہقہہ مار کر ہنستی اندر بھاگی مگر مٹھیاں بھینچتے ہوئے نسیمہ بھابھی ماں کو ہارتا دیکھ کر تاب نہ لا سکنے

ہوئے ضبط کی ساری رسیاں تڑوا کر باہر نکل آئیں۔ شمسہ خالہ کو اب وار کے لیے کوئی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"میرے بھائی سے جلنا کوئی میری ساس سے سیکھے، رسی جل گئی مگر بل رہ گئے...... ان کا بس چلے تو دنیا جہاں کی ساری برائیوں کا ڈھول گلے میں ڈال کر پیٹیں اور نام لیں میرے ماں پیو کا......" نسیمہ بھابھی قریب آ کر چبا چبا کر بولیں۔

آپا جی نے کان میں انگلی مار کر ساری سنی بات باہر نکالی اور اطمینان سے گویا ہوئیں۔

"لو آ گئی اپنے مورچے سے باہر...... اپنا رسا پکڑو اور لے جاؤ اندر۔" وہ شمسہ خالہ سے بولیں۔

"اپنے انجام سے ڈریے میری آہیں لگیں گی آپ کو...... جس دن میں اپنی اوقات میں آ گئی نا......" وہ شدت جذبات میں بغیر کچھ سوچے سمجھے بولے جا رہی تھیں۔ اسی شور سے اندر بیٹھے مہرین اور شاہین جو اپنے سسرالی راز و نیاز کر رہی تھیں باہر نکل آئیں۔

"اچھا۔ آج تک تو سنا تھا کہ یہ دعائیں آہیں کھسروں کی لگتی ہیں...... خیر اللہ کرے جلدی تو اپنی اوقات پہچانے اور یہاں سے دفان ہو......"

"وہ تو میں آپ کی کڑوی روٹی کھا کر یہاں سے دفان ہوں گی...... اور رہی میری اوقات کی بات تو میں کہتی ہوں قتل کر ڈالیے اپنی "انا" کو آپا جی۔ جس دن آپ نے یہ کر لیا ہم سب کی زندگی میں سکون آ جائے گا......" نسیمہ بھابھی نے خاصی کرختگی کے ساتھ چبا چبا کر ادھر الفاظ ادا کیے اُدھر دہل کر آپا جی نے سینے پر ہاتھ رکھا اور مہرین کی چیخ بلند ہوئی۔

"بھابھی......!" بڑے صدمے سے اس نے اپنی آٹھ ماہ کی بچی کو کلیجے میں بھینچ لیا جیسے ابھی وہ چھین لیں گی۔

"میری انا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے اتنی سی بچی ہے وہ...... آپ کی زبان نہ کانپی، دانت نہ بجے۔" یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔

"ہائے ہائے......" آپا جی اپنی جگہ سے اچھلیں "نی زہر دینے جوگی۔ ابا جی، ابا جی! آپ نے اس کمبخت کی بات۔ میرے ہاتھوں سے کسی معصوم جان کا خون کروا کر مجھے جیل بھجوانا چاہتی ہے تا کہ میرے پورے ٹبر کو انگلیوں پر نچائے...... ہائے ابا جی! یہ شادی کروانے میں تسی وی پیش پیش تھے۔"

وہ بے دائیں بائیں ہلاتے ہوئے دادا جی کو دکھڑا سنا رہی تھیں جو اگر آرام بھی فرما رہے تھے تو جھنجھنا ضرور اُٹھے ہوں گے۔

"اوہ ہو! یہ ڈرامے بازیاں...... میں نے ایسا کب کہا۔" ہکا بکا نسیمہ بھابھی نے بھنا کر کہا۔

"میری بات کو اپنے مطلب کے مطابق موڑنا خوب آتا ہے۔ میں نے آپ کے اس تنتنے کی بات کی ہے جس کے آگے میں آپ کو حقیر نظر آتی ہوں...... میری بات کان کھول کر سن لیں سب، ایسے ہی چلتا رہا تو پولیس ایک دن یہ بوا ضرور کھڑکائے گی۔ آخر وکیل کی بہن ہوں میں بھی......" وہ چھاتی ٹھونک کر بولیں۔

"ارے جا جا، ہم بھی کوئی گونگے کا گڑھ کھائے بیٹھے ہیں...... جیل تو میں تجھے کرواؤں گی۔ وہ بھی اللہ کے حکم سے......"

"شوق سے، میں کیا کوئی ڈرتی ہوں؟ جانا ہوا تو تھانے بھی جاؤں گی اور جیل بھی...... مگر شریکاں نوں پٹیاں چڑھا کر، گٹے گوڈے سجا کر...... آنے دیں تو حید کو۔" بڑے دبنگ لہجے میں اللہ وسائی کی جانشین بنے نسیمہ بھابھی ہمیشہ کی طرح اختتام پر اپنی دھمکی دہرا کر شمسہ خالہ کا ہاتھ تھامے اپنے حجرے کو سدھاریں، جہاں یقیناً انہوں نے انتقامی کارروائی اور نجانے کیا کیا منصوبے بنانے تھے...... تاہم تخت سے لباس جھاڑ کر وضو کرنے جاتے ہوئے آپا جی ضرور ان کی باتوں کے زیر اثر بڑبڑا رہی تھیں۔

"مت وج گئی تھی سب کی جب اس فسادن کو بیاہ کر لائے تھے...... سکون برباد کر کے رکھ دیا۔ ایک

یہ ہے اور دوسری وہ چھم چھلو شسی...... کوے تو کوے لالیاں بھی چونچ مارنے لگیں۔"
"بلاتی ہوں خاندانی وچولن کو...... اب تو ان کے تھوبڑے بند کرنا ضروری ہوگیا ہے۔" تخت کے نیچے سے چپل تلاش کرتے ہوئے آپا جی نے کچھ خیال آنے پر چہرہ اٹھایا اور منہ نسیمہ بھابھی کے کمرے کی طرف منہ کرکے اونچی آواز میں بولیں
"او پھولن دیوی! آبھی گئی ہو تو جاتے جاتے اپنے منہ کا میچا (ناپ، پیمائش) دیتی جانا۔ تیرے غار جیسے منہ کے لیے آرڈر پر لڈو بنواؤں گی تاکہ ایک ہی حلق تک پورا آجائے اور بار بار تیری کوئی فضول باتیں نہ سنی جاسکیں۔"
آپا کے اعلان کے جواب میں زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند ہوگیا اور میری ہنسی نکل گئی۔ میرے لیے آپا جی کی بات تھی ہی ایسی خوش کن...... ایسی فرحت بخش...... ایسی جاں افزا کہ...... میرے دل میں یک بیک جلیبیوں کے گول دائرے بننے لگے...... میٹھے گلاب جامن رس گھولنے لگے۔ چم چم لڈیاں ڈالنے لگی...... آپا جی نے اپنا کہا تو پورا کرلیا اور مجھے بھی دن میں چاند ابھرتا نظر آنے ہی لگا تھا کہ پھر وہ......
اگلے روز اک واقعہ ہوگیا۔ بلکہ سیاپا ہی ہوگیا۔

☆☆☆

ابلے گٹروں کے گندے پانی میں گلی تیر رہی تھی۔ یہی حال محلے کی باقی گلیوں کا تھا...... ہرچوتھے روز کا عذاب کہ ایک کیچڑ کا ڈھیر سوکھتا نہیں کہ دوبارہ پانی ابل پڑتا ہے۔ اس وقت بھی کناروں پر دیواروں کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے اینٹیں لگائی گئی تھیں کہ پانی میں شڑاپ شڑاپ کرنے کے بجائے اینٹوں پر پیر رکھ کرلباس اٹھائے بچتے بچاتے گزرجاؤ۔
باہر دن چڑھے ریڑھیوں پر پھل سج چکے تھے۔ اور گلابی دھوپ میں چمکتے بہت رنگین منظر پیش کررہے تھے...... فضا میں کچے امرودوں کی خوشبو تھی۔ اور پھیری والوں کی تان، جو کیچڑ میں سائیکل گھسیٹتے سستے بھاؤ مالٹے اور سبزی بیچتے پھر رہے تھے۔
میں ہاتھوں میں پھلوں کے شاپر تھامے گلی سے گزر رہا تھا کہ عبید اور خرم کی شکلیں نظر آئیں جنہیں میں کمال مہارت سے نظرانداز کرتا آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ بھی ڈھٹائی میں اول درجہ رکھتے تھے کہ گلی کا موڑ مڑ کر بھی آوازیں دیتے دیتے پیچھے دوڑ آئے تھے۔
"ارے یار سن تو...... کانوں میں ٹوٹیاں لگائی ہیں کیا؟" میں اب میں مگن انداز میں چلتا جاتا کہ اچانک پاؤں پھسلا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی خرم نے جھپٹ کر سہارا دیا۔
"شکریہ، میں گرنے نہیں لگا تھا۔" اس کے مضبوطی سے پکڑنے پر میں نے جتایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔
"یار تیری نازک مزاجی کہیں نہیں گئی۔ بچپن سے یہی مٹی کھا کر بڑا ہوا اور ابھی تک ڈھنگ سے یہاں رہنا نہیں آیا۔"
"لاحول ولا...... میں کیا سانپ ہوں جو مٹی کھا کر بڑا ہوا۔ کوئی بات ہی اچھی کرلیا کرو۔" میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے کوفت چھپا کر یہی کہہ سکا۔
"چل تُو ہی کوئی اچھی بات کرلے...... وہ تیرے گھر آٹھ بجے والے ڈرامے میرا مطلب...... تیرے رشتے والی بات کا کیا انجام رہا۔ اصل میں وہ اماں پوچھ رہی تھیں کہ اگر ضرورت ہو تو ان کی نظر میں ایک دو کڑیاں ہیں بات چلا کر دیکھیں۔" وہ چسکے لینے کو گویا ہوا۔
"نہیں بھائی، مجھے لگتا ہے یہ کام میری ماں کو ہی کرنے دیتے ہیں...... خالہ کندن تو اپنی بہو بھی گوہر نایاب ہی ڈھونڈ کرلائی تھیں اب سارا دن اس پر نظر رکھنے اور کن سوئیاں لینے میں انہیں کہاں وقت ملتا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا ان کی مشکلات میں اضافہ ہو......" مسکرا مسکرا کر میں نے بھی احساس دلا دیا کہ

یہاں سب ہی ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے باخبر ہیں۔ لہٰذا وہ بری طرح سے جھینپ گیا۔
"توبہ غافل! تم کب سے یہ پھاپھا کٹنیوں والی گفتگو کرنے لگے؟" خفت مٹانے کو اس نے عبید کو دیکھ کر کہا۔
"جب سے یہ پھاپھا کٹنیاں مردوں کی کھال میں گھسنے لگی ہیں۔" میں نے قہقہہ مار کر اس کا کندھا سہلایا جس میں عبید نے بھی میرا ساتھ دیا اور اسے چھیڑتا ہوا واپس لے گیا۔
دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجتا میں گھر میں داخل ہوا تو موڈ خراب ہو چکا تھا۔ پھل برآمدے میں رکھے جس کے سامنے آپا جی کے کمرے سے باتوں کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور میرے کمرے سے بچوں کا شور......
"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ ......" کمرے کی حالت دیکھ کر میرا سر چکرا گیا کہ وہ مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تکیے بیڈ کے نیچے، بیڈ شیٹ زمین پر دھول چاٹتی...... اور موبائل کی چھینا جھپٹی میں وہ سب ہر جگہ بے ترتیبی پھیلا رہے تھے۔ میری آواز سن کر دم سادھ گئے۔
"ادھر لاؤ سیل فون ...... یہ کوئی کھیلنے کی چیز ہے۔" میں نے ہلکا سا ڈپٹ کر موبائل اس کے ہاتھوں سے لیا اور...... شاہین باجی کا چھوٹا بیٹا بیڈ سے اتر کر دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر لوٹیاں لگانے لگا۔ پوری قوت سے بھاں بھاں کی آوازوں نے مجھے بوکھلا دیا۔
"ارے رے کیا کر رہے ہو موبائل نے کاٹ لیا کیا...... میرے شہزادے ایسے نہیں کرتے اُٹھ جاؤ شاباش۔" میں نے گھبرا کر اسے پیار دینے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ جھٹک کر لاؤڈ اسپیکر مزید بلند کیا اور لٹو کی طرح گھومنے لگا
"گندے ماموں...... گندے ماموں۔" کراہ کر میں نے اس کی نوٹنکی ملاحظہ کی جو ذرا سی بات پر زمین پر پڑا عجیب سا ناگن ڈانس کر رہا تھا۔ عین وقت پر باجی نے انٹری مار دی۔
"ارے کیوں رو رہا ہے میرا بچہ...... غافل دیکھ کیا رہے ہو کیسے تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے اُٹھاتے کیوں نہیں ہو۔ کیا تم نے اسے مارا ہے؟" اُسے زمین سے سنبھالتے سنبھالتے اُنہوں نے شکی نگاہوں سے مجھے گڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔
"نن...... نہیں باجی، بھلا میں کیوں......" میں نے ہاتھ کھڑے کیے۔
"تو پھر کیا ہوا ہے میرا بچہ تو بڑا صبر والا ہے نہایت معصوم...... بلاوجہ تو کبھی نہیں روتا، مما بتاؤ کیا ہوا ہے؟"
مما کا صبر والا بچہ یہ ارشاد سن کر اور شدت سے حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا اور ایسے میں سرخ آنکھوں سے میری سمت یوں دیکھ رہا تھا جیسے بہت خوف زدہ ہو کر بھوت کو دیکھ رہا ہو۔
"استغفراللہ باجی! کچھ زیادہ ہی لاڈلا ہے...... اور معاف کیجیے گا اسے ڈرامے ذرا کم دکھایا کریں۔ ابھی سے کرنے لگا ہے۔" میں کہہ کر جانے لگا کہ وہ برس پڑیں۔
"کیا کہا؟ ادھر واپس آؤ...... میرے بچے کی تکلیف تمہیں اداکاری لگتی ہے۔ کہتی ہوں میں آپا جی سے...... دو دن بہنیں گھر کیا آ جائیں بھانجے چبھنے لگتے ہیں۔ ابھی یہ حال ہے تو بیوی کے آنے کے بعد آنکھ کا پانی ہی مر جائے گا۔" ان کے تلخ لہجے پر میں فوراً دب کر بولا۔
"ارے۔ نہیں نہیں باجی...... کیسی بات کر رہی ہیں۔ میرا دل تو بچوں کے لیے موم ہے...... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ماشاءاللہ ابھی سے ہی بڑی اچھی اداکاری کر لیتا ہے۔ بڑا ہو کر یقیناً ایک کامیاب فلم اسٹار بنے گا۔" میری خوشامد پر وہ ذرا سا پگھلیں۔
"بس رہنے دو تم، ایسے ہی اچھے ہوتے تو تم پہلے آپا جی کے ساتھ انصاف کرتے۔ وہ میرا اشن ہماری بزرگ ماں کو مذاق کا نشانہ بنا گئی اور تم چپ چاپ دیکھتے رہے۔" وہ بیٹے کو اُٹھائے میرے

کمرے سے نکلیں تو میں ان کے پیچھے چلتا ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا...... یعنی آپا جی نے یہ بات انہیں بتا ہی دی تھی۔

''میں کر بھی کیا سکتا تھا باجی وہ بھابھی ہیں۔ اور ویسے بھی آپا جی ہمیں بڑوں کے معاملے میں پڑنے کہاں دیتی ہیں......'' میں نے صفائی پیش کی تو آلو چھیلتی مہرین نے بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔

''بس آپا جی بھی نا! ابھی کہہ دیتی تو حید بھیا کو، تو عقل ٹھکانے لگا کر رکھ دیتے ...... ہماری بھی سالیاں ہیں ایسے بے ہودہ مذاق ہم نے تو کبھی نہ کیے...... بلکہ مذاق بھی کیا یہ تو بے عزتی ہے۔ سر میں بلیچ کریم تھوپ کر سارے بال عجیب بھورے کر دیے۔'' اس نے غصے میں چھری سے آلو کے دو ٹکڑے کیے۔ نسیمہ بھابھی قریب نہیں تھیں ورنہ شاید مہرین اتنا کھل کر نہ بول رہی ہوتی......

''رہنے دو۔ محبت کی پٹیاں مرد کی آنکھ پر چڑھی ہوں ہو تو زبان گونگی اور ہاتھ بندھے ہوتے ہیں...... تو حید بھیا کھینچ کر رکھتے تو یہ مجال تھی۔ ویسے ہیں کہاں وہ......'' سلگ کر بولتی شاہین باجی کو خیال آیا۔

''اپنے کمرے میں ...... آلو کے فیتے (قتلے) آنکھوں پر سجا رکھے ہیں جیسے بیل جیسی خوف ناک آنکھوں سے پریوں جیسے ڈیلے برآمد ہو جائیں گے۔'' مہرین کا بس چلتا تو آنکھوں سے وہ دونوں قتلے جھپٹ کر واپس لے آتی جو کاٹنے کے دوران نسیمہ بھابھی مزے سے لیتے چلتی بنی تھیں۔

''ایک گول فیتہ منہ پر بھی رکھ لیتی تو چین آجاتا...... کتر کتر چلتی زبان بند اور جہاں پاک۔''

''ہوں! سارا مسئلہ تو اسی چلتی زبان کا ہے نا...... اور یہی زبان......!!'' شاہین باجی کچھ کہتے کہتے چونکیں۔ پھر انہوں نے ہماری سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس سے ہم دونوں بھی چونک گئے تاہم وہ کسی سوچ میں ڈوبی میرے سامنے خاموش رہیں...... یہ الگ بات کہ میرا دل اسی وقت کھٹک گیا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ......!

☆☆☆

نوک جھوک تو پہلے بھی چلتی، پھر بنا کسی حتمی انجام کے اختتام پذیر ہو جاتی۔ کتنے ہی فساد ہوئے، تلخ کلامیاں، لڑائی جھگڑے، کھٹی میٹھی باتیں مگر کسی نے تو حید بھیا کو اتنا حواس باختہ کبھی نہ دیکھا تھا جو اس دوپہر لنچ بریک کے لیے دکان سے گھر آئے اور اپنے ہی کمرے سے واپس ایسے بھاگے گویا کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔ چھت گرنے لگی ہو یا گر ہی گئی ہو......

آپا جی نے بیٹے کا یہ روپ بڑی حیرانی سے ملاحظہ کیا جو مٹھیاں بھینچے، متغیر رنگت کے ساتھ بے تابانہ گویا ہوئے۔

''آپا جی وہ اندر نسیمہ...... نسیمہ......'' وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ نام کی گردان کر پائے۔ ہم سب کے ساتھ آپا جی بھی دہل گئیں۔

''ہائے کیا ہو گیا...... ہیں بول، ارے کوئی دیکھو کہیں رسی شسی تو نہیں جھول گئی کم عقلے......'' آپا جی گھبرا گئیں۔ پولیس تھانے کی دھمکی دماغ میں سرخ بتی کی طرح روشن ہوئی۔

''خدانا خواستہ!'' میں فوراً اٹھا۔ ''خیریت ہے بھائی؟''

''وہ نسیمہ...... کچھ بول نہیں پا رہی۔ بس پاگلوں کی طرح دیدے پھاڑے سر مارے جا رہی ہے۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں یہی کہہ پائے۔ آپا جی کی چیخ سی نکلی۔

''ہائے ہائے چاٹ لیا اس نے زہر...... اب نہیں بچنا۔ ابا جی تکھے اٹھو۔ (جلدی آؤ)'' انہوں نے تیزی سے دوپٹا سنبھالا اور سب تشویش ناک چہروں سمیت کمرے میں جا گھسے۔

نسیمہ بھابھی کی حالت واقعی حیران و پریشان کن تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر کبھی ہونٹوں کو ہاتھ لگاتیں، کبھی چہرے کو، کبھی بولنے کی کوشش کرتیں...... ہونٹ باہم پیوست تھے اور اسی چیز سے وہ نہایت

خوف زدہ تھیں۔ ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ مجمع دیکھ کر مزید ہمت ہار گئیں۔

"جی جھلیے کیا ہو گیا...... کتھوں گونگے کا گُو تو نہیں لبھ کے ڈکار لیا۔" اُنھوں نے منہ پکڑ کر دونوں گال ٹھک ٹھک تھپتھپائے جیسے انسان نہیں ڈھول ہو کوئی جو بجانے پر بول پڑے گا۔

"آپا جی یہ تو آلو کے ٹکڑے آنکھوں پر رکھ سوئی تھی۔ شاید لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی، جگایا تو اس کی یہ حالت تھی۔ ہونٹ پر ہونٹ جم گئے ہیں۔" مارے بے بسی کے توحید بھیا کو اپنی محبوب بیوی کی حالت بیان کرنے میں دقت کا سامنا تھا۔

"ہوں! کہتی تھی میں کہ بڑوں کا لحاظ کیا کرو۔ زبان مت لڑایا کرو۔ اللہ ناراض ہو جاندا اے، پر تُو میری اک نہ سنتی، دیکھ لیا نتیجہ...... اللہ نے ہمیشہ واسطے ہونٹوں پر تالے ہی مار دیے ہیں کہ ہن کر بڑ بڑ......" سیانی ڈاکٹرنی کی طرح ایکسرے کر کے آپا جی نے اطمینان سے جو رپورٹ پیش کی اس پر نسیمہ بھابھی نے قہر برساتی نظروں سے انہیں دیکھا اور اپنا چہرہ گرفت سے آزاد کرانے لگیں۔

"ارے کیوں ٹکریں مار رہی ہے خدائی عذاب ٹالا تو نئیں جا سکدا...... کیا چھری سے خلا پیدا کر دوں؟" آپا جی ناراض ہو گئیں۔

"پر آپا جی! ایسے کیسے...... کہیں ٹھنڈ سے تو نہیں چپک گئے؟" توحید بھائی کے دل کو پنکھ لگے تھے۔

"پتر! آلو رکھے تھے برف کی ڈلی نہیں...... جو ٹھنڈ پے گئی۔" وہ کوڑی لائیں۔

"آپا جی...... اُو مطلب بہو! کچی نیند کی وجہ سے کوئی دورہ تو نہیں پڑا، مرگی کا......" دادا جی نے بھی سائنس لڑائی۔

"آپا جی نے ٹھیک ہی کہا، ہماری بزرگ ماں سے زیادتیوں کا یہ بدلہ ہے...... میں تو یہ تک نہیں کہہ سکتی کہ بھابھی بے چاری کی کرے تے ٹھنڈا پانی پی مرے...... پانی کے لیے بھی تو منہ کھلنا چاہیے نا، اب ناک کے راستے لنگھانے سے تو رہا......" مہرین نے قہقہہ لگا کر جنت کے کندھے پر تائید کے لیے ہاتھ مارا جو کندھا سہلاتی منہ بناتی دور ہوئی۔ کتنے زور سے لگ گیا تھا۔

"آپا مدر جی! آئی تو ٹھاٹ کہ چڑیل انٹری مار گئی ہے نسیمہ کے اندر......" شگفتہ بھابھی نے بروقت اردو انگلش ملا کر اپنی موجودگی کا بھی احساس دلایا اور سمجھ دار ہونے کا بھی...... مگر آپا جی تو آپ وڈی سیانی تھیں۔

"آہو! چڑیل تو یہ آپ ہے...... ڈائن کہو تو مانوں۔" آپا جی نے مزے سے کہہ کر ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر چپچپاہٹ محسوس کی۔ نسیمہ بھابھی کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کم بختوں مجھ پر لعنتیں بعد میں بھیج لینا۔ پہلے میری زبان چھڑاؤ...... پھر ایک ایک جملے کے جواب میں وہ خود سب کو پچھاڑ دیں گی۔ آپا جی کا ہاتھ غصے سے جھٹک کر وہ ان کی پہنچ سے دور ہوئیں مگر ایسا شاندار موقع آپا جی گنوا کیسے سکتی تھیں۔

"ارے ارے اسے تو واقعی مرگی کا دورہ پڑ رہا ہے......" وہ چلائیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی جانب کھینچنا چاہا مگر بھابھی جائیں دوسری جانب...... مسلسل بھنچے ہونٹ، چہرے پر صدمے و طیش کی سرخی، پھٹی پھٹی آنکھیں اور حصار توڑنے کے لیے ہوتی مزاحمت انہیں واقعی کسی بگڑے جنات کے زیرِ اثر سے کم نہیں دکھا رہی تھی۔

"اے بہو...... آخوں آخوں (وہی کھانسی کا وقفہ) قابو کرو بچی کو...... یہ دورے کی شامت ہے یا پھر کوئی سایہ......" ان کی بات پر توحید بھائی کانپ کر بھابھی کی طرف بڑھے۔

"نسیمہ......"

"ابا جی! تسی فکر ای نہ کرو، لاؤ اپنا چمڑے کا کھسہ...... ابھی سونگھا دیتی ہوں دو منٹ اچ دورہ ٹُٹ جائے گا۔"

"دادا جی کا تاریخی شوز...... چھی چھی۔" شگفتہ بھابھی نے ناک دبا کر کراہیت کا اظہار کیا تو نسیمہ بھابھی آپے سے باہر ہونے لگیں...... دو تین بار

ہمت کر کے ہونٹ الگ کرنے کی کوشش کی مگر بھاپ بھی نہ نکال سکیں۔ یہ جگہ نازک تھی اور چھلنے کے ڈر سے وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھیں۔

''لاؤلاؤ اباجی...... پتر پکڑ اُدھر سے شاوا......''

دادا جی نے کھانستے کھانستے کھسہ اُتار کر دیا تو آپا جی نے نسیمہ کو پکڑے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے بے تحاشا عاجز آ کر مداخلت اندازی کرنے کی کوشش کی۔

''چھوڑیں آپا جی! یہ سب بیکار ہے، میں ابھی جا کر......''

''اُوئے چپ اے بے ہدایتا، تجھے کچھ ملوم نہیں...... نکل جا کرے توں......'' دادا جی اپنے کھسے کو بیکار کہنے پر نہایت برا مان گئے۔

''اے توحید بچہ کس کے پکڑ، دیکھ کیسے منہ تیرے بغل میں گھسا رہی ہے۔ کھسہ سونگھانا ہے بغلیں نہیں، منہ ادھر پھیر......'' توحید بھیا روہانسے ہی ہو گئے۔

''آپا جی...... میں ڈاکٹر بلا کر لاتا ہوں یہ رہنے دیں۔'' انہوں نے ہمت کر کے ہاتھ واپس پلٹا دیا تو نسیمہ بھابھی شوہر کے منہ سے اتنی معقول بات سن کر ان کی پناہ میں لپٹنے لگیں۔

''وہ کیا کر لے گا بھلا...... میں نے تم سب کو پال کر جوان کیا ہے آخر، پتر ٹھنڈ میں تو لقوہ ویسے ہی مشہور ہے کہیں وہ نہ ہو جائے......'' انہوں سے سمجھایا۔

''اُف وہی ہو رہا ہے مدر آپا جی...... ایک گال سائیڈ میں کھنچتا جا رہا ہے۔ توحید بھائی، جلدی سے سلیپ ماریں......'' شگفتہ بھابھی نے نیا شوشہ چھوڑا۔

''ارے کدھر سلیپ مارے اتھے کوئی چکنا فرش ہے کیا...... تمہارا بھی دماغ چل گیا ہے۔'' آپا جی کو ذرا پسند نہ آئی یہ بے وقت کی پرا گنی۔

''اُوہو آئی مین سلیپ...... تھپٹر۔ میں نے سنا ہے لقوے میں گال پر تھپڑے مارے جاتے ہیں۔''

وہ نیم تعلیم خطرہ علم ہی نہیں خطرہ جاں بھی تھیں...... توحید بھائی کو اکسانے لگیں۔ بہت مجبور ہو کر انہوں نے ہلکے ہاتھ کی چپت لگا ہی دی تو نسیمہ بھابھی شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے دم سی ہو گئیں۔

ہر کونے سے آتے مشوروں سے وہ ہاہا کار مچی کہ آس پاس کے گھرانوں نے بھی تانکا جھانکی کی اور اپنی گناہ گار آنکھوں سے وہ سب دیکھا جو نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔

''سنا تھا پچھلے زمانے میں لوگوں کی شکلیں بگڑ جاتی تھیں۔'' کسی کو اپنا اعمال نامہ بہت شفاف نظر آیا۔

''آہو! اسلام میں تو ساس کو بڑا مقام حاصل ہے۔'' ٹھنڈی آہ بھر کر آپا جی نے بھابھی کو جتایا اور خود سوچنے کی کوشش کی کہ کون سا مقام حاصل ہے تاکہ مزید روشنی ڈالیں۔ کچھ یاد نہ آنے پر تردید کرنا ضروری نہ سمجھا کہ محلے کی عورتوں کو خود کون سا پتا تھا۔

پھر آپا جی کو باہر بلا کر باجیوں نے نجانے کون سی کانفرنس کی کہ لحظہ بھر میں آپا جی نے نیم گرم پانی اور روئی کی مدد سے ہونٹوں کو اچھی طرح دھو کر اس کا اثر زائل کیا...... اور ان کے ہونٹ ایسے وا ہو گئے جیسے صدیوں سے اسی انتظار میں ہوں۔

''یہ لے کوئی ایسا اوکھا کام نہ تھا......'' وہ فخریہ بولیں تو نسیمہ بھابھی نے چیخ مار کر ان سے گوڈے گوڈے عقیدت کا اظہار کیا۔

''ہائے مجھے زبان مل گئی اماں......'' انہوں نے فرط جذبات سے نجانے اپنی ماں کو پکارا یا آپا جی کو...... لیکن سب کی سانس میں سانس آ گئی۔ باجیاں ابھی تک ہنس رہی تھیں۔

''پتا ہے میں بہت ڈر گئی تھی...... میں تو مر ہی جاتی بنا بولے دادا جی......'' ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دادا جی نے پیار سے سر پر ہاتھ رکھا۔

''آپا جی کی خدمت کیا کر......''

''پورے جی جان سے دادا جی......''

میں سن کر ہنس پڑا۔ بالآخر اس ڈرامے کا اختتام ہوا تو انتہائی خوشگوار اور حیرت انگیز موڑ پر ورنہ نسیمہ بھابھی اور ایسی بات......؟

ذرا سی دیر میں یہ بات بہت سارے گھروں میں بریکنگ نیوز کی طرح گردش کر رہی تھی کہ ساس

سے بدسلوکی کی پاداش میں آپا بتولاں کی بہو کو آسمانی
آفت نے آلیا۔۔۔۔۔۔اب تو ہر بہو زبان درازی کرنے
کی سزا میں اسی طرح عبرت کا نشانہ بنے گی۔
ساسوں کے دلوں میں خوش رنگ لڈو پھوٹنے لگے۔
اور بہوؤں کی آنکھوں کے سامنے ”لمحہ فکریہ“
بے ہنگم ناچنے لگا۔ تو نسیمہ بھابھی بھی دل ہی دل میں
احسان مند اپنے خوب صورت ہونٹ آئینے میں
دیکھنے اپنی آرام گاہ میں تشریف لائیں۔۔۔۔۔۔سنگھار میز
بیڈ کے ساتھ تھا۔ رگڑ سے سرخ پڑتے اپنے ہونٹوں کا
دیدار کرتے ان کے پیروں میں سوئی جیسا کچھ چبھا۔
”یہ کیا۔۔۔۔۔۔“ وہ پاؤں اٹھا کر سوئی جیسی چیز
اٹھانے جھکیں۔ پھر چونک گئیں۔
”یہ یہاں۔۔۔۔۔۔ میرے کمرے میں، میں نے
تو۔۔۔۔۔۔؟“ وہ کچھ الجھ کر بڑبڑائیں اور پھر۔۔۔۔۔۔
”میرے بند ہونٹ، سونے کے بعد پھر یہ اور۔۔۔۔۔۔“
اور نندوں کی دبی دبی ہنسی۔ معنی خیز اشارے۔
وہ سمجھ گئیں۔۔۔۔۔۔ کوئی شعلہ سا لپکا۔ اک بارود
اندر باہر پھٹا۔ نسیمہ بھابھی کے وجود میں بجلی بھر گئی۔

☆☆☆

”میرے ساتھ یہ واہیات حرکت کس نے کی ہے
؟“ لال جلتا چہرہ، سلگتا لہجہ اور کچا چبا جانے والے انداز
میں وہ عین سر پر آ کر اس وقت ٹوٹی تھیں جب سب کھانا
کھا رہے تھے۔ ان کا غضب دیکھ کر سب کو ٹھٹکنا پڑا۔
”میں بھی سوچوں اچھی بھلی کمر سیدھی کرنے
لیٹی تھی یوں بولتی کیسے بند ہو گئی میری۔۔۔۔۔۔ شرم نہ آئی تم
لوگوں کو ایسا گھٹیا کھیل کھیلتے ہوئے۔ کس نے کیا ہے
بولو۔۔۔۔۔۔ آپا جی یہ آپ نے کیا ہے نا، میں اچھی طرح
سمجھ گئی ہوں۔۔۔۔۔۔“
”نسیمہ تمیز سے بات کرو۔“ توحید بھائی
گھرک کر بولے۔ مگر یہ تماشا اب رکنے والا نہیں تھا۔
”کیوں کرے تمیز سے بات، بلکہ ایسا کر پتر کہ تو
بھی اس کے تھلے لگ جا۔۔۔۔۔۔ اب اس عمر میں یہی تو رہ
گیا ہے بے عزتی سہنا۔ ہائے ابا جی، میری اپنے ہی گھر
میں کوئی عزت نہیں۔“ انہوں نے آبدیدہ ہو کر سر کی
پناہ لی تو ہم سب اپنی جگہ پر بے چینی سے کسمسائے۔
”عزت کروانے کے لیے پہلے کام بھی ویسے ہی
کرنے پڑتے ہیں خدا کے لیے بند کریں یہ ڈرامہ، میں
تو شروع سے آپ کے گلے کی ہڈی تھی لیکن یہ اوچھے
ہتھکنڈے اپنا کر آپ نے حد ہی ختم کر دی۔“ وہ بڑھ
چڑھ کر بول رہی تھیں تو توحید بھائی زچ ہو گئے۔
”میں نے کہا اب کیا ہوا ہے دو منٹ پہلے تک تو
۔۔۔۔۔۔“ خود مجھ سمیت سب ہک دک تھے کہ کچھ دیر پہلے
شیریں ٹپکاتی بھابھی مرچیاں کیوں چبانے لگی تھیں۔
”آپ نے جان کر، کر بھی کیا لینا ہے توحید
صاب۔۔۔۔۔۔ لیکن میری بس ہو گئی ہے۔ ہو گی آپ کی
ماں آپ کے لیے جنت، بیٹھ کر صبح و شام چومیں
چاٹیں مگر میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔۔۔۔۔۔“ وہ
فیصلہ کن بولیں۔ آپا جی خوش ہو گئیں
”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔۔۔۔ بڑی دیر سے
خیال آیا کب تک نکلو گی؟“
”پر کڑیے! کمرے میں جاتے ہی کسی بھڑ نے
کاٹ لیا تجھے جو تو بے ہوشوں والی باتیں کرنے لگی
ہے۔“ دادا جی نے ہوش دلایا۔
”ہوش کمرے میں جا کر آیا ہے دادا جی اور
توحید صاب کان کھول کر سن لیں۔۔۔۔۔۔ آپ کی ماں
نے میرے ہونٹوں میں ایلفی ڈالی ہے۔ یہ ہے ثبوت
سوراخ کرنے والی سوئی اور ڈھکن۔۔۔۔۔۔ جب میں
نے نہیں منگوائی تو کیسے آئی؟ یہ ان سب کا کیا دھرا
ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے ”چماٹ“ پڑوائی۔ دادا جی کی
جوتی عطر سمجھ کر مجھے سونگھانے کی کوشش کی۔ میرا
مذاق بنایا ابھی بھی زبان میں سنبھالوں۔۔۔۔۔۔“ وہ غصے
سے پھٹ پڑیں۔ وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔
”ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔“ آپا جی نے گال پیٹے۔ ”نی
کلموہی! کیوں ذلیل الزام لگا رہی ہے۔ جیسا منہ ویسی
چپیڑ۔۔۔۔۔۔ میں تیرے جیسی نہیں ہوں کہ فضول حرکتیں
کرتی پھروں۔ یہ سب تیرے کنبے کو شو بھا دیتا ہے۔“
”بھابھی! آپا جی نے یہ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔“ میں نے
معذرت خواہانہ لہجہ اپنا کر ملامتی نگاہ بڑی بہنوں پر

ڈالی تو چپ چاپ دبکی بیٹھی تھیں۔

"میں کیوں کسی پر یقین کروں یہاں تم سب میرے دشمن ہو...... کل کو میرا گلا گھونٹ دیا تو میری جنڈڑی تو رُل گئی نا۔ کون ذمہ دار ہوگا۔" نسیمہ بھابھی نے تیکھے لہجے میں مجھے جھاڑا تو دادا جی بے ساختہ گویا ہوئے۔

"اُو نہیں بہو! دل چھوٹا نہ کر تُو قیامت تک میرے ساتھ چپے چپے پر لڈیاں ڈالتی پھرے گی ان شاء اللہ۔" انہوں نے تسلی دی جو بھابھی نے بالکل نہ لی۔

"پوچھیے ان سے کس نے کی ایسی بدمعاشی...... آپا جی کے علاوہ یہ تین خرانٹ عورتیں بھی موجود ہیں۔ بول ری جنت، تو بھی شامل تھی تجھے تو میں اپنی بھابھی کے روپ میں دیکھتی آئی ہوں مگر تو نے تو رشتے داری کا بھی لحاظ نہ کیا اور کمینگی کی حد کر دی۔" انہوں نے توپوں کا رخ موڑ دیا جیسے آج وہ اگلوا کر دم لیں گی۔

"نن...... نہیں بھابھی! میں نے نہیں کیا۔ خواہ مخواہ الزام تو نہ لگائیں۔" جنت نے گھبرا کر جواب دیا اور آپا جی جھٹ جھانپڑ رسید کیا۔

"کیوں نی، تجھے اس میراثن کی بھابھی بننے پر کوئی اعتراض نہیں......؟" انہیں جنت کا آدھی بات کا جواب دینا برا کھلا۔

"اوہو آپا جی! وہ اپنی پوزیشن کلین کر رہی ہے۔" لفظ صاف کے لیے "کلین" کا ٹکڑا لگانے والی یہ شگفتہ بھابھی کے سوا اور کون ہو سکتی تھیں۔ آپا جی کی ناسمجھ آنے والی تشفی کرائی۔

"ایں وہ کیا بلا ہے؟" انہیں مزید تاؤ آ گیا۔

"بس کرو بھابھی! بہت تماشے دیکھ لیے ہم نے، تم بھی کوئی دودھ کی دھلی نہیں ہو...... سچ جاننا چاہتی ہو نا تو میں نے کیا ہے یہ سب بتاؤ کیا کر لو گی۔" چپ بیٹھے ہوئے شاہین باجی نے آخر تنگ کر بلی تھیلی سے نکال ہی دی۔ پل بھر میں سب کو سانپ سونگھ گیا۔ آپا جی کو باجی نے آخر میں سب کچھ بتایا تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ اعتراف ہو لہٰذا سر گرا لیا۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا نا یہ سب میرے شریکوں میں شامل ہیں...... کیا کہہ رہے تھے آپ کہ آپا جی سے جا کر دوستی میں پہل کروں۔ ارے یہ تو مجھے جیتے جی نگل جانا چاہتی ہیں۔ پورے محلے میں میری عزت دو کوڑی کی کر دی...... کیسے کیسے ٹھٹھے لگائے......" وہ بھاں بھاں رونا شروع ہو گئیں۔

"اس میں کیا غلط بات ہے آخر آپ کو بھی تو احساس ہونا چاہیے کہ مذاق بننا کیسا لگتا ہے...... کیا آپ کو خود کچھ نہیں یاد؟" مہرین بھی بول پڑی۔ توحید بھائی اُٹھے۔

"نسیمہ! چپ کرو...... اندر چلو" باجی کا اعتراف سن کر وہ نہایت سنجیدہ اور سپاٹ سے ہو گئے۔ مجھے ان کے لیے افسوس سا ہوا۔

"اب اندر نہیں باہر جانا ہے توحید صاب مر جاؤں گی پر ان لوگوں کے ساتھ نہ رہوں گی...... دانیال، منے، نی جوئیں مارنی کلسی جلدی آؤ سارے میرے سامنے، ادھر سیدھی لائن بناؤ۔ نانی کے گھر جانا ہے۔" وہ غالباً بچوں کو اسمبلی کی لائن بنوا کر ہانکنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ بچے بھاگے آئے۔

"ارے، جاؤ جاؤ جان چھوڑو ہماری، میں اپنے فرماں بردار بچے کا دوجا ویاہ کرواؤں گی...... ایسی ووہٹی لاؤں گی جو قدر شان کرنا جانتی ہو...... تم سے تو توحید نے زبردستی پسند کی شادی کروا کر ہمارے خاندان کی شان کو بٹا ہی لگوایا ہے ورنہ ہمارے خاندان کی عورتیں بھی ایسے دنگل نہیں لڑتیں۔" آپا جی نے بھی حساب بے باک کیا۔ چوٹ کاری تھی۔

"آہا! پہلے ایک کا ویاہ تو کرا لیں۔ کون پاگل ہو گی جو آپ سے سر پھوڑے گی......" نسیمہ بھابھی نے طنزیہ نگاہیں میری سمت اچھال کر وار کیا۔ مجھے بیچ میں گھسیٹنا وہ نہیں بھولتی تھیں۔

"چلیں توحید، آپ بھی میرے ساتھ چلیں...... ایسے سازشی دماغ......"

"ایک منٹ بھابھی! سچائی اگلوانے کا بہت شوق ہے نا آپ کو تو میں بھی بنا بتائے آپ کو جانے تو نہیں دوں گی۔ جیسی شکل خود کی ہو تو آئینے میں ہر

بندہ ویسا ہی نظر آتا ہے۔ جب آپا جی کا مذاق آپ نے بنایا تب آپ کی تہذیب کہاں گئی تھی؟ ساس کا مضحکہ اڑاتے آپ کو تو ذرا لحاظ نہ آیا کہ وہ آپ کی ماں کی ہم عمر ہیں۔ آپ نے ثابت کیا کہ ماں ماں ہوتی ہے اور ساس، ساس...... اس لیے ہمارے لیے بھی ہماری ماں اہم ہے بجائے بھابھی کے......" مہرین بولتے بولتے سانس لینے کو رکی۔ شاہین باجی کی خاموشی ان کے ساتھ ہونے کا اشارہ تھی۔

"آپا جی اس سازش میں شامل نہیں تھیں مگر سچ کہا گلشن نے کہ جہاں بہوئیں ساس کے خلاف سازشیں کرتی ہوں وہ گھر امن میں رہ بھی کیسے سکتا ہے۔ آپ نے سوچ لیا کہ ہم چپ رہیں گی۔ اس سے پہلے کہ توحید بھیا اپنا دل بہنوں سے خراب کریں میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ آپا جی کے بال سفید کرنے والی یہ آپ کی بیوی تھیں...... نسیمہ بھابھی نے آپا جی کے بالوں میں بلیچ کریم ڈالی تھی جس سے ان کے سارے بال آگ رنگ میں تبدیل ہو گئے اور جس سے سارا دن عورتیں رات کو اچھی بھلی سوئی آپا جی کے صبح اٹھتے ہی بالوں کی ایسی حالت پر ناک پر ہاتھ رکھتی تھیں اور دبے منہ باتیں بناتی تھیں...... تب سب سے اونچا ہنسنے والیوں میں یہ نسیمہ بھابھی سب سے آگے تھیں۔"

مہرین جذبات کی تمازت سے سرخ چہرے کے ساتھ خاموش ہوئی تو الجھن میں گھرے توحید بھائی کی آنکھیں تحیر سے پھیلیں۔ نسیمہ بھابھی بری طرح گڑبڑا گئی تھیں۔

"وہ...... وہ......" لڑکھڑاتی زبان نے مزید ساتھ نہ دیا۔ توحید بھائی کے چہرے کے بدلتے تاثرات انہیں ہولا رہے تھے۔ بازی ان کے ہاتھ سے نکل رہی تھی۔

"نسیمہ! تم یہ نہیں کر سکتی ہو......!" دکھ کی شدت سے ان کی آواز بھی لڑکھڑا گئی تھی۔ مجھے اپنا آپ اس وقت کسی اضافی کردار کے جیسا لگا جو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا ان کے لیے۔

"یہ...... یہ کچھ بھی کہہ رہی ہے توحید! تم مجھے جانتے ہو نا، اور تم جانتے ہو یہ سب تو شروع سے راضی نہ تھے ہماری شادی کے لیے...... اب بھی چاہتے ہیں ہم دونوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ تم میرے ساتھ چلو یہ ہمیں سکون سے جینے نہیں دے سکتے۔" وہ خود کو سنبھالا دینے کے لیے جذبات کا سہارا لینے لگیں۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا نسیمہ!" توحید بھائی بولے اور آپا جی چھالی چوڑی کر کے بیٹھ گئیں۔ "تم نے میری کسی بات کا مان نہیں رکھا اور تم اب بھی نہیں مان رہیں...... میں نے کہا تھا تم دل جیتنے کی کوشش کرو لیکن تم نے مقابلہ بازی کو اہم جانا۔ میں نے کتنی محبت سے شادی کی تم سے اور......"

"میں بھی تو اتنا ہی چاہتی ہوں نا آپ کو توحید، آپ تو بہت اچھے ہیں...... آپ چلیں میرے ساتھ۔ بھلے سے یہ لوگ آپ کو جائیداد کاروبار سے عاق کر دیں، میں خود گا بجا کر اتنا کما لوں گی۔ میری آواز نصیبو لال سے کم تو نہیں بلکہ لوگ تو مجھے اس کا استاد مانتے ہیں۔"

"تم گا بجا کر زندگی گزارنے کو ترجیح دو گی اور یہ عزت کی زندگی گوارا نہیں؟" توحید بھائی غصے سے کھولنے لگے۔

"کیا گانے بجانے والوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟ میرے خاندان والے بھی محنت کرتے تھے بھیک نہیں مانگتے، ان کی کوئی اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟" انہوں نے شکوہ کیا۔

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تم سے میری ماں کی باتیں برداشت نہیں ہوتیں اور تم بدلے لیتی ہو جبکہ گھر گھر جا کر دوسروں کی باتیں سن کر تمہاری شان بڑھتی رہے گی، وہ برداشت کر لو گی۔" وہ بہت دکھی نظر آرہے تھے نسیمہ بھابھی نے سلگتی نظر سب پر ڈالی۔

"یہ سب بکواس ہے توحید، سب کچھ انہی کا کیا دھرا ہے مجھے صرف تمہاری زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں یہ سب۔"

"تو پھر جاؤ، دیکھ کیا رہی ہو...... میں اپنے پتر کا بیاہ رچاؤں گی۔ دھوم دھام سے، ساری دنیا دیکھے

گی۔" آپاجی نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

"نسیمہ! تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔ میں تم پر یقین کر لیتا مگر تم نے بند کمرے میں بھی جب آپاجی کے خلاف میرے منہ پر باتیں کیں وہ۔ میری پیٹھ پیچھے کرنے پر تم سے کیا بعید...... لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہا۔ تم جو بہتر سمجھو کرو، لیکن بعد میں بھی واپس تمہیں خود آنا پڑے گا، سب کچھ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیونکہ دوبارہ سے ایسی حرکتیں میں برداشت نہ کر پاؤں شاید اور...... یہ میرا فیصلہ ہے۔"

تھکے تھکے سے توحید بھائی نے افسردگی سے کہا اور میں جانتا تھا کہ ان کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی تھی۔ نسیمہ بھابھی نے غصے سے پاؤں پٹخے، بچوں کو دبوچا۔ یعنی وہ رکنے والی پھر بھی نہیں تھیں۔ شمیم آراء جیسے تاثرات کے ساتھ انہوں نے مجازی خدا کو دیکھا۔

بجنا جے توں ہاسے دتے
دکھ وی اچھے خاصے دتے
لوکاں نے تے گل ای کیتی
توں تے کھول خلاصے دتے

پُرسوز آواز بنا کر انہوں نے حسب عادت اپنی پنجابی جھاڑ کر سنجیدہ صورت حال میں ہاسا نکال کر رکھ دیا۔ نسیمہ بھابھی باہر نکل گئیں تو سب نے اپنی گہری سانسیں آزاد کیں...... میں بے اختیار باہر کی سمت لپکا تو آپاجی نے فوراً آواز دی۔

"اے غافل! کدھر بھاگ رہا ہے...... ذرا دوڑ کر جا میرے لیے ڈکار والی ٹھنڈی بوتل پکڑ لا، دل جگہ پر نہیں رہا میرا...... ڈھکن نہ اُتارنا گیس نکل گئی تو ڈکاریں نہیں آتیں سمجھا۔" انہوں نے حکم دیا۔

یہ بھی آپاجی کی سائنس تھی کہ دل جگہ پر نہ ہو تو ڈکار والی بوتل...... یعنی سیون اپ پی کر دل کو منا کر واپس جگہ پر لایا جائے۔

"ہائے، میرے تو بڑے ہارٹ میں کولنگ کولنگ ہو گئی۔" شگفتہ بھائی نے میدان صاف دیکھ کر لمبی انگڑائی لی۔

سب کو یہ معمول کا حصہ لگ رہا تھا۔ حالانکہ نسیمہ بھابھی اس طرح گھر چھوڑنے کا اعلان پہلی دفعہ کر کے گئی تھیں۔

یہی وہ وقت تھا جب ان کے جانے سے ایک نئے کردار کی آمد ہوئی...... طوفان کے بعد کی خاموشی میں ہلچل کرتا اک نیا کردار!

☆☆☆

سنہرے مارچ کا یہ خوش گوار دن اتوار کا تھا۔ مارچ کے اکیلے سورج کی پگھلتے سونے جیسی دھوپ میں حدت اتنی زیادہ نہ تھی کہ گراں گزرتی...... موسم بہار کی رعنائیاں، نٹ کھٹ ہوائیں اور پُرسکون فضا...... ایسے میں آپاجی کے سامنے خاندانی وچولن حاضر تھی۔ اپنی تمام تر تیز طراری کے ساتھ......

"آپا بتولاں! میں تو جو جوڑا بناتی ہوں نا، اللہ کے کرم سے اس جوڑے کے کرم آج تک نہیں پھوٹے...... ابھی تک ساتھ نباہ رہے ہیں۔" وچولن کے سامنے چائے اور بسکٹ ترتیب سے بجے تھے، چائے سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور ساتھ میں اس مٹھی سے بھی جس میں آتے ہی آپاجی کے طرف سے دیے ہزار کے کڑکتے نوٹ کو اس نے کس کر دبا لیا تھا۔ آپاجی نے بے دھیانی میں بات سنی مگر دریافت کیا تو قدرے حیرانی سے۔

"ہیں پر تُو نے یہ درزن کا کام کب سے شروع کیا...... اور تُو تو سستا اور گھٹیا کپڑا پہنتی ہے پھر کیسے جوڑے ساتھ نبھا رہے ہیں؟" ان کی حیرت واقعی بجا تھی۔ وچولن گڑبڑا گئی۔

"میں شادی شدہ جوڑوں کی بات کر رہی ہوں...... یعنی میں نے آج تک جتنے رشتے کروائے۔"

"رہن دے، میری شاہین شمیم کا بھی تُو نے ہی کروایا۔ ایک کا پیٹ خوف ناک ہے تو دوسرا سلطانہ ڈاکو کا پتر، میری بچیاں آج تک میری جندڑی کو روتی ہیں۔" آپاجی کو داماد معقول ہی لگتے تھے مگر وہ منہ پر اس وچولن کی تعریف کیوں کرتیں......

"آئے ہائے، اتنا تو اتفاق سے، ہو ہی جاتا ہے اب کوئی بندہ سانس دبا کے توند اندر گھسائے

بیٹھا ہو تو ہمارا کیا قصور ...... ہاں لیکن لڑاکا نہیں ہو سکتے۔ ویسے آپا بتولاں تیری منجھلی بہو تو خاصی لڑاکا ہے، یہ بڑی والی سے منہ ماری نہیں ہوتی؟" اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے مزے لینے چاہے۔

"ارے منہ ماری کیسے ہو گی آدھی سے زیادہ باتیں تو وہ انگریز مردودوں کی زبان میں کرتی ہے..... نہ کچھ متھے پڑتا ہے نہ جواب دینے کی نوبت آتی ہے۔" آپا جی کا منہ بن گیا تھا۔

"برا نہ ماننا آپا جی! لیکن لوگ بڑی باتیں کریں گے کہ ایک بہو کو گھر سے نکال کر دوسری بہو لانے کا خیال...... بہوؤں کی بات کون کرتا ہے بری تو ہمیشہ ساس ہی کہلاتی ہے۔" آنکھیں مٹکا مٹکا کر وہ چسکوری آپا جی کو بڑھاوا دینے لگی کہ کچھ سن گن لے...... آپا جی نے بردباری سے سر ہلایا۔

"یہ بات تو تو نے بڑی درست کی...... چل تو رہنے دے رستہ پکڑ اور جا کر ایسے لوگوں کی باتیں سن۔ لا واپس کر میرا ہزار کا نوٹ...... نی جنت آکر چائے بسکوٹ (بسکٹ) اٹھا لے، اور دروازہ بھی بند کر دے ٹھیک سے، یہاں اس کا کوئی کام نہیں۔" آپا جی کی سنجیدہ تان پر چائے کا گھونٹ لیتی وچولن نے بلبلا کر چائے نگلی اور آپا جی کا ہاتھ تھاما۔

"آئے ہائے، کیسی غیروں والی بات کرتی ہو آپا...... یہی تو ٹھیک ٹیم (ٹائم) ہے، بہو لانے کا، لوگوں کا کیا ہے کوؤں کی طرح چونچ ہی مارتے ہیں۔ تیرا پتر مطلب میرا پتر...... اور میں اس کے لیے کوئی پری ہی ڈھونڈ کر لاؤں گی دیکھنا۔"

"اونہیں نہیں......" آپا جی نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔ "مجھے کسی پریوں یا جنات کے خاندان سے رشتہ نہیں کرنا، بس کوئی انسان کی بچی ہو۔ لیکن ہو صرف دنیا بھر کی انوکھی، ہر گوی سے الگ تے وکھری۔"

"ارے بھئی میرا مطلب تھا کہ جی جان لگا کر ڈھونڈوں گی وہ گوہر مقصود۔"

"خبردار! خبردار جو ایسے مردانہ ناموں والی کڑی لانے کا تو نے سوچا بھی تو...... ارے گوہر اور مقصود تو ماموں ہیں غافل کے، ناک کٹوانا ہے کیا برادری میں میرا تو نے۔" آپا جی سنتے ہی بدک گئیں۔ پھر ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"اوہو بتولاں......" وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

"میں کہیا پھر کیسی دنیا توں الگ تے وکھری...... دو ٹانگیں، دو ہاتھ، ایک ناک دوا کھاں والی نہیں؟"

"تو میں کیا چار ٹانگوں والی گائے کا کہہ رہی ہوں یا توں نے کڑیاں آڈر تے بنواتی ہے۔ ہیں، مخول کر دی اے میرے سامنے......" آپا جی کے ڈانٹنے پر وہ دانت نکوستی اٹھی۔

"بہت جلد خدمت میں حاضر ہوتی ہوں، میرا جوڑا تیار رکھنا۔" میں دادا جی کو دھوپ لگوانے کے لیے باہر لایا تو ان کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ آپا جی خوش ہوتے دادا جی کے گوش گزار کرنے لگیں۔

"ابا جی! تسی اپنا کرتا سلوانے کے لیے ڈال آؤ۔ بڑی جلدی ایسی شہنائی اور بھنگڑے پڑنے والے ہیں کہ شریکاں کے دل سڑ کے کولے کولے (کوئلے) ہو جانے ہیں۔" میں نے آپا جی کی بات پر ہنسی لبوں میں دبائی۔ دادا جی کے جواب سے پہلے اور کھانسی کے مختصر بریک پر جانے کے دوران ایک تیسری آواز ابھری۔

"ہیلو! آنٹی جی......" مہین و غیر مانوس سی آواز پر، ہم سب کے ساتھ آپا جی نے گڑبڑا کر تیزی سے سر آواز کی سمت میں گھمایا، اور نظروں کے سامنے کھڑے اس "فیشنی لفظ" میں مخاطب کرنے والے نئے نکور آئٹم کو اچھی طرح سے گھورا۔

"اب یہ مرن جوگی کون ہے......؟"

☆☆☆

"جی مجھے "گل بدن" کہتے ہیں۔"

ہونٹ مسکان کے قالب میں ڈھل کر وا ہوئے تو دانتوں کی چمکتی ہموار لڑی چھب دکھلا کر چھپ گئی۔ آنے والی نے اپنا تعارف کرایا تھا۔ درمیانہ قد، سفید رنگت پر ہلکی میک اپ کی تہ جو اسکن میں مدغم ہو کر رہ گئی تھی۔ پلکوں سے دانستہ بکھیرا کاجل، ہونٹوں پر لائٹ پنک شیڈ، موسم کی مناسبت سے ہلکے رنگوں کا، سلیقگی کو

اُجاگر کرتا خوب صورت سوٹ زیب تن کیے، موٹے دودھیا ہاتھ اور نیل پالش رنگے ناخنوں کے بیچ تھامی پلیٹ جس کے اُوپر بھی ڈھکنے کے لیے دوسری پلیٹ تھی...... گوشت پوست کا چلتا پھرتا پہاڑ جیسا وجود، جو نجانے کتنی جتنوں سے لباس و کھال میں قابو کیا ہوا تھا۔ وہ ایک نو عمر لڑکی تو نہیں لیکن پیاری سی ''خاتون'' کہلائی جاسکتی تھی۔ (خاتون تھوڑا اصاف ستھرا اور باوقار سا لفظ لگتا ہے نا)

''گل بدن...... حالانکہ کہنا تو گل دان چاہیے کہنے والوں کو......'' یہ آپا جی کی بڑبڑاہٹ تھی جو جسامت دیکھ کر فی الفور منہ سے برآمد ہوئی۔ پیچھے سے آتی جنت کو ہنسی کا جھٹکا لگ گیا۔ لیکن گل بدن صاحبہ بڑی خوش اخلاقی سے مسکراتی آگے بڑھی۔

''دراصل میں پھول کی مانند ہی ہلکی اور سدا بہار ہوں لہٰذا گل دان بھی کہا جائے تو وہاں بھی تو پھول ہی رکھے جاتے ہیں نا...... میں برا نہیں مانوں گی۔'' اپنی خوب صورتی جیسی مہکتی بات کہہ کر وہ آگے آئی تو آپا جی نے تیزی سے اس کا ارادہ بھانپ کر تخت پر اپنی ٹانگیں دراز کرلیں کہ کہیں وہ بیٹھ ہی نہ جائے۔ بھئی تخت ٹوٹ بھی تو سکتا ہے نا، آپا جی کو ساتھ لیتا ہوا دھڑام سے نیچے زمین پر۔

''جنت! جاؤ ذرا لوہے کی کرسی یہاں آکر رکھو۔'' مسکرا کر انہوں نے میزبانی کے فرائض نبھائے تو گل بدن صاحبہ گل افشانی کرنے لگیں۔

''بات کچھ یوں ہے آنٹی جی، کہ ہم لوگ آپ کے محلے میں نئے نئے شفٹ ہوئے ہیں۔ زیادہ نہیں ابھی دو روز قبل...... چیزیں سیٹ کرتے وقت لگ گیا اور محلے کے لوگ تو ایسے ہیں کہ گیٹ کے سوراخ سے ناک رگڑ رگڑ کر اندر تانکا جھانکی کرنا چاہ رہے ہیں مگر خود سے تعلق نہیں پیدا کرنا چاہ رہے۔ لیکن محلہ واقعی بہت اچھا ہے اس لیے ہم نے اس کا انتخاب کیا۔'' لوہے کی کرسی پر بمشکل تمام خود کو سمیٹے اس نے شاید اس لیے کی کہ کہیں آتے ہی محلے کی برائی کرنے سے ہم برا ہی نہ مان جائیں۔

''ہاں محلہ تو بہت اچھا ہے، یہاں کے لوگ جو روایت پسند، خاندانی اور عزت دار ہیں۔'' آپا جی کو بات نہایت پسند آئی۔

''بالکل۔ اس لیے آج میں نے سوچا میں ہی جا کر آپ کے غریب خانے پر حاضری دے دوں وہ دراصل......''

''ہیں! یہ تو نے غریب خانہ کس خوشی میں کہا...... ہم کیا تجھے شکلوں سے بوکھے ننگے لگ رہے ہیں؟ ارے یہ تو میری حویلی کا ذرا رنگ روغن اُڑا ہوا ہے غافل کی شادی پر کرواؤں گی تو پھر دیکھنا۔ میرے پیو بھائیوں کی پنڈ میں مربعے زمینوں کے ہیں تے جھیں (بھینسیں) ٹریکٹر، بیل بکرے وہ الگ......'' آپا جی فوراً جذباتی ہوگئیں اور وہ سب بتا کر دم لیا جس سے ثابت ہوتا کہ وہ خاندانی امیر ہیں۔

''اُوہو آنٹی جی! برا مان گئیں...... میں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے کہہ رہی تھی۔ دراصل میں آپ کے لیے یہ بریانی بنا کر لائی ہوں، خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا سوچا اسی بہانے میل ملاقات بھی ہوجائے گی۔'' گل بدن نے جھٹ ڈش پیش کی جس پر آپا جی کچھ شرمندہ سی نظر آئیں

''حق تو ہمارا بنتا ہے کہ ہم لوگ ہمسائیوں کی خبر گیری کرتے، پر ان دنوں ہمارے اپنے سو بکھیڑے...... خیر اب آگئی ہو تو آتی جاتی رہنا۔''

''جی وہ میں نے شکریہ ادا بھی کرنا تھا آپ کے بڑے بیٹے کا...... انہوں نے میری مدد کی۔ اس دن میں پھنس گئی تھی نا......'' گل بدن کی غیر متوقع بات پر خاموش دادا جی اُچھلے۔

''اُوئے، کس دے نال......؟'' بے حیائی کے اس مظاہرے پر دادا جی کا ہاتھ اپنے تاریخی کھسے کی طرف بڑھنے لگا۔

''دادا جی پوری بات تو سن لیں۔'' میں نے فوراً کھسے کو پہنچ سے دور کرتے ہوئے انہیں تخت پر سیدھا کیا۔

''وین میں...... سامان کافی زیادہ تھا اور دروازہ شاید چھوٹا، تو میں نکل نہیں پارہی تھی...... آپ کے بیٹے نے ہی مجھے سہارا دے کر نکالا اور پھر انسانیت کے ناتے

سامان بھی اُتارنے میں مدد کی۔ ایک شکریہ کہنا تو بنتا تھا نا۔" وہ گوڈے گوڈے شکرگزار تھی۔ اور اس سے بڑھ کر اس حسنِ سلوک پر خوش...... یہ یقیناً توحید بھیا کا ذکر تھا کیونکہ وہی نئے پڑوسیوں کی آمد کا ذکر کر چکے تھے۔

"لو بھلا تمہیں کیا پڑی تھی سوار ہونے کی...... ہم تو دیگیں منگوائیں تو وہ بھی کھلے پھٹے رکشے پر لاد کر لاتے ہیں تم تو پھر بھی ماشاء اللہ......" آپا جی نے بات منہ میں ہی دبالی۔ میں نے گھبرا کر گل بدن کی طرف دیکھا جو کمال حوصلے سے آپا جی کا اس کو "دیگ" سے بھی گیا گزرا کہنا برداشت کر گئی تھی۔

"ویسے تم پیچھے کہاں سے ہو؟"

آپا جی کے سوال پر اس نے ایکدم اپنے پیچھے دیکھا پھر آگے۔

"پیچھے...... یہیں اس گلی کے آخر والے گھر میں۔"

"نہیں، اس سے بھی پیچھے......" آپا جی نے یادداشت مزید ریورس گیئر پر ڈالی۔

"اوہ اچھا۔ یعنی پہلے...... جی تو ننہ شریف سے ہیں۔ بس پہلے والی جگہ انتہائی نامعقول لوگ رہنے لگ گئے تھے اس لیے ہمیں وہاں سے چھوڑنا پڑا۔ چھچھورے لوگ۔ بہن بیٹیوں کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں نا۔" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"شادی شدہ نہیں ہو؟"

"نہیں جی۔ قسمت میں ہوئی تو...... آج کل کے دور میں اچھے لوگ ملنا جیسے اُونٹ کو جہاز میں سوار کرنے والی بات......" وہ بری طرح سے شرما گئی اور آپا جی کو اچھی طرح سے بھا گئی۔

تو یہ گل بدن تھی...... امن برہم کرتی، ایسی ویسی بات نظر انداز کرنے والی اور اپنی کام کی بات کا سرا پکڑنے والی...... آپا جی کے اس نقطہ سوچ پر سب سے بڑی حامی کہ ایک بری مچھلی سارے جال کو گندے کر دیتی ہے جیسے کہ ایک برا انسان پوری نسل کے لیے داغ...... کم ذات ایک اُونچی ذات والے خاندانوں کے لیے بٹا بلکہ پتھر......!

آپا جی نے فوراً اپنی دکھوں کی پٹاری سے سارے غم نکالے اور ایک ایک کر کے بیان کرتی چلی گئیں...... گل بدن بھی جیسے سدا سے ویلی تھی۔ اس داستانِ امیر حمزہ کو جتنے غور و خوض سے سماعت فرما رہی تھی اگر اتنا ہی انرجی ضائع پہلے بھی کرتی رہتی تو اس قدر موٹی تو ہرگز نہ ہوتی......!

کتنی دیر تک اپنی دکھتی رگ (آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے) پر گل بدن سے پھول کی پتیاں تڑوا تڑوا کر رکھواتی رہیں۔ اتنی دیر میں توحید بھیا بھی گھر تشریف لے آئے...... جانے لگی تو آپا جی نے پلیٹیں ہمراہ کرتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔

"نیک ماں کی بچی ہو...... دوبارہ ضرور آنا۔ ابھی تو پوری گلاں ہی نہیں کیں، آنکھ بند کر کے آ جاؤ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

اور گل بدن بی بی نے سمجھ لیا۔ یہ کون سا الجبرا کا سوال تھا جو وہ سمجھنے میں وقت صرف کرتی۔

لیکن سوال کسی بھی چیز کا ہو سوچنا سمجھنا ضرور چاہیے۔ کر بیٹھی نا بے چاری غلطی...... اس کا بھی کیا قصور کہ صرف زبانی کلامی سن لیا تھا۔

ابھی نسیمہ بھابھی کو وہ "جانتی" تھوڑی نا تھی...... خیر!!

☆☆☆

گل بدن میں ایک ہی خامی تھی۔ جو بڑی بھی تھی اور عجیب بھی...... وہ بات کسی سے کرتی اور نگاہیں کہیں اور ہوتیں۔ مخاطب سامنے ہوتا اور وہ بولتے بولتے یوں سامنے والی دیوار کو گھورے جاتی جیسے یہ ساری باتیں وہیں گوش گزار کرنی ہیں...... سننے والا ایک بار تو پلٹ کر ضرور دیکھتا کہ سامع وہ خود ہے یا نظروں کے حصار میں کوئی نادیدہ شخص......

نیا بندہ بھلے حیران ہو وہ موصوفہ کبھی زمین کو، کبھی غیر مرئی نقطے کو مستقل مزاجی سے تکے جاتی۔ اُسے یقیناً چہرے فیس کرنے کا کوئی پرابلم تھا یا پھر آنکھوں میں نہ دیکھ پانے کا کوئی نفسیاتی مسئلہ...... بہرحال ایک بار تو محترمہ نے حد ہی کر دی۔ اپنے تئیں شرارت

"آپ تو اس عمر میں ہی کمال ہیں۔ جوانی میں

تو پریتی زنٹا کو بھی مات دیتی ہوں گی...... آپ کو من چلے دیکھ کر چھیڑتے تو ہوں گے نا؟" اُس نے تو آپا جی کی تعریف میں قلابے ملائے...... مگر برا ہوا کہ رُخ دادا جی کی جانب پھیرا ہوا تھا۔ مارے بے عزتی کے دادا جی پر تو اشتعال آمیز کھانسی حملہ آور ہو گئی۔

"اُوئے کی پئی بکدی اے شوخی جئی (کیا بکواس کرتی ہے) میں اسے اس وڈی مچ جیسی اکھاں سے زنانی دکھتا ہوں جو مجھے محلے والے چھیڑتے ہوں گے...... آج ہیں اسے چھڈ ناں ئیں۔" دادا جی کی مردانگی پر چوٹ پڑی تھی آخر...... وہ پوری آب و تاب سے بلبلا اٹھی۔ آپا جی بھی عجیب الجھن میں پھنسی تھیں کہ کس منہ سے کہیں بی بی منہ متھا سیدھا رکھ، پاسے نہ مار...... تاہم دھیمی آواز میں اسے وارن کیا۔

"دیکھ پتر! اج تے میں نے سن لیا، دوبارہ ایسے کافروں جیسے ناموں سے مجھے نہ ملانا، میرا ایمان خراب ہوتا ہے...... پھر جا کے شیشہ دیکھ، تیرے اپنے منہ پر کیسے نحوست برسنے لگی ہے۔" بے چاری گل بدن بی بی ذرا ذرا سی شرمندہ ہوئی کہے بغیر جانہ سکی۔

"میں کچھ عرصہ کنگن روڈ پر بھی رہی، پر آپ جیسے لوگوں سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا ہے...... ویری نائس جی!"

بعد میں جنت نے بتایا کہ اس آخری بات پر اس کی مسکراہٹ بڑی جبری جبری سی تھی۔ ہاں مگر اس بار دیکھ آپا جی کے پاسے (طرف) ہی رہی تھی۔

اگلے روز میں تیار ہو کر ٹائی کی ناٹ لگا رہا تھا جب جنت ناشتے کے لیے مجھے بلانے آئی۔ ناشتا آپا جی مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کرواتی تھیں۔

"نسیمہ بھابھی کے جانے سے تو گھر کی رونق ہی مدھم پڑ گئی۔ اب بھائی، تمہارے سر پر سہرا سجنے والا ہے یا تو کچھ سدھار آئے گا یا پھر نہلے پہ دہلا......" اس کے ہنسنے پر میں نے بھی ساتھ دیا۔

"توحید بھیا نجانے کیسے یہ ظلم سہہ رہے ہیں، آج کل میں لے ہی آئیں گے...... ویسے تمہاری نئی سہیلی کے ساتھ دل نہیں بہل رہا۔" میں نے آئینے میں اسے دیکھتے چھیڑا۔

"کہاں سارا دن تو شگفتہ بھابھی کچن میں گھسائے رکھتی ہیں۔ پہلے بڑی خوش تھیں اب بولتی ہیں نسیمہ زبان کی تیہیں ہاتھ کی بھی تیکھی ہے کیسے چھپا چھپ پراٹھے اُتارتی جاتی تھی میرے تو ہینڈز برن برن (جل جل) جاتے ہیں ہاہاہا۔" وہ انہی کی نقل اُتار کر بولی تو میرا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"السلام علیکم آپا جان جی......!" انتہائی جوش و خروش سے خاصا طویل سلام جھاڑا گیا تھا جس کی آواز یہاں تک آئی۔ میں حیرانی سے مڑا

"آپا جان جی...... ان کا تو کچھ زیادہ ہی دوستانہ نہیں چل پڑا ہے۔ چکر کیا ہے؟" میرے سوال پر جنت نے معنی خیز اشارہ کیا۔ آپا جی اسی محبت سے گویا ہوئی تھیں۔

"ارے جیتی رہو، خوب جان بناؤ...... اتنی محبت سے مجھے کبھی سگی اولاد نے نہ پکارا جتنی تم...... میرے پاس بیٹھو۔"

"لو جی! ویسے مجھے تو لگتا ہے ہمارے معصوم بھائی کے لیے آتی ہے جب بھی توحید بھیا کے گھر سے جانے اور آنے کا ٹائم ہو یہ فوراً چوٹی لہراتی آدھمکتی ہے، رلیغزل کہیں کی...... اسے ابھی خبر نہیں کہ نسیمہ بھابھی تو اس کی چوٹی عین اس وقت کاٹیں گی جب یہ اپنے قلعے سے اُڑنا شروع کر رہی ہو گی۔" ہاتھ پر ہاتھ مار ہم دونوں نے ایک بار پھر جاندار قہقہہ لگایا اور ایک ساتھ باہر نکلے...... حسب توقع گل بدن کو توحید "جی" سے ہی کوئی ضروری کام تھا......!

"مجھے کہتے ہوئے تو حیا آتی ہے مگر کیا کروں ضروری ہے نا...... ایک تو آپ کے بیٹے ہمارا شکریہ بھی نہیں قبول کرتے آپا جان جی۔" وہ خاصے لاڈ سے بولی تو آپا جی نے جھٹ میری خدمات حاضر کر دیں۔

"میرا پتر بڑا سجھا ہوا اور خوش اخلاق ہے یہ تو بس اس کی زندگی......" آپا جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "گھر والی کے معاملے میں نصیب بار کھا گیا جبھی بولایا بولایا پھرتا ہے ورنہ...... تو چل غافل کو کام

کہہ دے۔ یہ کر دے گا......"
"ارے نہیں آپا جان جی! کام بازار کا ہے بینک کا نہیں، وہ ہی کر لیں گے دکان پر جاتے ہوئے۔ ویسے آپ سے ایک بات کہوں...... کسی کے جانے اور کسی کے آنے کا صحیح وقت وہی ہوتا ہے جس میں یہ دونوں چیزیں وقوع پذیر ہوں۔ اشارے سیانے لوگ ہی پہچانتے ہیں، اور وہ دیر بھی نہیں کرتے......" گول مول سی بات کہہ کر گل بدن کمرے سے نکلی تو میں اس کی بات کے معنی ہی ڈھونڈتا رہ گیا...... جبکہ سیانی آپا کسی گہری سوچ اُوڑھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"آپا جی! توحید بھائی بچوں سے ملنے نہیں گئے؟" میں نے ان کا سکتہ توڑنے کے لیے بات شروع کی۔ بات کسی طرح تو شروع کرنی تھی جو بھابھی کی واپسی کی سبیل نکلتی۔

"جا کر لے آؤں گی میں خود...... پہلے ذرا بات سن، یہ گل بدن کیسی لگتی ہے تجھے؟" آپا جی براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں تو پراٹھا توڑتا میں بری طرح سٹپٹا گیا۔

"کک...... کون آپا جی...... آپ، آپ کی نیت گل بدن پر خراب ہو رہی ہے......" میرے منہ سے بکواس ہی نکل سکتی تھی ایسے شاک کے بعد۔ آپا جی نے جوتا اُٹھا لیا

"بے ہدایتا ماں کی نیت خراب کہے گا، شرم مر گئی ہے تیری منحوس یاروں کے ساتھ پھر پھر کر...... ادھر آ میں تجھ سے پوچھوں......" ان کے جلال نے مجھے تخت سے اُٹھا کر دور کھڑا کیا۔

"سوری سوری آپا جی! وہ بات...... غلط ڈھنگ سے نکل گئی ذرا......" میں نے فوراً معذرت کر لی مگر وہ آپا جی کی بات۔

"تیرے تو سارے انگ ڈھنگ ہی غلط ہیں...... وہ یاد نہیں کیسے......"

"آپ...... آپ کیا فرما رہی ہیں گل بدن کے بارے...... میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے فوراً ان کے خیالات کی یلغار پر بند باندھے...... کیونکہ ایک بار

پھر میرے پیدائش کے قصے، لنڈے کی شاپنگ اور نام رکھنے تک کی روداد سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔

"گل بدن مجھے بڑی معقول لگی ہے اور موقع بھی صئی (صحیح) ہے اپنی پریشانی کا پتا کاٹنے کا......"

"پر آپا جی! میں نے اسے باجی کی نظروں سے دیکھا ہے پہلی ہی نظر سے......" میری حالت کسی مشکل میں گرفتار مچھلی سے کم نہ تھی۔ آپا جی کی سوچ اس طرح پلٹا کھائے گی سوچا نہ تھا۔

"ہاں تو میں نے کب کہا اسے دشمن کی نظر سے دیکھو...... بلکہ میں تو یہ کہہ رہی ہوں اس سے پہلے توحید نسیمہ کو لانے کا سوچے، گل بدن سے اس کی شادی کروا کر اُس میراثن اور اس کے ٹبر سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑا لیں۔ ابھی زخم تازہ ہے، زیادہ چوں چراں بھی نہیں کرے گا۔" انہوں نے نہایت رازداری سے اپنی سوچ میں مجھے شریک کیا۔

"گل...... لیکن آپا جی نسیمہ بھابھی، کسی کو...... چھوڑیں گی نہیں۔" آخری دو لفظ صدمے کے زیر اثر سرگوشیانہ انداز میں منہ سے نکلے تھے جو آپا جی سن نہ سکیں...... لیکن میرے ہوش اُڑا کر وہ دوبارہ سے مراقبے میں غوطہ زن ہو چکی تھیں۔

"گل بدن...... اور توحید بھائی...... لیکن نسیمہ بھابھی۔" میرے ذہن میں یہ تین نفوس چکر پھیریاں کھانے لگے۔

آپا جی جو سوچتی تھیں وہ کرتی تھیں۔ میری شادی اور وہ تمام عناصر جس کی وجہ سے میں نے آپ کو یہ کہانی سنانا شروع کی پسِ پشت ہوتے چلے گئے...... اور آپا جی کے خیال جس دھارے پر بہہ رہے تھے وہاں میرا کردار دور دور تک اُبھرتا نظر نہ آ رہا تھا۔

گل بدن کی آمد نے کیا گل کھلائے...... وہ تو الگ...... فی الحال تو میرے مستقبل کے خیالی بچے اپنی پیدائش سے پہلے سامنے کے دو ٹوٹے دانتوں سمیت "توحید چچا" کی نئی شادی کے چاول کھاتے نظر آ رہے تھے...... آپ کو بھی یہی لگتا ہے نا......؟!!

☆☆

سالگرہ نمبر

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر و شاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بےزار ہے۔

نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بےعزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔
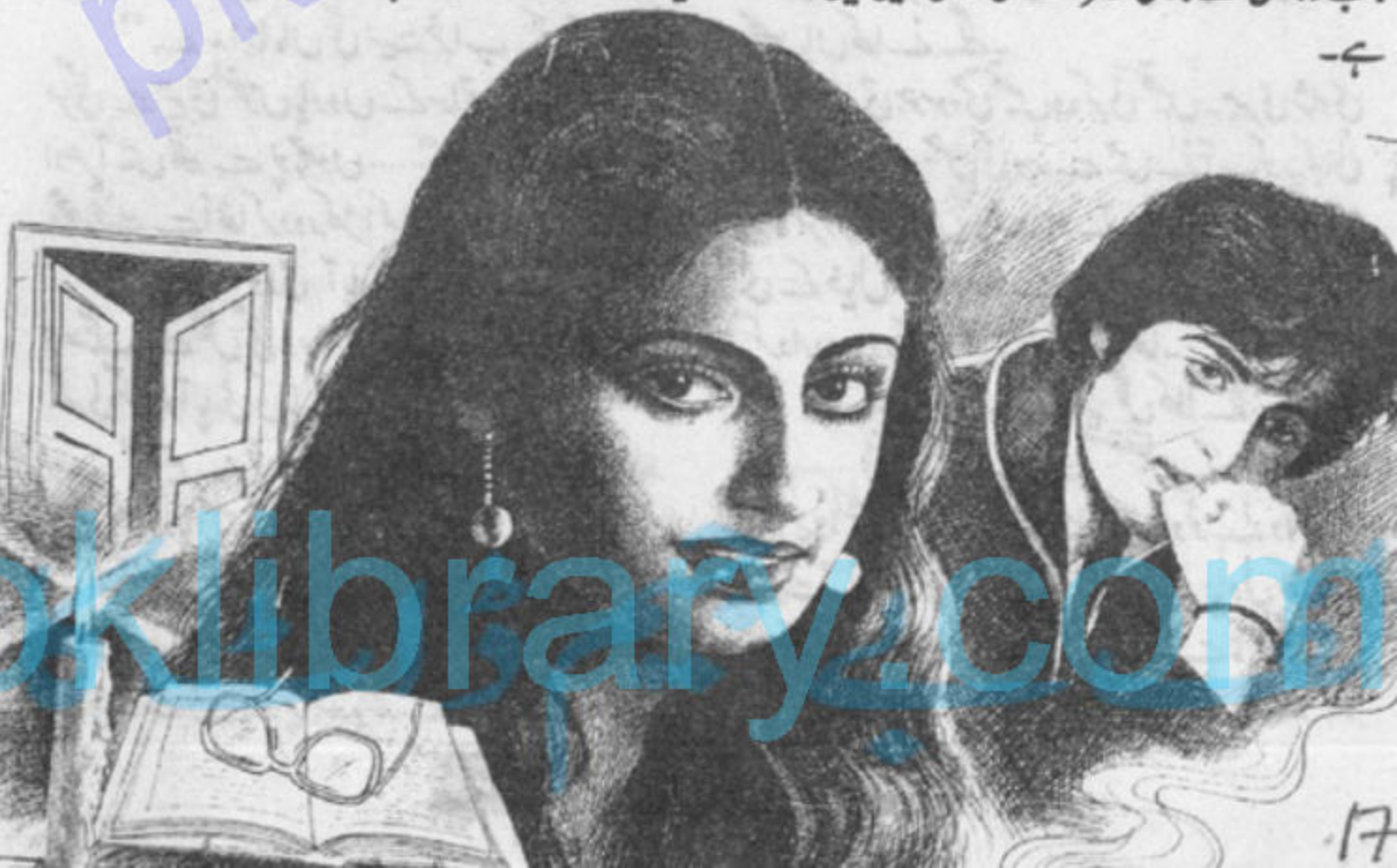
ارسلہ کو اپنی دوست رومی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔
ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

ابا کو اکبر جیلانی کے آفس میں ایک جاننے والے سے علم ہوتا ہے کہ آبص تو کافی عرصے سے معذور ہے وہ بامشکل گھر پہنچتے ہیں اور اماں کو بتاتے ہیں۔ اماں ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں اریبہ سے لیکن اریبہ کہتی ہے کہ وہ آج جو عیش کر رہی ہے، ان کے بیٹے کے اسی نقص کی وجہ سے کر رہی ہے۔

ارسلہ کا لالچ دیکھ کر مہوش کو اپنے کیے کا پچھتاوا ہے۔

نادیہ شاہ اپنی دوست کے ذریعے آبص کے بارے میں معلومات کرواتی ہے۔ وہ اس کو آبص کی شادی کی تصویریں سینڈ کرتی۔ نادیہ شاہ کی بات اس کے کزن حمزہ سے ہو جاتی ہے۔ نادیہ شاہ حمزہ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتی ہے لیکن بتا نہیں پاتی۔

نیلو کی زندگی شادی کے بعد چھوٹی موٹی تلخیوں کے ساتھ اچھی گزر رہی ہے۔ احمر اس کے لیے ایک ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے۔

عقیلہ خالہ کی خواہش ہے کہ ارسلہ سے نہ سہی اریبہ کی شادی سکندر سے ہو جائے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار سکندر اور اپنی بہن راحیلہ سے بھی کر دیا ہے۔ ارسلہ جب یہ سنتی ہے تو ان کے گھر جا کر سکندر کو بہت سناتی ہے۔

پندرھویں قسط

نادیہ شاہ کو اپنے سینے میں گویا برف کی سی یخ بستگی پھیلتی محسوس ہونے لگی۔ اعصاب ٹھٹھرتے محسوس ہونے لگے۔

"پلیز نادیہ لائن ڈس کنکٹ نہ کرنا۔" وہ اس کی آواز پہچان کر لجاجت سے بولا۔

"میرا کانٹیکٹ نمبر کہاں سے ملا۔"

"طلب سچی ہو تو نمبر ہی کیا پورے انسان کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ یہ نمبر میرے رب کی طرف سے مدد ہے یہی سمجھ لو۔"

وہ اذیت کے عالم میں ایک پل آنکھیں میچ گئی۔

"ہیلو...... ہیلو نادیہ۔" دوسری طرف سے بے تابانہ پکارا جانے لگا۔ "تم ٹھہری نہیں چلی گئیں، میری بات سنے بنا، مجھ کو حیران پریشان اور بے تاب کر کے۔ تم جانتی ہو میں مسلسل ایک جہنم میں جل رہا ہوں اور......"

"پلیز......" وہ یکدم اس کی بات کاٹ گئی۔ "مجھے اپنی بے تابیوں کے قصے سنانے کی ضرورت نہیں ہے کون کس آگ میں جل رہا ہے اور کون جل کر راکھ ہو چکا ہے اب سب بے معنی ہے۔"

"بے معنی تو زندگی ہو کر رہ گئی ہے تمہارے بعد۔" وہ آزردگی سے سانس کھینچ کر رہ گیا۔

"کس شے کی کمی ہے تمہارے پاس سب کچھ ہے، وائف ہے، اسٹیٹس ہے، فرینڈز ہیں، سارے رشتے ہیں تمہاری زندگی میں کوئی کمی کوئی خلا آیا ہی نہیں۔ ساری اذیت نا آسودگی تو میرے حصے میں آئی ہے۔ تم کیا رونا روؤ گے آبص جیلانی۔" وہ یوں چیختی تھی جیسے شیشے پر پتھر پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے ماضی کا وہ بدنما لمحہ آ گیا۔ بے عزتی اور ذلت کا احساس جیسے نئے سرے سے جاگ اٹھا اور تکلیف دینے لگا۔ "تم کیا کسی آگ میں جلو گے۔ تم نے محبت کی نزاکتوں کو سمجھا ہی کب۔ یہ جرم تو میں نے کیا۔ قربانی مجھ سے لی گئی۔ قتل میرا ہوا میری عزت کا۔ میری ایگو کا۔" عجیب بے اختیاری تھی جس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ آنسو آنکھوں سے بے آواز نکل کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں نادیہ۔ پلیز ایک بار تو مل لو پھر جو چاہے سزا دے دینا۔ بہت سی الجھنیں ہیں، سلجھانا چاہتا ہوں۔"

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے آبص۔ تمہارے اور میرے درمیان فاصلوں کا ایک پل آچکا ہے۔ بہت سا وقت پانی کی طرح گزر چکا ہے اب ریت میں کیا تلاش کرو گے۔''

''مجھے نہیں معلوم...... یہ فاصلے کیوں کیسے آگئے جاننا چاہتا ہوں اور نادیہ...... فاصلوں کی حقیقت اس وقت بے معنی ہو جاتی ہے اگر ہم ایک دوسرے کو پانے کی نئے سرے سے جستجو کریں۔ بیلیو می، ہم ایک بار پھر ایک ہو سکتے ہیں۔''

''آبص پلیز......''

''تم انکار کرو۔ مگر میں تم سے ضرور ملوں گا۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے چلایا۔ ''میرے پاس تمہارا ایڈریس بھی ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔ چاہے تم مجھے دھکے دے کر نکالو۔''

نادیہ شاہ کو جھٹکا سا لگا۔ یکدم کسی احساس سے نکل کر خوف زدہ سی ہو کر موبائل کو گھورنے لگی۔ جیسے اس میں سے آبص نکل کر آجائے گا۔ اس نے گھبرا کر لائن منقطع کر دی۔ گویا مزید تاخیر ہو گئی تو کوئی قیامت آجائے گی۔ مگر قیامت تو آچکی تھی۔ اس نے ذہن اور دل پر۔

☆☆☆

''تمہیں فرصت نہیں دو گھڑی کی۔ اتنا نہیں ہوتا کہ بہن کی خوشی کے لیے وقت نکال کر آجاؤ۔ تمہیں کون سا ہانڈی چولہا کرنا ہوتا ہے، صبح و شام بس موبائل سے تو لگی پڑی رہتی ہو۔'' اماں نے ارسلہ کو دیکھتے ہی آج بری طرح سنائیں۔ چار پانچ بار بلوا چکی تھیں مگر ہر بار یہی جواب آتا کہ فرصت ہوئی تو آجاؤں گی ابھی فارغ نہیں ہوں۔ اور صبح سے اماں تپی ہوئی تھیں۔

''اوہو اماں! آپ شروع نہ ہو جائیں۔ آ تو گئی نا۔'' ارسلہ بیگ کندھے سے اتار کر ایک طرف پھینکتی مسہری پر پھیل کر بیٹھ گئی پھر اریبہ پر نظر ڈال کر قدرے ناگواری سے بولی۔

''سچ بات تو یہ ہے کہ بہن کی خوشی کی تو آپ نے خوب کہی اماں۔ میری نظر میں تو یہ خوشی نہیں ہے کہ میں مناتی پھروں اور اسے مبارک بادیاں دینے دوڑی بھاگی چلی آؤں۔''

''یہ تو آپ کے چہرے سے ہی دکھائی دے رہا ہے کہ آپ کو یہ سب خوشی تو کیا دے گا الٹا ناگوار گزر رہا ہے۔'' اریبہ سے رہا نہ گیا وہ اس کے جلے کٹے انداز پر بگڑ کر بول اٹھی۔ ''اوہو...... دیکھ رہی ہیں امی اسے۔ کتنی لمبی زبان چل رہی ہے۔ بندر کے ہاتھ ہلدی لگی خود کو پنساری سمجھ بیٹھا۔'' ارسلہ بھبک کر مسہری سے اٹھی تو اریبہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''ہائے ہائے...... اب لڑنے مرنے بیٹھ جاؤ گی۔'' امی نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے دوبارہ مسہری پر بٹھا دیا، ساتھ ساتھ اریبہ کو بھی گھورا۔ ''تمہاری زبان بھی اب بہت نکل آئی ہے دیکھ رہی ہوں۔ میں بہن ہے بڑی، لحاظ کر لیا کرو۔ جاؤ جا کر ہانڈی دیکھو۔ بیچ بیچ میں ہانڈی جلا نہ ڈالنا۔'' امی نے اسے جان کر کمرے سے نکال دیا۔

ارسلہ ایک سانس کھینچ کر تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

''آرام کر لو۔ پھر مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ نیلو کو بھی کہلوایا تھا مگر اس کی بڑی نند آگئی ہے وہ آ نہیں سکے گی۔ وہ آجاتی تو مل کر صلاح مشورہ ہو جاتا، چلو خیر ہے۔''

''اماں! صلاح و مشورہ تو اس وقت کرنا تھا جب عقیلہ خالہ نے بات کی تھی اب تو آپ نے اریبہ کو اس کھائی میں دھکا دینے کا پکا ارادہ باندھ ہی لیا ہے تو صلاح مشورہ کیسا۔''

''ہائے ہائے۔ یہ کھائی میں دھکے سے کیا مقصد ہے تمہارا۔ زبان کو ذرا سنبھال کر بات کیا کرو ارسلہ۔''

امی کو اس کا یہ جملہ بہت ہی برا لگا، وہ مسہری سے اٹھ گئیں۔ "ماشاء اللہ سے عقیلہ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے اور پھر کوئی نندوں کا جنجال نہیں، سکندر اکلوتا بیٹا ہے اور بیٹے سے بڑھ کر ہے میرے لیے تو۔ انکار کرنے کا کوئی معقول جواز بھی تو ہو۔"

امی کی اس لمبی تقریر کے جواب میں وہ استہزائیہ ہنسی پھر اپنی کلائیوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

امی اس پر ایک جھلسی نظر ڈال کر کمرے سے نکل گئیں۔

رات کھانا کھانے کے بعد گھر جاتے جاتے وہ اریبہ کے پاس چلی آئی۔ وہ اپنی کتابوں کو شیلف میں قرینے سے ترتیب دے رہی تھی۔

"چلو، سکندر اعظم نے کچھ تو فتح کر ہی لیا۔ چاہے تم ہی سہی۔ سنو۔ یہ بتاؤ، تم خوش ہو۔" وہ اس کے کندھے کو تھپک کر اس کی طرف جھکی۔ "سچ سچ بتانا۔"

اریبہ نے ذرا سی گردن اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

"بالکل سچ، بہت خوش ہوں۔"

"اور سکندر......؟"

"وہ بھی۔"

"اچھا۔" وہ حیرت کے اظہار کے طور پر ابرو کو جنبش دے کر ہنس پڑی۔ "یہ اس نے خود تم سے کہا ہے کہ وہ خوش ہے۔"

"آپی! آپ کا مقصد کیا ہے آخر ان سوال و جواب سے؟" وہ چڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

"ویری سمپل ڈارلنگ، کہ تم دونوں کی خوشی دیکھنا چاہتی ہوں۔ کوئی غم زدہ رہے، مجھے برداشت نہیں ہوتا۔" بظاہر ہنستے ہوئے اس نے پیار سے پکارا مگر اس کی اس پکار میں کہیں بھی خلوص نہیں جھلک رہا تھا بلکہ افسوس دکھائی دے رہا تھا۔

اریبہ چپ رہی۔ تب وہ کچھ سوچ کر اس کے نزدیک چلی آئی۔

"ارے پگلی، تمہارا تو مجھے پتا ہے کہ تم اس ہیرو پر مرمٹی ہو۔ عمر ہی ایسی ہے نئی نئی بیل بڑھتی ہے تو نزدیک کی دیوار سے ہی لپٹتی ہے۔"

اریبہ کو اپنی پیشانی یکدم جلتی محسوس ہونے لگی۔ جیسے ارسلہ نے اس پر کوئی انگارہ رکھ دیا ہو۔ وہ نظروں کا رخ موڑ گئی۔

"مسئلہ سارا سکندر کا ہے۔ اس نے خالہ کی خاطر اگر رضا مندی دی ہے تو سوچ لینا سمجھوتا کرنا پڑے گا عمر بھر......اور سمجھوتے کا مطلب تمہیں ابھی پتا نہیں ہے اگر کہو تو سمجھا دوں۔"

"آپی! برا مت مانیے گا۔ یہ میرا پرسنل میٹر ہے اور میں نہیں چاہتی کہ آپ مداخلت کریں۔" اریبہ سے رہا نہ گیا وہ اعتماد سے کہہ گئی۔

ارسلہ نے چونک کر دیکھا اسے اچھا خاصا حیرت کا جھٹکا لگا تھا تاہم اس کے تیکھے چتون دیکھ کر مزید گل افشانی کا ارادہ ترک کر دیا بلکہ قدرے کھسیانی سی ہو کر ہنس دی۔

"ارے گڑیا! تم تو برا مان گئیں۔ بھئی بہن ہوں تمہاری، فکر ہے مجھے تمہاری۔ تمہیں بھی میں اپنے جیسی شہزادیوں والی زندگی جیتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ مگر تم نے خالہ کے گھر جانے کا کے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ مگر اب تمہیں سمجھانا تو میرا فرض بنتا ہے نا۔ پھر کہو گی بڑی بہن ہو کر اچھے برے کا بتایا نہیں......چلو بھئی بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ بڑا برا لگ رہا ہے تمہیں تو بھئی۔" وہ اریبہ کی دہکتی چپ کو محسوس

کر کے طیش میں آ گئی۔ ''مرد جیو میری بلا سے۔'' وہ بڑبڑاتی کمرے سے نکل گئی۔
اریبہ نے شکر کا سانس کھینچا۔ ''خدا آپی کو ہدایت دے۔''
وہ دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔ مگر پھر دل نہ لگا اس نے ساری کتابیں ایک طرف ڈال دیں اور جا کر مسہری پر لیٹ گئی۔ خدا ارسلہ جیسی آپی تو کسی کو بھی نہ دے۔ وہ عجیب بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ لفظ کھوتا کسی پھانس کی طرح دل میں کھب گیا تھا۔

☆☆☆

''کبوتر کی طرح آنکھ بند کر لینے سے بلی چلی نہیں جاتی۔ مسائل سے نظریں چرا لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ انہیں فیس کرنا پڑتا ہے الجھی ڈوریوں کو سلجھانا پڑتا ہے۔''
صبا آج ضبط نہ کر سکی تھی اور اس سے الجھ پڑی۔ وہ کئی دن صبا سے خفا رہی تھی جب اسے اس بات کا علم ہوا تھا کہ آبص کو اس کا موبائل نمبر اور ایڈریس صبا نے ہی دیا ہے اور یہ کہ وہ دس منٹ بیٹھ کر اس سے بہت سی باتیں کر کے اور سن کر آئی ہے۔
''الجھی ڈوریاں۔ اب سلجھنے والی نہیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ انہیں کاٹ دیا جائے اور کٹ تو خیر خود ہی گئی ہیں اب جوڑنے کی کوشش احمقانہ بات ہو گی۔'' وہ صبا کی بات پر بگڑ کر بولی۔
''جوڑنے کی کوشش کون احمق کر رہا ہے میں تو فقط چاہتی ہوں کہ جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں، جو ان کہی رہ گئی تھی وہ کہہ دی جائے۔''
''فائدہ!'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔
''فائدہ یا نقصان کی بات نہیں ہے یہ ضروری ہے غلط فہمی کو دور کرنا۔ اس کی ماں کی ساری کارستانیاں اسے بتاؤ تاکہ تمہاری بے وفائی کا اسے جو شک ہے وہ دور ہو جائے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی ماں کتنی سازشی عورت ہے۔'' صبا نے اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے چھین کر لکڑی کے بینچ پر پٹخ دیا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ پھر بے بسی سے صبا کو دیکھنے لگی۔
''بتانا ہوتا تو اسی دن بتا دیتی۔ اب کیا فائدہ۔''
''پھر فائدہ...... خدا کے لیے نادیہ، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو...... اچھا بیٹھو تو سہی۔'' صبا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر بینچ پر پٹخ دیا۔ ''وہ عورت ایک مکار اور سازشی عورت ہے۔ آبص کی زندگی کو برباد کرنے والی یہی عورت ہے۔''
''آبص کی نہیں میری۔'' وہ اس کا جملہ کاٹتے ہوئے ملال سے بولی۔
''اس کی زندگی میں کوئی کمی کوئی خلا نہیں ہے، وہ ایک مکمل زندگی گزار رہا ہے۔''
''یہ اس سے ملنے کے بعد ہی پتا چل سکتا ہے۔'' صبا ہنسی۔
''مطلب۔''
''کچھ نہیں، بس اس سے مل کر یہ بتا دو کہ تم بے وفا نہیں تھیں۔ تم نے اسے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ پیچھے تم نہیں ہٹی تھیں، ہٹایا گیا تھا۔''
وہ خالی خالی نظروں سے صبا کو دیکھنے لگی۔ یکدم اس کے ذہن میں کوئی گرہ سی کھلی تھی کوئی گتھی سی سلجھی تھی۔
''ہوں۔'' اس نے ہلکے سے ہنکارا بھر کر بینچ کی کھردری سطح سے ٹیک لگالی۔
''اگر مجھے ایک بار پھر اس سے محبت ہو گئی پھر۔'' اس کی نگاہیں فرش پر جمی تھیں اور آواز مرتعش سی تھی۔ صبا نے اسے چونک کر دیکھا۔ دوسرے پل ہلکی سانس کھینچ کر سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں، میرا خیال ہے اس سے مل لو گی تو یہ جو دل میں وحشت کا صحرا لیے لیے پھرتی ہو یہ دم توڑ دے گا۔ بے قراری کو قرار آجائے گا۔ سارا لاوا بہا دو گی تو پرسکون ہو جاؤ گی۔"

وہ چپ تھی، اس کے ذہن میں سوچیں مکڑی کی طرح جال بن رہی تھیں۔ صبا اپنی کہے جا رہی تھی مگر وہ اپنے دل اور دماغ کی جنگ سے نبرد آزما تھی۔ یکدم اس نے جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اوکے۔ میں اس سے ضرور ملوں گی۔ تم سچ کہتی ہو۔ ہمارے درمیان بہت سی ان کہی باتیں ہیں جواب کہہ دینی چاہئیں شاید اس طرح قرار آجائے، میں سکون پا لوں۔" وہ یہ کہہ کر مسکرانے لگی۔ صبا بھی کھل اٹھی۔

"گڈ یہ ہوئی نا بات...... پکڑو۔" صبا نے اس کا بیگ اٹھا کر اس کی گود میں پھینکا۔"اب فٹافٹ پکوڑے کھلا دو مجھے۔ پیاز والے اور آلو کے۔" صبا بھی کپڑے جھاڑتی بینچ سے کھڑی ہو گئی۔

"جناب اس کے لیے تمہیں گھر آنا پڑے گا۔ امی ہی یہ خواہش پوری کر سکتی ہیں تمہاری۔"

"ہاں تم تو ہو ہی نکمی۔" صبا نے اسے گھورا۔

"چٹنی تو بنا ہی لوں گی۔" وہ چھیڑنے لگی۔ پھر دونوں ہنسنے لگیں۔ اس کے کھو کھلے اور اونچے قہقہے صبا کو اچھے لگ رہے تھے۔ یہی بہت تھا وہ آبص سے ملنے پر راضی تھی۔

صبا رکشا کو ہاتھ دے کر اٹھ چکی تھی۔

☆☆☆

سحر بن کے آنکھیں کھلیں تو حقیقت کا پورا سبق داستاں ہو گیا
یہ کیا ہے، محبت میں اک شخص کی اپنا سفر رائگاں ہو گیا
بساط ہنر سے جنون طلب تک، میں ٹوٹا ہوں کیسے، تمہیں کیا خبر
میں دل کی حدوں سے جو آگے گیا تو، میرے ساتھ گم اک جہاں ہو گیا

"کیا بات ہے حمزہ! تم جب سے پاکستان سے لوٹے ہو بہت چپ چپ رہنے لگے ہو۔ بہت سنجیدہ ہو گئے ہو۔ کوئی بات ہے کیا مجھے نہیں بتاؤ گے۔" صبیحہ اسے کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھیں اسے اتنے اچھے موسم میں اتنا پژمردہ کھڑکی کے پاس سگریٹ پیتے دیکھ کر چلی آئیں اور اس کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اس کے بالوں پر جھک کر بوسہ دیا۔

امی کو دیکھ کر وہ بوکھلا سا گیا اور جلدی سے سگریٹ بجھا کر کھڑکی سے باہر اچھال دی۔

"تمہیں اس طرح کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔ اتنا چپ چپ نہیں دیکھا۔ فکر ہونے لگی ہے تمہاری۔"

"شاید پاکستان میں رہ کر سگریٹ زیادہ پینے لگا تھا۔ بس یہی عادت پڑ گئی ہے سوری، آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے ان کے ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے ہاتھوں میں تھام لیے۔"کوشش کروں گا۔ یہ عادت ہی ترک کر دوں۔"

"میں پوچھ رہی ہوں۔ کیا پریشانی ہے تمہیں۔" "سگریٹ تو تم چھوڑو گے تب چھوڑو گے۔ ہنسنا بولنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔" وہ اس کے انداز پر محبت سے مسکرا دیں پھر اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔"نادیہ کا شادی سے بار بار ٹال مٹول کرنا مجھے بھی متفکر کر رہا ہے۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کیا وہ اس رشتے سے ناخوش ہے یا جدہ آنے سے خوف زدہ ہے۔ شاید یہی بات ہو گی۔ اپنی امی کو چھوڑنے کا خوف ہو گا، ان کے اکیلے پن کا سوچ رہی ہو گی ہے نا...... تمہارا کیا خیال ہے......؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں امی۔ غیب کا علم تو ہے نہیں میرے پاس۔"

"اوہو! ایک اندازہ تو لگا سکتے ہو۔ قیاس کر رہی ہوں میں بھی۔ مجھے تو بس یہی ایک وجہ نظر آ رہی

ہے۔" صبیحہ پر خیال انداز میں بولیں مگر اسے دلچسپی نہ لیتے دیکھ کر کرسی اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔
"چلو چھوڑو۔ چائے بنالی ہے میں نے لاؤنج میں آ جاؤ وہیں بیٹھ کر پیتے ہیں۔" "اور ہاں، پریشان بالکل بھی مت ہونا۔ ان ماں بیٹی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں حساس ہیں زیادہ، گھبرا جلدی جاتی ہیں۔ مگر دل کی بے حد صاف ہیں۔" صبیحہ اسے تھپک کر کمرے سے نکل گئیں۔
تعلق دل سے جڑا ہو تو ایک کج ادائی کا ہلکا سا چھینٹا بھی آگ بن کر دل کو جھلسا جاتا ہے۔ یہاں تو تعلق ہی نہ تھا اور دل کے تعلق کا تو سوال ہی نہ تھا۔ بس دھوکا ہوا تھا۔ بہت آگے جا کر معلوم ہوا کہ جسے ٹھنڈا میٹھا چشمہ سمجھ کر سفر طے کرتے آئے، نزدیک آنے پر وہ سراب نکلا...... اور قصور تو آنکھوں کا تھا، دل کا تھا دماغ کا تھا اس نے کرسی کی بیک سے سر ٹکالیا اور دیوار پر نظریں جمادیں۔
"آ جاؤ حمزہ۔ چائے ٹھنڈے ہو رہی ہے۔" صبیحہ کی آواز پر وہ بے دلی سے کرسی سے اٹھ گیا۔
"میں آج ہی فون کر کے عظیمہ سے بات کرتی ہوں۔ کہ اب فٹافٹ نکاح اور رخصتی کر دے۔ میرا بیٹا بہت اداس رہنے لگا ہے جب سے پاکستان سے آیا ہے۔" صبیحہ نے کہا تو وہ چونکا۔
"نہیں آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گی عظیمہ آنٹی کو ابھی۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔ پلیٹ میں نمکو ڈالتے ہوئے صبیحہ نے اسے دیکھا۔
"ارے کیوں بھئی...... کیوں نہ کروں۔"
"امی...... میں چاہتا ہوں کہ ہم گھر تھوڑا بڑا لے لیں۔ آنٹی کو بھی یہیں بلوالیں گے۔ اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔ یوں بھی وہ اکیلے وہاں کیا کریں گی۔"
"آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ اور تمہاری نیک نیتی اور محبت اخلاص اور بھی اچھا لگا۔ مگر یہ سب کرنے کے لیے ہمیں سال بھر کی ضرورت تو نہیں ہے چند مہینوں میں بھی ہو سکتی ہے۔"
"کم آن ماما...... میں انکار نہیں کر رہا ہوں بس وقت مانگ رہا ہوں۔"
"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ مگر اتنا بھی وقت نہیں دوں گی کہ بڈھے ہو جاؤ۔" صبیحہ یہ کہہ کر ہنس پڑیں۔ پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔
"سچ تو یہ ہے کہ تم دونوں کی ہی مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی وہ وقت مانگتی ہے کبھی تم۔ مگر کہے دیتی ہوں اب کی بار پاکستان گئی تو بنا بہو کے جدہ لوٹ کر نہیں آؤں گی۔ یہ وعدہ کرنا پڑے گا تمہیں۔"
"اوکے...... اوکے۔" وہ ہنس دیا اور نمکو اٹھا کر کھانے لگا۔

☆☆☆

کتنی دیر تک تو وہ خود کو یقین دلاتا رہا کہ نادیہ شاہ اس کے سامنے بیٹھی ہے یہ ایک درمیانے درجے کا ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ نادیہ کے بتانے پر پہنچا تھا اور اس کے آنے سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے وہ یہاں پر پہنچ کر اس کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا تھا۔ کئی بار تو اسے لگا وہ نہیں آئے گی محض اس کی بے قراریوں کو آزمانا چاہ رہی ہے یا پھر اسے اذیت دینا چاہتی ہے۔ مگر جونہی وہ اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی اس کی بے قراریاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ وہ وارفتانہ اس کی طرف لپکا مگر اس کے سرد سرد بے مہر رویے نے اس کی ساری گرم جوشی یوں بجھا دی جیسے کوئی دیا یکدم تیز ہوا کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ ایک زوردار جھونکے سے بجھ کر رہ گیا ہو۔ وہ تو اسے دیکھ کر اپنی تڑپ دکھانا چاہ رہا تھا اس سے شکوہ کرنا چاہ رہا تھا۔
دونوں کے درمیان ایک طویل خاموشی حائل تھی۔ بالآخر اس خاموشی کو آبص نے ہی توڑا۔
"مجھے صبا نے بتایا ہے کہ تم نے شادی نہیں کی ہے اب تک؟"

"ہوں۔" وہ ہلکی سانس بھرتے ہوئے جوس کا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ "اور مجھے صبا نے ہی بتایا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ میں نے دیکھا تمہاری بیوی کو، وہ بہت حسین ہے۔ بالکل ویسی ہی جیسا تمہاری ماں تمہارے لیے لانا چاہتی تھیں۔ اور شاید تم جو ڈیز رو کرتے تھے۔"

"ڈیز رو...... خوب۔" وہ ابرو اچکا کر یوں ہنسا جیسے خود پر ہنس رہا ہو۔ جانے یہ فیصلے انسان کیوں کرتے ہیں بلکہ کر ہی نہیں سکتے کہ کون کیا ڈیز رو کرتا ہے۔ یہ تو صرف اس کا رب جانتا ہے کہ وہ کیا ڈیز رو کرتا ہے۔ فیصلے اسی کے ہوتے ہیں۔ جوڑے وہی بناتا ہے۔"

اس کے انداز میں چھلکتی تلخی محسوس کرتے ہوئے نادیہ شاہ نے خاصے استہزائیہ انداز میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

"تو اب تم بھی ان ٹپیکل مردوں کی طرح اپنی ازدواجی زندگی کی غمزدگی کے قصے سنانے لگ جاؤ گے اور انہی مردوں کی طرح جو اپنی گرل فرینڈ کا دل جیتنے کے لیے اپنی بیوی کے مظالم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ سچ کہوں آبص مجھے اب بالکل بھی دلچسپی نہیں رہی اس بات سے کہ تمہاری ازدواجی زندگی خوشگوار ہے یا ناخوشگوار۔"

ایک زوردار دھچکا جو سید حادل پر لگا تھا۔ آبص خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی ہمت کے قدم لحظہ بھر لڑکھڑا سے گئے تھے۔ وہ پہلے والی نادیہ شاہ تو بالکل دکھائی نہ دے رہی تھی۔ لفظ لفظ سنبھل کر بولنے والی۔ کسی کی دل آزاری کے خوف سے بہت کم مذاق کرنے والی۔ درگزر کرنے والی۔ بس اس کی باتوں پر مسکراتے رہنے والی۔ وہ تو ایک سلگتی لکڑی دکھائی دے رہی تھی جو چھوتے ہی دھواں دینے لگے۔

"سوری۔ حالات نے میرے سوچنے اور بولنے کا انداز بدل دیا ہے تمہیں شاید اسی بات پر حیرانی ہو رہی ہو گی۔" وہ اس کے چہرے کے تاثرات جان کر یکدم ہنسی۔ "معذرت کے ساتھ میں اب وہ نادیہ شاہ نہیں ہوں جو تمہیں دو سال پہلے ملی تھی۔"

وہ چپ رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"یہ بتاؤ تم نے شادی نہیں کی تو پھر راستہ کیوں بدل لیا۔ چھپ کیوں گئیں مجھ سے۔ میں پاکستان لوٹا تو تم مجھے نہیں ملیں۔ اپنا کانٹیکٹ نمبر، اپنا گھر سب کچھ بدل دیا کیوں؟"

"پہلے یہ سوال پوچھو خود سے کہ میرے نکاح کی جھوٹی خبر تمہیں کس نے اور کیوں دی؟" وہ ترشی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

وہ دم بخود رہ گیا۔

"یہ سوال تمہارے ذہن میں آنا چاہیے سب سے پہلے، باقی ساری باتیں بے معنی ہیں۔ آخر میرے نکاح کی جھوٹی خبر دے کر کیا مقصد حاصل کرنا تھا۔"

"مگر...... یہ خبر تو مجھے مام نے...... اوف...... اوہ مائی گاڈ۔" آبص جیسے کسی خیال کے تحت بولتے بولتے رکا۔ اس کا دل لرز سا گیا۔ اس کے ذہن میں اس کی ماں مہوش جیلانی کا رونا تڑپنا اور اسے یہ اندوہناک خبر دینا۔ پھر اسے بہلانا سب کچھ نگاہوں تلے گھومنے لگا۔ اس کی ماں نے اس سے یہی تو کہا تھا۔

"میں وہاں پہنچی آبص۔ گڑگڑائی۔ مگر ان ماں بیٹی نے آنکھیں ہی پھیر لی ہیں، جیسے تمہیں جانتیں تک نہیں۔ اس کے نکاح کی رسم ہونے والی تھی رات کو۔ وہ کسی اور سے منسوب ہونے جا رہی تھی۔ میں نے اپنا آنچل اس لڑکی کے قدموں میں رکھ دیا۔ واسطہ دیا آبص کہ یہ بے وفائی اور ظلم نہ کرے۔ مگر وہ لڑکی تو محض تمہارے ساتھ محض وقت گزار رہی تھی۔ وہ تو بچپن سے ہی منسوب تھی اپنے کزن سے۔ دھوکا دے رہی تھی تمہیں۔ تمہارے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ میرے بچے میرے بیٹے میں تمہاری خوشی کی خاطر اپنی انا اپنی پسند

سب قربان کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ اسے جیلانی ہاؤس کی بہو بنا کر لانا چاہتی تھی مگر...... مگر کیا خبر تھی کہ وہ چیٹر نکلے گی۔"

آبص کو لگا اس کے اعصاب شکستہ ہونے لگے ہوں وہ بے دم سا ہو رہا۔

"مام اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتی ہیں...... اپنے بیٹے کے جذبات کا قتل کیسے کر سکتی ہیں۔" وہ حیرت سے نکل کر تاسف اور آزردگی کی لپیٹ میں تھا۔

"صرف ایک جھوٹ ہی بولا ہوتا تو شاید میں تم سے رابطہ نہ توڑتی۔ مگر انہوں نے تو مجھے اور میری ماں کو زندہ درگور ہی کر دیا آبص۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں یہ ساری باتیں تمہیں بتا کر تمہاری ماں سے تمہیں بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تمہیں تمہاری ماں کی چھاؤں میں دے کر خود تپتی دھوپ اوڑھ لی۔ میں ایک ناپسندیدہ بہو اور بے غیرت عورت بن کر اس کوٹھی میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ میری روح کے زخم اتنے گہرے ہیں آبص کہ اب شاید ہی ان پر مرہم آئے۔" وہ کرب کی اتھاہ میں ڈوبی ماتم کناں نظروں سے آبص کی طرف دیکھنے لگی۔ "محبت میں اک میں اکیلی دھوکا کھاتی تو شاید سنبھل جاتی۔ مگر یہاں تو اپنی ماں کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائی۔ ان کی غیرت اور عزت کو میری وجہ سے پامال ہوتے دیکھنا محبت کے چھوٹ جانے کے غم سے کہیں بڑا تھا۔"

وہ شل اعصاب کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی گردن احساس ندامت سے جھک گئی تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار جیب سے سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگا۔ پھر سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے اس نے بے ساختہ نادیہ شاہ کی طرف دیکھا۔ دوسرے پل اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ نکالی ہوئی سگریٹ مروڑ کر پھینک دی اور کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ بھی اسے اٹھتے دیکھ کر اٹھی۔ والٹ سے پیسے نکال کر ویٹر کو دیتے ہوئے وہ پلٹنے لگا۔

"میں تمہیں کبھی نہ بتاتی۔ یونہی چھپی رہتی تم سے۔ مگر تقدیر کے کمان سے نکلا یہ تیر بھی شاید تمہاری اور میری تقدیر میں لکھا تھا۔ تم مجھ سے نہ ملتے تو شاید یونہی سکھی رہتے۔" وہ اس کے ہمراہ چلنے لگی آبص کا ہاتھ اپنی اسٹک پر مضبوطی سے جم گیا۔ ایک افسردہ سی سانس بھرتے ہوئے ذرا سی دیر رکا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ اسٹک تمہاری کمزوری کیوں بنی۔ کوئی حادثہ یا کوئی بیماری کی وجہ سے۔" وہ پلٹا پھر نظریں چرا گیا۔

"روڈ ایکسڈنٹ ہوا تھا۔ جاپان سے لوٹا تو یہ خبر بجلی کی طرح گری کہ تم کسی اور کی بن چکی ہو۔ بہت اپ سیٹ رہا۔ اینی ویز......!" وہ اس کی چہرے پر پھیلنے والی افسردگی پر دھیرے سے مسکرا دیا۔ "یہ تو میرے لیے بہت چھوٹی سی سزا ہے۔ تمہیں ڈراپ کر دوں۔" وہ کہتا ہوا ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ حیرت اور دکھ کے احساس سے کچھ دیر کھڑی رہی پھر بوجھل قدموں سے اس کے پیچھے ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

وہ منتشر اعصاب کے ساتھ گاڑی میں اس کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ نادیہ شاہ کی باتوں نے اس کا دماغ یکسر ماؤف کر دیا تھا۔ وہ کسی مجرموں کی طرح اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ ملاقات کی ساری گرم جوشی جھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھی۔ سارے شکوے شکایات بے معنی ہو کر رہ گئے تھے وہ بھی افسردہ سی سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

☆☆☆

محبتیں جب شمار کرنا تو سازشیں بھی شمار کرنا
جو میرے حصے میں آئی ہیں وہ اذیتیں بھی شمار کرنا
تم اپنی مجبوریوں کے قصے ضرور لکھنا وضاحتوں سے

جو میری آنکھوں میں جل بجھی ہیں وہ خواہشیں بھی شمار کرنا

وہ کھڑکی کھول کر باہر صحن کے اندھیرے کو گھورتے ہوئے آج کے واقعہ کا سوچ رہی تھی آبص سے ملاقات اس کی وحشت کو بڑھا گئی تھی۔ وہ اندر کا لاوا بہا تو آئی تھی مگر لگ رہا تھا بہت کچھ نئے سرے سے کھو کر آئی ہے۔ بوجھ اتار کر نیا بوجھ کندھوں پر لاد آئی ہو۔ مگر میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔ آبص سے جب واسطہ نہیں رہا تو پھر مجھے بتا دینا چاہیے تھا کہ اس کی ماں نے محض اپنی انا کی خاطر اس کے بیٹے کے جذبات کا قتل کیا ہے۔ آخر میں اس عورت کا پردہ کیوں رکھتی آئی تھی اب تک...... جس نے مجھے اور میری ماں کی عزت کو پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ وہ تو صرف پیار سے بھی کہتیں کہ ان کے بیٹے کی زندگی سے نکل جاؤ تو نکل جاتی۔ نادیہ شاہ محبت کو پانچسو بار عزت پر قربان کر سکتی ہے۔

مہوش جیلانی کا متکبر وجود اس کی آنکھوں کی سطح پر یوں چبھنے لگا جیسے ریت سی پڑ گئی ہو۔ ہر منظر پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو کر اذیت دینے لگا تھا۔

مہوش جیلانی نادیہ شاہ کے چھوٹے سے آنگن میں اپنے ملازم کے اور گارڈ کے ہمراہ داخل ہوئی تھیں۔ غرور سے اس کے گھر کو، اس کے رہن سہن کو، اس کی غربت کو نشانہ بناتی رہیں۔ آبص نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں اس سے ملنے آ رہی ہیں۔ اور اس نے آبص کو نہیں بتایا کہ اس کی ماں ان کی عزت کو تار تار کرنے آئی ہیں۔

"عموماً آپ جیسی عورتیں دیکھنے میں سادہ اور معصوم نظر آتی ہیں مگر اندر سے بہت شاطر اور چالاک ہوتی ہیں، بیٹیوں کو کیش کرانا خوب جانتی ہیں۔ ذرا بتایے کتنی قیمت لگاؤں آپ کی اس ذہین بیٹی کی؟ آبص کے سر کا صدقہ سمجھ کر جو مانگیں گی دوں گی۔"

"میری بیٹی بہت انمول ہے بیگم جیلانی اپنے بیٹے کی قیمت لگایے جا کر۔" امی کا لرزیدہ وجود آتش فشاں کی طرح پھٹ گیا۔

"اوہ...... ان...... مول۔ تو پھر یوں بے مول رل کیوں رہی ہے کسی غیر لڑکے کے آگے۔ خوب جانتی ہوں، ایسی کھوکھلی خودداری کو۔" انہوں نے حقارت سے ہنس کر پرس کھولتے ہوئے چیک بک نکالی۔

"جلدی سے بتاؤ کتنی رقم لکھوں۔" انہوں نے نادیہ شاہ کو دیکھا جو کھڑے ہی جیسے زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔

"آپ نکل جایے براہ مہربانی۔ ہمیں آپ کی رقم کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت تو خیر ہے، آپ کو نہ سہی آپ کی اس انمول بیٹی کو جس نے اپنی آنکھوں میں اپنی اوقات سے بڑے خواب سجا لیے ہیں۔ آبص بے وقوف اور نادان ہے مگر میں تہیں ہوں۔"

نادیہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر گم صم کھڑی تھی۔

"ہاں بولو لڑکی۔ کیا لو گی آبص سے دور جانے کا...... اس کی زندگی سے نکل جانے کا۔"

"خدا کے لیے نکل جایے آپ یہاں سے، آپ کو آپ کی دولت مبارک۔" امی چلائیں۔ پھر بت بنی نادیہ کو زور سے ہلا کر اس سے بھی زیادہ زور سے چلائیں "نادیہ ان سے کہہ دو کہ تمہارا آبص سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نکل جائیں یہاں سے۔"

وہ تو اپنا ذہنی اعصابی توازن کھو رہی تھی۔ ذلت کے احساس سے بے دم ہو رہی تھی۔ الفاظ تو دور کی بات اسے تو اپنی سانسیں بھی رکتی محسوس ہو رہی تھیں جیسے ابھی بند ہو جائیں گی۔

"میرا خیال ہے آپ کی بیٹی آپ کی بات نہیں سمجھ رہی۔ میری طرف سے اسے اچھی طرح سمجھا دیجیے گا کہ اگر اس نے کسی طرح کا رابطہ رکھنے کی کوشش کی آبص سے تو اس کی عزت کی ذمہ داری ہماری نہیں ہوگی۔ خود ہوگی

وہ اپنی تباہی کی ذمہ دار۔" وہ سفاکانہ وار کرتے نادیہ کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنسیں۔ "لڑکی، دو منٹ لگیں گے تمہیں غائب ہونے میں اور یہاں تو بھیڑیے منہ کھولے کھڑے ہیں بس اشارہ ملنے کی دیر ہے۔"

"شٹ اپ...... اینڈ گیٹ آؤٹ، اس سے پہلے کہ خدا کا قہر آپ پر یہیں نازل ہو جائے۔ دفع ہو جائیں یہاں سے۔" امی لرزتی نادیہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر وحشت سے چیخیں۔

"اوکے۔" مہوش جیلانی نے چیک بک پرس ہی میں ڈال کر پرس کندھے پر لٹکاتے ہوئے اپنے ساتھ آئے گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ "بیس تاریخ سے ایک دن پہلے یعنی ٹھیک انیس تاریخ کو تم آ کر چیک کرو گے اس گھر کے دروازے پر تالا نظر آنا چاہیے تمہیں۔ اور ہاں شرافت خان تم بھی گھر ڈھونڈنے میں تھوڑی مدد کر دینا۔ میں چاہتی ہوں آبص کے آنے سے پہلے پہلے ان ماں بیٹی کا نام و نشان بھی نہ ملے۔ عزت کے ساتھ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں آبص ڈھونڈ نہ پائے۔"

وہ ساڑھی کا پلو کندھے پر پھیلاتے ہوئے گھر سے جونہی نکلیں امی نے وحشت زدہ سی ہو کر بھاگ کر دروازے کی چٹخنی لگا دی اور اپنی سانسیں بحال کرنے لگیں۔

"مر کیوں نہ گئی۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے۔ میرے خدا! اس ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر تھی۔" امی فرش پر بیٹھی کر رونے لگی تھیں۔ ان کی کرب ناک آہیں سسکیاں ان کا شکستہ وجود نادیہ شاہ کی روح پر کوڑے کی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کوئی طوفان آیا ہو اور سب کچھ بہا کر لے گیا ہو۔ اس کی خوشیاں...... اس کی ساری خوش فہمیاں ہوں وہ ساری توانائیاں۔ وہ سارے جذبے جو زندہ رکھتے ہیں۔

آہ کوئی یوں بھی مرتا ہے نادیہ شاہ کہ جنازہ بھی نہیں اٹھتا۔

وہ آہستہ سے اٹھی اور دیوار کا سہارا لے کر واش بیسن کے پاس آئی اور ٹھنڈا پانی جلتے چہرے پر کتنی دیر ڈالتی رہی مگر اندر کی آگ تو جیسے اور بھی بھڑک رہی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ماں کے پاس جا کر ان کے کندھے پر سر رکھتی ان سے نظریں ملا پاتی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں چلی گئی۔ لگ رہا تھا پور پور زخمی ہو۔ ہر رگ سے خون رس رہا ہو۔ سلگتا ہوا خون۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

آبص جیلانی وہ میری شکست کے آخری آنسو تھے۔ جو میں نے پھر کبھی نہ رونے کے لیے بہا دیے تھے اور دیکھو آج تک پھر تمہارے لیے آنسو نہیں بہائے، ایسا پتھر دل کر لیا ہے کہ اب ٹوٹتا بھی نہیں ہے۔ وہ کھڑکی کا پٹ بند کر کے مسہری پر آ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

اس نے سگریٹ کیس سے آخری سگریٹ اٹھا کر لبوں سے لگائی اور اسے لائٹر کا شعلہ دکھا دیا۔ اکبر جیلانی کمرے میں داخل ہوئے تو پورا کمرہ دھوئیں سے حبس زدہ ہو رہا تھا آبص آفس چیئر پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئے۔

"تم ابھی تک یہیں ہو۔ اور یہ کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" انہوں نے اندر آ کر کھڑکیوں سے بلائنڈر

کھینچے اور کانچ کی چمک دار سلائڈ کھول کر کھلی ہوا کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
''میں تم سے پوچھ رہا ہوں آبص۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ اینی پرابلم۔'' انہوں نے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے کو دیکھا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایش ٹرے میں بجھادی کیا نیا ہو گیا۔ ارسلہ نے کچھ کر دیا پا......''
ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے اپنے سامنے رکھا پیپر ویٹ ہاتھ مار کر غصے سے ٹیبل سے اچھال دیا۔
''ارسلہ......ارسلہ......ارسلہ سے بڑھ کر بھی تکلیف دہ باتیں ہیں اور بھی۔ یہ تو اب معمولی اذیت معلوم ہونے لگی ہے۔''
''آبص۔'' اکبر جیلانی حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ اتنا غصیلا اور اتنا بدلحاظ تو ہر گز نہ تھا۔ ''مائی گاڈ! تم ٹینس ہو اور میں بے خبر ہوں۔ کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ۔'' انہوں نے گھبرا کر اسے تھاما۔
''پاپا...... میں ایک بار پھر ہار گیا۔ میں ٹوٹ گیا پاپا۔'' مجھے میرے اپنوں نے ہی مار ڈالا'' اس نے ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اکبر جیلانی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بچوں کی طرح دھاڑے مار مار کر رونے لگے۔
''مجھے بتاؤ آبص۔ کیا ہو گیا ہے مائی سن۔ کیا تکلیف ہے۔ پلیز۔ مجھے سب بتاؤ۔ دیکھو مجھ سے کچھ مت چھپانا۔'' وہ یکدم پریشانی کے عالم میں اسے خود سے لپٹانے لگے۔ اس کا کندھا تھپکنے لگے۔ ''تمہیں تو خوش دیکھنے کی آس میں جی رہا ہوں۔ یہ تم اتنے ٹوٹے اور بکھرے کیوں ہو۔ کس نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر محبت سے بولے۔
''آج لگ رہا ہے ایسا کہ میں بالکل تہی دست ہو گیا ہوں۔ ہر خوشی اور ہر رشتے کا غرور ختم ہو چکا ہے۔ رشتوں سے اعتماد اٹھ گیا ہے پاپا۔ اپنی نظروں میں گر گیا ہوں پاپا۔ سب بکھر گیا۔ ایک ہلکی سی امید کا سہارے جی رہا تھا۔''
''ایسا مت کہو آبص۔ حوصلہ کرو مجھ پر ٹرسٹ کرو۔ مجھے بتاؤ۔'' وہ پیار سے اس کی پیشانی چومنے لگے۔ ''تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اس طرح بکھر جاؤ گے تو میں اور تمہاری مام کیسے زندہ رہیں گے۔ جانتے ہو نا مہوش تمہارے لیے کتنی فکر مند رہتی ہے۔''
''جھوٹ ہے پاپا۔'' وہ پرملال انداز میں ہنسا۔ ''ماما کو میری بالکل پروا نہیں۔ انہیں اپنی ذات، اپنی انا، اپنے اصولوں سے محبت ہے، قربان کر دیا انہوں نے مجھے اپنے تکبر میں۔ اپنی دولت کے نشے میں مجھے برباد کر دیا۔ یہ محبت نہیں اختیار کی جنگ ہے فقط اختیار کی جنگ۔ جس میں وہ جیت گئیں۔'' وہ دل گرفتگی سے بولا۔
''یہ کیا کہہ رہے ہو آبص۔ اپنی ماں کی محبت پر شک کر رہے ہو۔ وہ تمہارے لیے۔ بہت ڈپریسڈ رہتی ہے راتوں کو سوتی نہیں ہے، میڈیسن کے بغیر نیند نہیں آتی۔''
''مجھے اس حال میں پہنچانے والی خود مام ہیں پاپا۔ انہوں نے میرے جذبات کا قتل کر دیا۔ دولت اور اختیار کے غرور نے انہیں ماں کے درجے سے گرا دیا ہے پاپا۔''
''آبص یہ کیا کہہ رہے ہو تم...... پاگل ہو گئے ہو تم۔'' اکبر جیلانی حواس باختہ دکھائی دینے لگے۔ ''تم ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہو شاید، چلو میرے ساتھ گھر۔'' انہوں نے پیار سے اسے تھاما۔
''میں مکمل ہوش و حواس میں ہوں۔'' اس نے ان کی گرفت سے اپنا بازو دھیرے سے چھڑایا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ''اٹس ٹرو۔ ماما نے نادیہ کو مجھ سے چھینا ہے۔ چیٹ وہ نہیں تھی چیٹنگ ماما نے کی ہے مجھ سے۔ اس کا نکاح بھی نہیں ہوا تھا یہ جھوٹ ماما نے بولا۔ آپ سے بھی اور مجھ سے بھی حقیقت چھپائی۔ ماما نے اسے دھمکی دی

اس کی بے عزتی کی۔ اسے پریشرائز کیا کہ...... وہ گھر اور مجھے چھوڑ کر چلی جائے کہیں بھی۔ ادروائز......" وہ شدید تکلیف سے لب بھینچ گیا۔ "یہ پورا ایک پلان کے تحت کیا گیا۔ میرے آنے تک انہیں در بدر کر دیا۔ آئی سوئیر پاپا۔ وہ بے وفا نہیں تھی، اسے فقط سزا دی گئی۔ اور دوسرا سچ یہ ہے کہ وہ میرے پیچھے نہیں پڑی تھی میں اس کے پیچھے لگا تھا۔ میں نے ہی اس کے دل میں محبت کا بیج بویا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا اسے اس راہ پر میں...... میری ضد لے کر آئی تھی۔ یہ کیا کر دیا پاپا۔ مام نے یہ کیا کر دیا۔ اپنے بیٹے کو ہی برباد کر دیا۔" وہ دکھ سے کٹ رہا تھا اپنے لٹنے پر ماتم کر رہا تھا۔ اس لٹنے کو "تقدیر" کا فیصلہ سمجھ کر چپ تھا مگر آج آگاہی کا در کھلا تھا کہ یہ ستم تو اس کے اپنے سب سے زیادہ چاہنے والے نے توڑا تھا۔

اکبر جیلانی حیرت سے گنگ تھے۔ مہوش کی اس جھوٹی سچی کہانی پر تو انہوں نے بھی یقین کر لیا تھا۔

"اوہ میرے خدا...... یہ کیا کر ڈالا اس نے۔" انہوں تاسف جھرجھری لے کر آبص کو دیکھا۔ مجرم تو وہ بھی تھے اس کے۔ گناہ گار تو وہ بھی ہوئے تھے۔ مہوش کی ہر بات پر کیوں یقین کر لیا تھا انہوں نے بنا تحقیق۔ وہ گھر کے سربراہ تھے، انہیں تو خود اس سارے معاملے کو دیکھنا چاہیے تھا۔ کیسے سوچ کر بے خبر بیٹھ گئے کہ ان کا کام فقط پیسہ کمانا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ مرد تھے۔ ایک باپ تھے۔ گھر کے حکمران تھے انہیں ہر معاملے پر از خود نظر رکھنی چاہیے تھی۔ بیٹے کے جذبات سے آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس سارے معاملے سے پہلو تہی کی۔ مہوش پر سونپ کر بے فکر ہو گئے۔ ارسلہ جیسی لالچی بے حس لڑکی کو وہ آبص کی زندگی میں لے آئی وہ غافل رہے۔ آبص کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آتی گئیں۔ خوشی اس کی زندگی سے نکل گئی وہ غافل رہے۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگے۔ انہیں ہر جگہ اپنی ہی غلطی اور کوتاہی دکھائی دینے لگی۔

"خود کو کمپوز کرو آبص۔ اور دیکھو ارسلہ کو کچھ پتا نہ چلے یہی بہتر ہو گا۔ ہم یوں بھی کرائسس سے گزر رہے ہیں کسی نئے ایشو کو افورڈ نہیں کر سکتے ابھی۔" اکبر جیلانی ڈرائیونگ کرتے ہوئے اگلی سیٹ پر آنکھیں موندے آبص کو سمجھانا چاہا۔

"یہ ایشو نہیں ہے یہ زہر ہے۔ جو میری رگ رگ میں سرایت کر دیا گیا ہے۔ ارسلہ کو مام نے مری زندگی میں جبراً داخل کیا ہے۔" وہ پھٹ پڑا۔

"ایسا مت کہو آبص۔ تم اب باپ بننے والے ہو۔ اور وہ ماں۔" وہ جلدی سے بولے۔ وہ خوف زدہ سے ہو گئے تھے کہ وہ مہوش سے متنفر دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس سے کہیں زیادہ خوف اس بات کا وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس نے نادیہ شاہ کو تلاش کر لیا تھا۔ اس سے ملا تھا۔ اور اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تھا تو اس کا انجام بہت خوف ناک نکل سکتا تھا۔

"آبص جو ہو گیا اسے بھول جاؤ، ماضی کی قید سے نکل آؤ۔ پاسٹ کو چھوڑو اپنے فیوچر کا سوچو۔ تم عنقریب باپ بن جاؤ گے۔ ارسلہ جیسی بھی ہے وہ نادان احمق ہے مگر وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے موقع دو ایک اور موقع وہ یقیناً ماں بن کر بدل جائے گی۔" اکبر جیلانی کی اس بات پر اس کے لبوں استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ وہ نہیں بدلے گی۔ وہ اپنے اس مرتبے اور درجے کو بھی کیش کرانا چاہتی ہے۔" وہ فقط سوچ کر رہ گیا۔

اس کا رواں رواں نادیدہ آگ میں دہکنے لگا۔ اس نے نظریں ونڈ اسکرین پر کر لیں۔

گھر آ کر وہ اپنی خواب گاہ میں بند ہو گیا اور شکر ادا کیا ارسلہ میکے گئی تھی۔ اس سے الجھنا پڑا نہ اس کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر مہوش اس کے اس انداز اور رویے پر حیران تھی۔

"کیا ہو گیا اسے طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی۔" وہ ڈنر پر جب کمرے سے باہر نہ نکلا تو وہ اپنی حیرانی ظاہر کیے بنا نہ رہ سکیں۔

”تھنگ ...... تھک گیا ہے۔ یوں بھی ہم دونوں نے ہائی ٹی لی تھی۔ اس لیے اسے بھوک نہیں ہو گی۔ تم کھاؤ۔“
وہ ٹال گئے وہ مہوش سے الجھنا نہیں چاہتے تھے یوں بھی وہ اس معاملے سے اپنے طور پر افہام و تفہیم سے نمٹنا چاہتے تھے۔ آبص کو سمجھانا ضروری تھا۔ ان کے خیال میں اس کے دل پر لگی اس آگ کو ٹھنڈا کرنا ضروری تھا۔ بہر حال مہوش اس کی ماں تھی اور رشتہ مضبوط تھا اس میں مزید کوئی انتشار پیدا ہو جائے ایسا وہ نہیں چاہتے تھے۔ وہ ٹھنڈے اور تحمل مزاج کے آدمی تھے۔
”ارے ...... آپ کہاں چل دیے۔“ وہ اکبر جیلانی کو کرسی سے اٹھتے دیکھ کر بولیں۔
”بھوک زیادہ نہیں تھی۔ میں روم میں جارہا ہوں تھک گیا ہوں آج تو میں بھی۔ اب سوؤں گا۔“
”اوکے۔“ مہوش کندھے اچکا دیے۔ ”نصیر کاکا! رومی کو بلائیے ٹھنڈا ہو جائے گا سب، ان باپ بیٹوں کو تو اب ہوٹلنگ کی عادت ہو گئی ہے۔“ وہ اطمینان سے اپنی پلیٹ نزدیک کھینچ کر کانٹا اٹھا کر فرائیڈ چکن کھانے لگیں۔
☆☆☆
اریبہ پرپل اور گولڈن امتزاج کے لہنگا سوٹ میں ہلکے میک اپ اور جیولری میں دلہن بنی بہت پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ عقیلہ خالہ تو خوشی سے نہال تھیں گویا پیر زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ نیلوفر نے سکندر کو پکڑ کر اسی کے برابر بٹھا دیا۔
”بھئی“ اب زیادہ ہیرو نہ بنو۔ فٹافٹ یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کر اسے قید کر لو۔“
سکندر جیسے ہی اریبہ کے برابر بیٹھا وہ شرم سے سمٹ گئی۔ اس کے چہرے پر بے حد حسین رنگ جھلکنے لگے تھے۔ حقیقتاً وہ بے حد دلربا دکھائی دے رہی تھی۔
”میں کوئی دیو ہوں جو پری کو قید کر لوں۔“ سکندر نے نیلوفر کے ہاتھ سے انگوٹھی لیتے ہوئے اسے گھورا پھر اریبہ کا ہاتھ تھام کر انگوٹھی پہناتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ”پری از خود قید ہونا چاہے وہ الگ بات۔“
اس نے اریبہ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔
اریبہ کی سہیلیاں۔ رشتے دار لڑکیاں سب تالیاں بجا کر شور مچانے لگیں۔ پارٹی پاپر اڑانے لگیں۔ سکندر گھبرا کر بالوں کو جھاڑتا وہاں سے اٹھ گیا۔ لڑکیاں ساری اریبہ کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں اور اسے چھیڑنے لگیں۔
سکندر وہاں سے اٹھ کر ارسلہ کی طرف آیا جو ایک طرف الگ تھلگ چپ چپ سی کھڑی تھی۔
”مبارک باد نہیں دو گی مجھے۔“
وہ اس کے سامنے بالکل یونہی آ کر کھڑا پوچھنے لگ جس طرح وہ اس کے سامنے ایک دن آ کھڑی ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”مبارک باد نہیں دو گے۔“
”گو کہ انگوٹھی زیادہ قیمتی نہیں پہنائی تمہاری بہن کو مگر سچے دل سے اور خلوص کے نگینے فٹ کر کے دیے ہیں۔ مطلب خلوص سے پہنائی ہے۔“ وہ سنبھل کر مسکرا دی۔
ہاں۔ تمہارا خلوص تو چھلکا پڑ رہا ہے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا خاصے منچلے ہو رہے ہو۔“ وہ طنز سے ہنسی۔
”کیا خوشی کا اظہار کرنا چھچھورا پن ہے۔“
”ارے نہیں ...... یہ میں نے کب کہا بھلا۔ میں تو بہت خوش ہوئی کہ چلو تمہیں بھی ایک اچھی شکل و صورت کی لڑکی مل گئی، اب کہاں خالہ دھکے کھاتی پھرتیں۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔ وہاں بھی اطمینان قابل دید تھا۔
”پھر تو مجھے ڈبل ڈبل شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں کہ خدا نے لاج رکھ لی۔ اور میری ماں کو جوتے نہیں گھسانے پڑے۔“
ارسلہ کو یکدم اپنے اندر سے غصے کا ابال اٹھتا محسوس ہونے لگا۔ اس کا یہ اطمینان اور سکون۔ اس کے دل کو

جانے کیوں چبھ رہا تھا۔
"تو ادا کرتے رہو شکر اور پڑتے رہو شکرانے کے نفل۔" وہ پلٹنے لگی۔
"لگتا ہے تم اس شان دار دعوت میں اریبہ کو بھی مبارک باد دینا بھول گئی ہو شاید۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ بڑی کاٹ دار ہنسی تھی۔
وہ پلٹی اس پر ایک چلچلاتی نظر پھینکی۔
"اونہہ! بڑی شاندار پارٹی ہے کہ میں حواس کھودوں گی۔ خاطر جمع رکھو۔ میں ارسلہ آبص ہوں۔ حواس دوسروں کے گم کر سکتی ہوں، اپنے نہیں۔" وہ یہ کہہ کر پلٹ کر نیلوفر کی طرف چلی گئی جو احمر سے باتیں کر رہی تھی اور اپنی ساس اور نند کو بے حد شائستگی سے کھانا پیش کرنے میں مصروف تھی۔
"ارے ارسلہ۔" خالہ نے اسے پکار لیا۔ وہ رک گئی پھر عقیلہ خالہ کی طرف چلی آئی۔
"بہت مبارک ہو خالہ۔" وہ پھیکی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے بولی۔ مگر خالہ اپنی خوشی میں اس کے چہرے اور لہجے کے رنگوں میں کہاں الجھتیں۔
"خیر مبارک۔ اور تمہیں بھی بہت مبارک ہو میں تو مانو جنت میں پہنچ گئی ہوں۔ اتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ بس میرے رب کا کرم ہے اس نے ہیرے جیسی بچی میرے بیٹے کی قسمت میں لکھ دی۔" عقیلہ خالہ نہال ہو کر بولیں۔ وہ فقط مسکرا دی۔
"ارے ہاں۔ ارسلہ، آبص نہیں آیا۔ تمہاری ساس بھی بس دس پندرہ منٹ بیٹھ کر چلی گئیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔"
"جی خالہ، ایکچوئلی میری ساس کو کہیں اور بھی جانا تھا۔ بہت قریبی جاننے والوں میں بس اس وجہ سے وہ تو میری خاطر یہاں بھی آ گئی تھیں۔ اور آبص کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی فیور ہو رہا تھا، میں نے آنے سے منع کر دیا۔ اب کہاں یہ اتنے چھوٹے سے فنکشن کے لیے آتے اور خوار ہوجاتے۔" وہ سامنے کھڑے سکندر پر نظر پھینک کر خالہ سے کہتی وہاں سے ہٹ گئی۔
امی اس کا جملہ سن چکی تھیں خالہ کے نزدیک آتے ہوئے بولیں۔
"اچھا ہوا تم نے آبص کا پوچھ لیا۔ میں پوچھتی ہوں تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتا نہیں اچانک اسے کیا ہو جاتا ہے۔ بس اس سے تو اس کے مطلب کی ہی بات کرے بندہ۔ تب ٹھیک ہے۔"
"ارے، ایسا نہیں ہے ان دنوں چڑچڑی ہو ہی جاتی ہیں عورتیں۔ خیر سے بچہ ہو جائے گا تو اس کی طبیعت میں بھی ٹھہراؤ آ جائے گا۔ تم اس کی زیادہ فکر نہ کیا کرو۔ چلو آؤ کھانا کھالیں ہم دونوں بھی۔"
"ہاں۔ میں بھی تمہیں اسی لیے بلانے آئی تھی۔ نیلو کی ساس بھی خاصی دیر سے تمہارا پوچھ رہی تھیں۔" اماں عقیلہ خالہ کے ہمراہ نیلو کی ساس کی طرف چلی آئیں۔ اور ان کی خیر خیریت پوچھنے لگیں۔

☆☆☆

لڑکیاں سب کھانا کھانے میں مصروف تھیں تب اریبہ موقع پا کر خالہ کے کمرے کی طرف آئی۔ مگر سکندر کو دیکھ کر جھجک کر دروازے پر ہی رک گئی۔ سکندر کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کھٹکے پر نظریں اٹھائیں تو اریبہ کو دیکھ کر ذرا سا چونکا پھر حیرانی سمیٹ کر مسکرا دیا۔ اور سگریٹ بجھا کر کرسی سے اٹھ گیا۔
"سب لوگ چلے گئے کیا؟"
"ہاں بس گھر کے لوگ ہی رہ گئے ہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔
"آؤ...... اندر آؤ۔ دروازے پر کھڑی رہو گی تو مجھے شک ہوگا کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہی ہو۔ یعنی میرے

کردار پر شک کر رہی ہو۔" وہ خوش دلی سے کہتا اس کی طرف چلا آیا۔

"ارے، نہیں آپ پر شک کیوں کرنے لگی۔" وہ ہڑبڑا کر جلدی سے کہتی اندر چلی آئی مگر دوسرے پل پھر جھجک کر وہیں تھم گئی۔ ہمت کر کے وہ یہاں تک تو آ ہی گئی تو مگر اب جیسے سارا اعتماد دھویں کے غول کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"کچھ کہنے آئی تھیں۔" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر چلتا ہوا اس سے دو قدم فاصلے پر رک گیا۔

سیاہ شلوار سوٹ پر تیز گرے کلر کی واسکٹ پہنے اس کا اونچا لمبا وجود اریبہ کو اپنے حواس پر چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی۔ اس کی مسحور کن شخصیت کے سحر میں تو وہ پہلے ہی جکڑی رہتی تھی اب تو اس رشتے کے بندھ جانے کے احساس نے اسے اور بھی حواس باختہ کر دیا تھا۔

"نن...... نہیں میں تو بس میں خالہ کو دیکھنے آئی تھی۔ میں بھی وہ یہاں ہوں گی۔" وہ ہڑبڑا کر پلٹنے لگی کہ سکندر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا راستہ روکا۔

"جو کہنے آئی تھیں وہ کہہ دو۔ ورنہ رات بھر الجھی رہو گی۔" وہ سر جھکا گئی اور اضطراری انداز میں اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھمانے لگی۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو۔" سکندر نے چند لمحے توقف کے بعد سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے اسے دیکھا پھر اس پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اسے لبوں کے درمیان باہم پھنسائی۔ اریبہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ مگر آپ کیسے جانتے ہیں کہ میں کیا پوچھنا چاہتی ہوں۔" وہ حقیقتاً حیران دکھائی دے رہی تھی۔

"اس لیے کہ تم اب تک بے یقین ہو۔" اس نے سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھایا اور ہلکا سا کش لے کر دھواں فضا کے سپرد کر دیا۔

اریبہ کا بکھرتا اعتماد قدرے سنبھلنے لگا۔

"جی، یہی بات ہے۔" وہ سر جھکا کر اعتراف کر گئی۔

"کیوں...... کیوں ہو بے یقین؟ اس کے پہننے کے بعد بھی!" اس کا اشارہ اس کی انگلی میں دمکتی انگوٹھی کی طرف تھا۔

"شاید۔ اسی نے بے یقین کر دیا ہے۔ کہیں یہ سمجھوتا نہ ہو۔" وہ نا چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔ سکندر نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

ارسلہ کی کہی ہوئی یہ بات پھانس کی طرح اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ مضطرب تھی بے چین تھی۔ کسی کروٹ سکون نہ مل رہا تھا۔

"سمجھوتے کا مطلب سمجھتی ہو تم۔" وہ اپنی حیرت سمیٹ کر اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔ وہ پلکیں جھکا گئیں۔

"میں صرف اتنا سمجھتی ہوں کہ کہیں آپ خالہ جان کی خاطر یہ رشتہ جوڑ رہے ہوں انہوں نے آپ پر دباؤ ڈالا ہو۔"

"کیا تمہیں میں اتنا کمزور لگتا ہوں کہ کسی کے دباؤ میں آؤں گا۔"

"کسی نہیں...... ماں کے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

سکندر یکدم سنجیدگی کی لپیٹ میں آ گیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر بیٹھو۔"

"جی۔" وہ یکدم بوکھلا گئی۔ "کک کوئی آ جائے گا۔"

"کوئی نہیں آئے گا۔" وہ ہنوز سنجیدگی سے گویا ہوا۔ تب وہ کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ سکندر اس کے سامنے رکھی مسہری کے کونے پر ٹک گیا۔ وہ سکندر کی اتنی قربت پر گھبرا رہی تھی۔ خوف شرم اور بوکھلاہٹ نے بیک وقت

اس پر حملہ کر دیا تھا۔ ایسے میں وہ بہت معصوم اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

"دیکھو اریبہ! تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو ایک مکمل لڑکی ہو۔ اس کے باوجود تم سے شادی سے انکار میں اس لیے کرتا رہا تھا کہ میں ذہنی طور پر تمہیں نہیں بلکہ خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ کسی لڑکی کے جذبات سے کھیلنے کا مجھے قطعاً کوئی حق نہیں تھا۔ مگر وقت بہت بڑا فیصلہ گو ہے۔ وہ خود ہی فیصلہ کرتا ہے ہماری بہت سی الجھنوں کو سلجھا جاتا ہے ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بہت سی الجھنیں خود بخود سلجھتی چلی گئیں بہت سی خوش فہمیاں بلکہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ بہت سے اندھیرے جو میں نے از خود اپنی آنکھوں کے آگے پھیلا رکھے تھے دم توڑ گئے۔ اور روشنی دکھائی دینے لگی بلکہ یوں سمجھو روشنی اور اندھیرے میں فرق واضح ہو گیا۔ ہر شے صاف نظر آنے لگی۔ اور مجھے فیصلہ کرنا بہت آسان ہو گیا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دھیرے سے دبا دیا۔

اریبہ نے نظریں اٹھائیں مگر دوسرے پل جھکا دیں۔ وہ نگاہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہ تھی اس کے بے حد نزدیک تھیں۔

"یاد رکھنا۔ یہ ہاتھ پورے خلوص اور دل کی رضامندی سے تھاما ہے اریبہ۔ میں نہ خود کو دھوکا دیتا ہوں نہ دوسروں کو۔ ہر تعلق پوری سچائی سے نباہنا چاہتا ہوں۔ بہت عزت ہے تمہاری میرے دل میں۔"

"اور محبت۔" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

اور ادھر دروازے کے باہر کھڑی دانستہ رک کر ان دونوں کی باتیں سننے والی ارسلہ کی سانس جیسے ایک پل سینے میں رکنے لگی۔ اریبہ کے اس سوال پر اس کی بصارتیں بھی گویا سماعتوں کا روپ دھا کر سکندر کا جواب سننے کا انتظار کرنے لگیں۔ عجیب سی خوش فہمی نے دل کو گھیر اتھا۔ اسے اریبہ پر رحم آنے لگا۔ اسے یقین ہی تو تھا کہ سکندر اگر اس کا دل توڑنا نہیں چاہے گا مگر ٹال جائے گا۔ مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب سکندر اس کے نرم و نازک ہاتھ کو تھپک کر کہہ رہا تھا۔

"جس سے محبت ہو اس کی عزت تو خود بخود دل میں بڑھ جاتی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو میں تمہاری عزت صرف اس لیے کرتا ہوں کہ تم میری خالہ زاد ہو۔ نہیں اس لیے کہ تم میری محبت بھی ہو۔ یاد رکھنا بیا کبھی کسی کی باتوں میں آکر شک کو دل میں جگہ مت دینا۔ میرے جیسا آدمی محبت میں جان بھی لٹا سکتا ہے مگر اس پر جو اس کا حق دار ہو۔ اہل ہو۔ اب جاؤ اور جس نے تمہارے دل میں یہ شک کا کانٹا چبھویا ہے اسے جا کر ضرور بتا دینا کہ سکندر کہہ رہا تھا کہ محبت اسے ملتی ہے جو محبت کرنا جانتے ہیں...... جو محبت کے احساس کو پالتے ہیں۔ محبت بھی تو محبت مانگتی ہے۔ یہ وہیں نمو پاتی ہے جہاں زمین نرم اور سازگار ہو۔ سخت اور بنجر زمین میں صرف کانٹے اگتے ہیں، محبت کا نرم و نازک پودا نہیں۔" سکندر کا لہجہ غیر معمولی سنجیدگی میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تھے۔ وہ مسہری سے اٹھ گیا تھا اور رخ موڑ گیا۔ "جاؤ اور آئندہ بے یقین نہ ہونا۔"

اریبہ جیسے کسی خوشی کے احساس کے ساتھ کانپتی سی اٹھی اور تیزی سے باہر لپک گئی۔ اگر ارسلہ ایک طرف نہ ہو جاتی تو ممکن تھا وہ اس سے ٹکرا جاتی۔ ارسلہ نے جاتی اریبہ کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایسی خوشی مہک رہی تھی گویا وہ اس کمرے سے کوئی مدفون خزانہ دریافت کر کے نکلی ہو۔

یکدم عجیب سا تذلیل کا احساس اس کے دل کے کسی گوشے سے اٹھا اور رگوں میں آگ بن کر دوڑنے لگا۔ وہ بامشکل اپنے اندر سے امڈنے والے کسی اشتعال کو دبا کر جھٹکے سے پلٹ کر ملحقہ روم میں چلی گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سالگرہ نمبر

فہمیدہ فرید خان

مارچ کی بہار

"تم سب کے بچپن کی کہانیاں لکھتی ہو ناں، میرے لیے بھی ایک چھوٹا سا مزاحیہ خاکہ لکھ ڈالو۔"

سوہنیا بھابھی نے اس طرح فرمائش جھاڑی جیسے دال کو بگھار لگانے کا کہہ رہی ہوں۔ ان کو شاید علم نہیں تھا کہ میری ساری بچپن کی کہانیاں میرے اپنے گرد گھومتی تھیں، دوسروں کے بارے میں لکھ کر میں نے مخلوقِ خدا کو اپنے متھے تھوڑی لگا لینا تھا۔

سوہنیا بھابھی کو ہمارے ہمسائے میں بیاہ کر آئے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہونے کی وجہ سے گھر والا حساب کتاب تھا۔ وہ ہم سے اور ہم ان کی عادات و اطوار سے کماحقہ واقف ہو چکے تھے۔ میں ازلی مست ملنگ بندی تھی۔ جب سے میری چند تخلیقات رسائل کی زینت بنی تھیں، میں دنیا سے بالکل ہی الغرض ہو چکی تھی۔ پورا وقت خیالی پلاؤ پکا پکا کر ڈھیر لگائے جاتی مگر لکھتا کون...... بھابھی کبھی کبھی مجھے میرے حجرے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں جیسے اس وقت میں ان کے بیٹے شاہ ویز کی سالگرہ میں شریک تھی۔

"کوشش کرتی ہوں۔" میں نے مرے مرے انداز میں ٹالنے کی کوشش کی۔

میرا ذہن اس وقت میرے تخیل کو الفاظ کا پیراہن پہنانے سے قاصر تھا۔ میں سالگرہ میں تخلیقی جھمیلوں سے دور وقت گزاری کا سوچ کر آئی تھی اور یہاں وہی بارِ گراں میرے کندھوں پر لاد دیا گیا تھا۔ صرف لکھنے والے ہی تخلیق نگاری کا کرب سمجھ کر میری کیفیت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق میں مخمصے میں پڑ گئی۔

"ارے واہ کوشش کیسی؟ کیا تم لکھاری نہیں ہو؟"

یہ تو سیدھا سیدھا جذباتی وار تھا۔ گویا ان کے نزدیک لکھاری ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میرے دماغ میں کہانیاں گھڑنے کا کارخانہ لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی کسی نے خواہش یا فرمائش کی، کھٹ کھٹ کھٹاک کہانی بن کر باہر نکل آئی۔

"آپ سمجھ نہیں رہیں بھابھی۔ لکھنا آسان کام تھوڑی ہوتا۔"

"اس میں کیا مشکل ہے بھلا۔ اس سے مشکل تو شروع شروع میں میرے لیے دیگ پکانا تھا۔ اب دیکھو پچاس پچاس بندوں کا کھانا بنا لیتی ہوں۔"

انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ میرا منہ کھل گیا یعنی واقعی دال کے بگھار والی سوچ تھی ان کی۔ میرے چہرے پر بے بس مسکراہٹ پھیل گئی تو ان کو لگا میں قائل ہو چکی ہوں۔ وہ فتح مندی کے احساس سے سرشار چھپاک سے باورچی خانے میں غروب ہو گئیں۔ چاروناچار میں نے اپنے موبائل کا

تختہ کلید نکال کر اسے گھورنا شروع کر دیا کہ کیا لکھوں مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

ماحول سے کٹ کر میں نے اپنے تخلیاتی گھوڑے دوڑانے کی سعی کی۔ چند لمحے سوچنے پر صرف کرنے کے بعد چند الفاظ مٹھی میں قید کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ گہرا سانس لے کر میں کلیدی تختی پر انہیں منتقل کرنے لگی۔ بالآخر ایک مزیدار سا خاکہ بن چکا تھا۔

''ہاں بھئی عینا کیا بنا؟'' سوہنیا بھابھی ساڑھی کی فال درست کرتے ہوئے قریب آئیں۔

''لکھ لیا ہے بھابھی۔''

میں نے موبائل ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں اک شانِ استغناء سے پیچھے کیا اور ناک ماتھے تک چڑھا کر مجھ پر احسان دھرا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا لکھ لوگی مگر بی بی تم لکھاری لوگ ہوتے بڑے نک چڑھے ہو۔''

میں کچھ کہنے سے قاصر جز بز ہو کر پہلو بدل گئی۔

''کیک کٹنے کے بعد سب کو سنانا۔ میں نے اسی لیے بطور خاص تمہیں بلوا دیا تھا تاکہ میں بھی شو مارنے لائق ہو سکوں کہ میرے ہمسائے میں ایک مصنفہ رہتی ہے۔ اچھی طرح پڑھ کر سنانا، میری ناک نہ کٹوا دینا۔''

ان کی ناک کٹنے کا سن کر میرے چہرے پر افسوس ناک تاثرات ابھرے، جن کو صرف نظر کر کے وہ ٹک ٹک کرتے یہ جا وہ جا ہوئیں۔

سبحان تیری قدرت ایک تو نک چڑھے کا خطاب دے گئیں، اوپر سے ناک بھی انہی کی کٹ رہی ہے۔

خیر سے شاہ ویز کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا، گیت گائے گئے، پھر بچوں کو مختلف سرگرمیوں میں مشغول کر کے سوہنیا بھابھی میرے سر پر آسوار ہوئیں۔

"خواتین وحضرات ذرا توجہ فرمایے۔"

انہوں مہذب نظر آنے کے لیے پہلے دو تین بار گلا کھنکار کھنکار کر صاف کیا، پھر بھی کوئی متوجہ نہ ہوا تو وہ اپنے اصلی رنگ میں آئیں۔ ان کی للکار سن کر بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا تھا، مہمان بے چارے کیا چیز تھے۔ سب پر سہم طاری ہو گیا۔ ان کی آواز غضب کی کڑک ناک تھی۔ میں نے پھر ناک کا خیال آنے پر لاحول پڑھی۔ بھئی غلط مت سمجھیں اپنے ناکیانہ خیالات پر لاحول ہی پڑھ سکتی تھی۔ ویسے ان کے میاں اشفاق حسین نے ان کی آواز کو بھونپو کا نام دیا ہوا تھا۔ بقول ان کے بیگم کی آواز ماشاء اللہ سات محلوں تک لاؤڈ اسپیکر کے بغیر بھی واضح سنی جا سکتی ہے۔

"یہ میری ہمسائی ماں جائی عینا عبداللہ ایک مشہور مصنفہ ہے۔" انہوں نے مشہور کو کھینچ کر ادا کیا تو میں کسمسا کر رہ گئی۔

"اللہ نہ کرے آپ میری ماں جائی ہوں۔" میں منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

بمشکل تمام دو تین چھوٹی چھوٹی کہانیاں چھپی ہیں۔ کہاں ہوئی میں مشہور...... چل اٹھ عینا، بے عزتی ہونے سے پہلے بھاگ لے پتر۔ لیکن ساکت وصامت وجود نے ہلنے سے انکار کر دیا اور میں اپنی مدح سرائی بلکہ مبالغہ آرائی سننے پر مجبور رہی۔ دس پندرہ منٹ کی اس تقریر دل پذیر کے دوران شرکاء محفل پہلو پر پہلو بدلتے رہے پھر جانے کیوں سب کو سانپ سونگھ گیا تب اللہ اللہ کر کے نادیدہ مائیک میرے سامنے آیا۔

میں لفظوں کو برتنے والی بندی ضرور تھی مگر بولنا اور بن بن کر بولنا مجھے ہمیشہ الجھن میں ڈال دیتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اقتباس پڑھنا شروع کیا۔

وہی ہاں جہاں کچھ دیر قبل سکوت طاری تھا، وہاں ہر کوئی قہقہہ بار تھا۔ تعریفوں کے ڈونگرے برسنے لگے۔ سوہنیا بھابھی ہر جملے پر اچھل اچھل کر داد دے رہی تھیں، اختتام پر ایسا اچھلیں کہ اشفاق بھائی سے جا ٹکرائیں۔ وہ بچارے اس گرما گرم محفل میں سگریٹ سلگا کر رب جانے کن جہانوں کی سیر پر تھے کہ انہیں واپس زمین پر پٹخ دیا گیا۔ ان کے ہاتھ سے سلگتا ہوا سگریٹ اگلی نشست پر متمکن بیگم بشریٰ غیاث کی فرش کو چھوتی ساڑھی کے پلو پر گلکاری کرنے لگا۔ جسے وہ اس ادا سے پھیلا کر بیٹھی تھیں تاکہ سب کی نگاہیں اس کی خوب صورتی، نزاکت اور نفاست سے خیرہ ہو سکیں۔

وہ کب سے منتظر تھیں کہ میرا اقتباس ختم ہو اور وہ لمبی لمبی چھوڑنے کا آغاز کر سکیں۔ جونہی میں نے موبائل میز پر رکھا، وہ اپنے دبئی کے بھرپور دورے کی تفصیلات سے سامعین کو مستفیض کرنے لگیں جبکہ ان کی ناک کے نیچے تازہ واردات رونما ہو چکی تھی۔ (ناک کی خیر ہو)

اشفاق بھائی حیرت سے منہ کھولے ساڑھی کے سوراخ کو پھیلتا پھولتا دیکھتے رہے مگر بیگم بشریٰ غیاث کو بتانے میں نقص امن کا خطرہ تھا۔ آخر کو اسی ساڑھی کی دلفریبی، خوش نمائی ودلربائی موضوع گفتگو تھی جو دبئی کے مہنگے ترین مال سے خریدی گئی تھی۔

سوہنیا بھابھی غیر محسوس انداز سے آگے ہوئیں اور سگریٹ جھاڑ کر گفتگو میں یوں منہمک ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس وقت خاموش رہنے کا مطلب تھا کہ انہوں نے ترپ کا یہ پتا آڑے وقت کے لیے سنبھال کر رکھ لیا ہے۔ میں نے بچشم خود اشفاق بھائی کو اس وقت کے تصور سے جھرجھری لیتے دیکھا۔

دریں اثناء یہ سوراخ اتنا بڑا ہو چکا تھا جتنی ہمسائے کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے چار دیواری میں موری ہوتی ہے مگر بھابھی کی بلا سے بشریٰ غیاث جانتیں یا ان کی ساڑھی۔ عین ممکن تھا ان کو گھر جا کر

ہی علم ہوتا پر سانوں کی۔ میں تمام فکروں سے آزاد ہو کر اکیلی ٹی سے لطف اندوز ہونے لگی جو بھابھی نے غضب کی بنائی تھی۔ اس طرح کے کھانے بنا بنا کر ان کا رنگ برنگی تشبیہات اور استعارات استعمال کرنے کا حق بنتا تھا بھئی۔

☆☆☆

میں جانے کی اجازت طلب کر رہی تھی کہ بھابھی کے بھائی نے مداخلت کی۔

"آپ مجھے تھوڑا وقت دیں گی مس۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

میں اس مداخلت بے جا پر ذرا سا گڑبڑائی، سوہنیا بھابھی کی مستفسرانہ نگاہوں پر ہچکچائی اور بادل ناخواستہ بولائی اوہ معاف کیجیے گا بولی۔

"جی پوچھیے۔"

"یہ کہانی آپ نے خود لکھی تھی؟"

"کون سی کہانی؟" فوری طور پر مجھے یاد نہ آیا وہ صاحب کس کہانی کی بابت پوچھ رہے ہیں۔

"یہی جو آج آپ نے محفل میں حاشیہ آرائی کی۔" اس نے حاشیہ آرائی کو یوں لہک کر ادا کیا کہ مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانے میں دقت محسوس ہوئی۔ میں نے ہلکا سا کھانس کر اپنے تاثرات مخفی رکھنے کی سعی کی۔

"جی میں نے خود لکھی تھی، یہیں بیٹھ کر سوہنیا بھابھی کی فرمائش پر۔"

میں نے سوہنیا بھابھی کی طرف تائیدی نگاہوں سے دیکھا جو میرے پاس کھڑی تھیں۔ ان کے تاثرات مجھے کچھ سرد سے لگے۔ اتنے سالوں کی ہمسائیگی سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا وہ اپنے بھائی کو ہر ممکن طریقے سے لڑکیوں سے دور رکھتی تھیں۔ سوئے اتفاق ان کا بھائی ایسے شعبے میں جا لگا تھا جو لڑکیوں کے دم سے زندہ و پائندہ تھا، اب جانے وہ کس طرح اس پر نگاہ رکھ پاتی ہوں گی۔ میں وہاں سے کھسکنے کے لیے پر تولنے لگی۔

"ارے واہ! یعنی میں ایک برجستہ گو قلم کار سے مخاطب ہوں۔"

"ابھی تو آغاز سفر ہے۔"

میں بطور منکسر مزاجی سر جھکانے ہی والی تھی کہ اس بندے کی گول گول گھومتی متجسس آنکھوں پر نگاہ پڑ گئی۔

"یہ بندہ اتنا چغد سا کیوں لگ رہا ہے۔"

"اس کی گنتی کی چند کہانیاں ہی منظر عام پر آئی ہیں۔"

میں اس کی آنکھوں پر غور کرنے والی تھی مگر سوہنیا بھابھی کی کراری آواز نے مجھے کچھ زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ وہ بظاہر اپنے بھائی سے مخاطب تھیں مگر ان کے تاثرات مجھے پکار پکار کر کہہ رہے تھے اب دفع بھی ہو جاؤ۔

بعض اوقات آپ مروت کے ہاتھوں بہت مار کھاتے ہیں۔ میں بھابھی کی خاطر رکی تھی اور انہوں نے ہی مجھے دو کوڑی کا کر چھوڑا تھا۔ میں نے اجازت چاہی مگر ان کا بھائی کمبل ہی ہو گیا۔

"رکیے رکیے سنیے۔" وہ بھاگ کر سامنے آیا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھال کر اس سے ٹکرانے سے روکا۔

"اس طرح روکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" وہ میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر گڑبڑایا۔

"میرا نام جاسم افراز ہے۔ میں جاسم پروڈکشنز کا ہیڈ ہوں۔" اس نے ایک مشہور پروڈکشن کمپنی کا نام لیا۔

"مجھے آپ کے اندر بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں۔ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اپنا ون لائنر ای میل کر کے میرے نمبر پر کال کر لیجیے گا تاکہ میں جلدی دیکھ لوں ورنہ آپ کو پتا ہی ہے بات مہینوں اور سالوں تک ٹلتی رہتی ہے۔ آپ جیسا خوش نصیب کوئی کوئی ہی ہوتا ہے جس کو براہ راست موقع مل جائے۔"

میری بلا جانتی تھی کس کو موقع ملتا ہے، کس کو نہیں اور کون خوش نصیب یا بدنصیب ٹھہرا۔ وہ ابھی کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر میں نے سوہنیا بھابھی کو اپنی جانب پیش قدمی کرتے دیکھ کر برق رفتاری سے کارڈ جھپٹ کر پرس

میں اڑسا اور سرعت سے دروازہ پار کر گئی۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر میں نے آرام دہ لباس پہنا۔ چائے بنا کر لاؤنج میں آئی تو بھائی امی کے پاس بیٹھے کالج و یونیورسٹی کا کام کر رہے تھے جبکہ ابو ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ میں نے ان سب کو چائے پیش کی اور میں امی کو تقریب کی روداد سنانے لگی۔ بیچ بیچ میں عارفین اور علوان بھی لقمے دیتے رہے۔ ان کی نظریں گیم پر اور کان ہماری باتوں پر لگے تھے۔

''ارے ہاں امی۔ میں آپ کو ایک زبردست بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ سوہنیا بھابھی کے بھائی کو میرا اقتباس بہت پسند آیا اور انہوں نے مجھے اپنے پروڈکشن ہاؤس کے لیے اسکرپٹ لکھنے کا بولا ہے۔'' میں نے اپنے تئیں کارنامہ کیا تھا۔

''ایں، اس کا کون سا بھائی پروڈکشن کمپنی بنا کر بیٹھ گیا ہے؟''

امی کا اچنبھا دیکھ کر میرا سارا جوش و خروش جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔

''مجھے کیا پتا۔ آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں جیسے بھابھی اپنے سارے راز و نیاز کی باتیں مجھ سے کرتی ہیں۔ میں نے ان کے بھائی کی شکل ہی آج پہلی بار دیکھی ہے۔''

''اسی لیے کہتی ہوں ہر وقت فلسفی بن کر مت گھوما کرو، ارد گرد کی خبر بھی رکھا کرو۔''

''اور ابھی آپ خود پوچھ رہی تھیں وہ......''

میرا چہرہ پھول کر کپا ہو گیا۔

''ائے، کیسے میری اولاد میری زبان پکڑنے کو بیٹھی ہوتی ہے۔ وہ سوہنیا ہی اپنے بھائیوں کا زیادہ ذکر کرنا پسند نہیں کرتی، اس کے بقول ان کا خون ہلکا ہے تو جلدی نظر لگ جاتی ہے۔'' امی کے وضاحتی بیان پر ہم تینوں بہن بھائیوں کا فلک شگاف قہقہہ پڑا۔ انہوں نے فہمائشی نظروں سے ہمیں گھورا۔

''اس کا ایک بھائی خیر سے استاد تھا اور دوسرا صحافی۔ کیا بھلے سے نام تھے باسم اور......'' امی ذہن پر زور ڈالنے لگیں۔

''جاسم......!'' میں نے ترنت لقمہ دیا اور چھ آنکھیں خود پر جمی دیکھ کر زبان دانتوں تلے دبا لی۔

''آں...... میرا مطلب ہے یہی نام بتایا تھا۔ ٹھہریں میں کارڈ لا کر آپ کو دکھاتی ہوں۔'' میں نے منظر سے غائب میں ہی عافیت جانی۔ بھاگم بھاگ کارڈ نکال کر واپس دوڑ لگائی۔ دروازے میں رک کر سانس درست کر رہی تھی جب امی کی آواز کان میں پڑی۔

''میں پوچھتی ہوں تم دونوں کو مسئلہ کیا ہے؟''

''سوہنیا بھابھی کا ایک بھائی بہت شوخا ہے۔ اگر یہ وہی ہے تو عینا کو منع کر دیں، اس سے کسی صورت رابطہ نہ کرے۔''

''ایسے کیسے منع کر دوں بغیر کسی وجہ کے...... پھر عینا خود سمجھ دار ہے۔''

''اس کی سمجھ داری پر ہمیں کوئی شک نہیں بشرطیکہ وہ آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔'' عارفین نے منہ بنا کر کہا۔

''اور آپی یہی دو کام کرنا اکثر بھول جاتی ہیں۔'' علوان نے گرہ لگائی۔

میرے نتھنے غصے سے پھولنے لگے۔ قریب تھا میں جا کر اس ٹڈے علوان پر جھپٹ پڑتی (چھ منٹ بڑے بھائی عارفین کو کچھ کہنا شامت کو آواز دینے کے مترادف تھا) کہ امی کی جھاڑ نے بھڑکتی آگ پر چھینٹے ڈال دیے۔

''چپ کر کے بیٹھو۔ سوت نہ کپاس، کولہو سے لٹھم لٹھا۔''

دونوں منہ بنا کر خاموش ہو گئے۔

''یہ رہا کارڈ۔'' میں نے نروٹھے پن سے کارڈ امی کی طرف بڑھایا مگر عارفین نے درمیان سے اچک لیا۔

''اوہ! یہ جاسم ہی ہے جوشو......''

امی کی گھوری پر باقی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔

"بات کر کے دیکھ لو۔ مناسب پیشکش ہوئی تو معاملات آگے بڑھانا ورنہ نمبر بلاک کر دینا۔" امی کے تدبر سے بولنے پر تائید کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"میرے نمبر سے بات کرنا۔ اپنا نمبر نہ دینا، بعد میں سو مسئلے بنتے ہیں۔" عارفین کی ذمہ دارانہ و برادرانہ رگ اس وقت شدت سے پھڑک رہی تھی۔

"کیسے فضول مشورے دے رہے ہو عارفین۔ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے تو تم باہر گھومتے رہتے ہو، وہ تمہاری راہ تکتی رہ جایا کرے گی۔ ایسی ہی احتیاطی تدابیر اپنا رہی ہیں تو نیا نمبر نکلوا دو بہن کو۔"

عارفین گڑبڑا گیا۔ الٹی آنتیں گلے پڑ گئی تھیں۔

"ہاں عافی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم مجھے نئی سم لا دینا۔" مجھے یہ تجویز جی جان سے پسند آئی تھی۔

"اچھا بابا لا دوں گا۔ یہاں تو جیھوا بولے، او ہی بوہا کھولے والا حساب ہوتا ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔

امی نے باورچی خانے کی راہ لی اور میں سر ہلا کر حسب سابق خیالوں کی دنیا میں کھو گئی جہاں ایک رنگین و سنگین کہانی کے تانے بانے میرے منتظر تھے۔

☆☆☆

میں نے نئی سم رجسٹرڈ کروا کر کارڈ سامنے رکھا اور ہندسے ملانے کے بعد انگلیوں سے میز بجاتے ہوئے گھنٹی کی آواز سننے لگی۔

"ہیلو جاسم افراز۔"

"السلام علیکم۔ عینا بات کر رہی ہوں۔"

"کون سی عینا۔"

اللہ جانے وہ کتنی عیناؤں کو جانتا تھا میرا دل سڑ کے سواہ ہو گیا۔ تاہم جتانے پر بھی سلام کا جواب ندارد تھا۔

"عینا عبداللہ۔" میں نے مختصراً بتایا۔

"معذرت، مجھے بالکل یاد نہیں پڑ رہا۔ دراصل اس وقت ایک ڈرامے کے سیٹ پر ہوں تو ذہن مصروف ہے۔"

"ڈرامے باز آدمی۔" میں بڑبڑائی۔ "آپ سے آپ کی بہن سوہنیا بھابھی کے ہاں ٹکراؤ ہوا تھا۔" سچی بات یہ تھی اس وقت مجھے سب سے مناسب لفظ یہی سوجھا تھا۔ اب ملاقات کہتی اچھی تو نہ لگتی میں۔

"آپ کو میرا اقتباس اچھا لگا تھا اور آپ نے مجھے اپنا کارڈ دے کر رابطہ کرنے کو کہا تھا۔"

میں جل کر بولتی چلی گئی۔ جواب میں جاسم افراز لمبی سی ہوں کر کے اتنی دیر خاموش رہا کہ میں سمجھی کال کٹ گئی ہے۔ موبائل کان سے ہٹا کر دیکھنے ہی لگی عین اسی وقت وہ بول پڑا۔

"اچھا وہ عینا...... آہاں یاد آ گیا مجھے۔"

اس کی فضول اداکاری پر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ صاحب خود اداکاری کے جوہر دکھاتے تو میری طرف سے سو بٹا سو ملتے۔ میرے اندر ابھرتے منتقمانہ خیالات سے بے خبر وہ گویا ہوا۔

"مس عینا! آپ یوں کریں اپنا ون لائنر مجھے ای میل کر دیں۔ آپ اچھا لکھتی ہیں، دیکھتے ہیں آپ کے اسکرپٹ میں کتنی جان ہے۔ میں آپ کو کال کر کے بتا دوں گا۔ پھر بات ہو گی آپ کو پتا ہی ہو گا میں کتنا مصروف رہتا ہوں بائے۔"

وہ ایک سانس میں سارا معاملہ نمٹا کر ٹھک سے فون بند کر گیا۔ میں جو اس انتظار میں تھی کہ اس سے ون لائنر کی بابت سوال پوچھوں، ہکا بکا رہ گئی۔

"لو جی سیاپا، یہی پوچھنے کے لیے تو کال کی تھی کہ ون لائنر کیسے لکھتے ہیں؟" میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

"کیا بولا جاسم؟" امی نے پیڑے بنا بنا کر سینی میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ون لائنر لکھنے کا بولا انہوں نے۔" میں نے پانی گلاس میں انڈیل کر میز پر رکھا۔ بوتل واپس فریج میں رکھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو لکھ دو۔" انہوں نے پیڑے کپڑے سے ڈھکے اور ہاتھ دھونے لگیں۔

میں نے آنکھیں پھیلا کر انہیں دیکھا۔

''کیسے لکھ دوں؟''

''جیسے لکھتے ہیں، ویسے ہی لکھ دو۔'' وہ گوبھی آلو میں چمچہ چلا کر سلاد بنانے لگیں۔

''مگر امی مجھے ون لائنر لکھنا نہیں آتا۔'' میں نے ہلکی آواز میں اپنی نالائقی کا اعتراف کیا۔

''کیا واقعی تمہیں ون لائنر لکھنا نہیں آتا؟'' وہ پوری کی پوری میری طرف گھوم گئیں۔ میں ان کی حیرت پر حیران تھی۔

''جی مجھے واقعی نہیں لکھنا آتا۔''

''کہانیوں کا ڈھیر لگایا ہوا ہے اور اتنا آسان کام نہیں آتا۔ تمہارا بنے گا کیا لڑکی۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

''آپ کو آتا ہے؟'' میں نے ناراضی سے پوچھا۔

''آتا تو نہیں مگر میں چاہوں تو لکھ بھی سکتی ہوں۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔''

یہ امی کیا کہہ رہی تھیں۔ میں خواہ مخواہ ہی ہر کسی سے پوچھے جا رہی تھی ون لائنر کیسے لکھتے ہیں اور میری والدہ جیسی نابغہ روزگار ہستی اس عام سے باورچی خانے میں آلو گوبھی کو دم دے رہی تھیں۔ میری حیرت دوچند ہو گئی۔

''ہاں بھئی یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ون لائنر کا مطلب ایک سطر ہی لکھنا ہوتا ہوگا۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر واپس دیگچی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ان کی بات پر میرے تجسس کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور میں اپنی پریشانی بھول کر بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

''آپ کا بھی جواب نہیں امی۔''

☆☆☆

''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تم لوگ ہنس کیوں رہے ہو۔''

امی ہم تینوں کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھیں اور ہم ہنس ہنس کر پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں بھائیوں کو ون لائنر کا قصہ سنا کر بیٹھی تھی اور اب فلک شگاف قہقہوں سے گول کمرے کی چھت اڑنے ہی والی تھی۔ ایک کی ہنسی رکتی تو دوسرے کو ہنستے دیکھ دوبارہ شروع ہو جاتی۔

''دادی امی کہتی تھیں جب زیادہ ہنسی آئے تو ناک سے جوتی کا تلوا رگڑ لینا چاہیے ورنہ شیطان وار کر دیتا ہے۔'' میں نے خود کلامی کرتے ہوئے گرد و غبار سے اٹا تلوا دیکھا تو مجھے ابکائی آ گئی۔ ''آخ...... دادی امی کے زمانے میں جوتیاں صاف ہوتی ہوں گی۔''

دوسری طرف عارفین کہہ رہا تھا۔

''میری بھولی ماں ون لائنر کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے۔'' اس کا چہرہ ہنسی کے مارے لال سرخ ہو رہا تھا۔

''ان پڑھ جاہل نہیں ہوں، اتنی انگریزی مجھے بھی آتی ہے۔''

علوان ان کے قریب جا بیٹھا اور ان کے شانے پر بازو دراز کر لیا۔

''امی! آپ کا قصور نہیں، آج کل اتنی نئی نئی اصطلاحات آ رہی ہیں کہ کبھی کبھی ہم بھی متذبذب ہو جاتے ہیں۔''

''پھر میری کیا غلطی ہے بتاؤ۔'' وہ جھنجلا کر بولیں۔

''آپ کی نہیں، اصطلاحیں نکالنے والوں کی غلطی ہے۔ ون لائنر کے نام پر ان کو کئی صفحات پر مشتمل کہانی کا خلاصہ چاہیے ہوتا ہے۔'' علوان کا لہجہ متبسم تھا۔

''کیا مطلب ہوا اس بات کا؟'' امی الجھ کر کچھ دیر کے لیے غصہ وصہ بھول گئیں۔

''امی ون لائنر کا مطلب کہانی کا خلاصہ ہوتا ہے۔''

''لے دس، جب خلاصہ چاہیے ہوتا تو ون لائنر کہنے کی کیا تک بنتی ہے بھلا؟ سیدھا سیدھا سمری کہہ لیتے۔'' علوان کی وضاحت پر ان کی تیوری دوبارہ چڑھ گئی۔ وہ کیا تو جیبھ دیتا، شانے اچکا کر رہ گیا۔

''ملے مجھے وہ بندہ جس نے یہ کھپ ڈالی ہے، اپنے ہاتھوں سے اس کی چٹنی پیسوں گی میں۔'' انہوں نے ہاتھوں سے گلا مروڑنے کا عملی مظاہرہ

کرتے ہوئے دانت کچکچائے۔

"امی! پہلے میرا مسئلہ حل کریں۔"

"اے ہائے۔ کہانی کا خلاصہ لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ دو منٹ میں لکھ لو گی تم۔ چلو شاباش ابھی بیٹھ کر لکھو، بعد میں روٹیاں بھی بنانی ہیں تم نے۔ چلو لڑکوں ذرا مجھے سلاد کے لیے سبزیاں تو کاٹ دو۔"

اپنے تئیں وہ بھائیوں کو ہٹا کر مجھے لکھنے کا موقع فراہم کر گئی تھیں۔ میں نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔ امی کو کیا معلوم یہ کوئی عام خلاصہ نہیں، اس میں کہانی کی جزئیات کو اتنے دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا تھا کہ پڑھنے والا پھڑک کر کہے اے ہو کڑی...... اوہ میرا مطلب ہے...... کہانی لیتی ہے۔ یہ کام اتنا آسان ہوتا تو ساری دنیا یہی کام کرنے لگ رہی ہوتی۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

"لو بھئی میں نے تمہارا کام آسان کر دیا۔" امی سوہنیا بھابھی کے ہاں سے لوٹیں تو ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"میرا کون سا کام سوہنیا بھابھی کر سکتی ہیں امی؟" میں دنگ ہوئی۔

"ارے وہی ون لائنر کا پٹ سیاپا جس کا دن رات غدر مچا تھا۔ کل تمہارے ابو بھی پوچھ رہے تھے صاحبزادی کیوں اداس اداس پھر رہی ہے۔ میں نے سوچا آج یہ ٹنٹا مکا ہی دوں۔ سوہنیا نے سن کر خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ کہہ رہی تھی بھائی سے نمونہ لے کر تمہیں واٹس ایپ کر دے گی۔"

میں نے سر پیٹا۔ سوہنیا بھابھی پر مجھے ذرا اعتبار نہ تھا۔ وہ لکھنے کو تڑکا لگانے سے تشبیہ دیتی تھیں، ون لائنر کے نمونے کو وہ شاید سویٹر کا نمونہ ہی سمجھ لیتیں۔ میں نے اپنے نادر و نایاب خیالات پر خود بھی جھرجھری لی۔

"امی! آپ نے خواہ مخواہ بھابھی کو بیچ میں گھسیڑ لیا۔ اگر مجھے اسکرپٹ مل گیا تو وہ پوری زندگی احسان دھرتی رہیں گی کہ یہ ساری ان کی محنت تھی۔"

"کاہے کا احسان...... کون سا خود کا لکھا دے رہی ہے۔" امی چمک کر بولیں۔

"آپ بھابھی کو جانتی نہیں ہیں کیا۔" میں نے پریشانی سے ماتھا مسل لیا۔ "ویسے میں نے گوگل سے دیکھ دا کر کچھ نہ کچھ کر لیا تھا۔ اب عافی کے انتظار میں ہوں۔ وہ اسے دیکھ لے تو میں ای میل کر دوں گی۔"

امی میری شکل دیکھ کر رہ گئیں۔

"اچھے بھلے قصے لکھ رہی تھیں تم، نہ سوہنیا کے ہاں جاتیں نہ یہ قضیہ پڑتا۔" وہ مسلسل مجھے پھٹکارے گئیں۔ میں آنسو ضبط کرنے کے لیے ہونٹ کاٹنے لگی۔

☆☆☆

سوئے اتفاق سوہنیا بھابھی نے "نمونہ" یعنی ون لائنر مجھے واٹس ایپ کر دیا۔ عارفین نے اس کی روشنی میں میرے لکھے کو بہ غور دیکھا اور پاس کر دیا۔ اس کی منظوری کے بعد میں نے جاسم افراز کو ای میل کر کے سکھ کا سانس لیا۔ ای میل کرنے کے بعد جی بات مجھے کوئی انتظار لاحق نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا بھابھی کا بھائی تھوڑا بہت ان جیسا ہی ہوگا یعنی وقت پڑنے پر ہی ون لائنر پڑھے گا۔ خیر میں کون سا مری جا رہی تھی۔ میں ویسے بھی نئے ناول پر کام کر رہی تھی تو اگلے کئی دن شدید مصروف گزرے۔ فارغ وقت میں امی مجھے باورچی خانے میں دھکیل دیتیں۔

یہ کچھ روز بعد کی بات ہے۔ میں شام کی چائے بنانے اٹھی تو بھائیوں کی فرمائشیں بھی ہمراہ تھیں۔ میں فرنچ فرائز اور سینڈوچ بنا چکی تھی جب اطلاعی گھنٹی بجی اور ساتھ ہی گویا زلزلہ سا آ گیا۔ میں نے سینی اٹھاتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا۔ سوہنیا بھابھی اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالے صحن کی کرسی پر براجمان ہو رہی تھیں۔

"اے عینا! میں کڑک چائے پیوں گی۔" انہوں نے باورچی خانے کی سمت منہ کر کے آواز لگائی۔

مجھے یقین تھا سارے محلے نے سن لیا ہوگا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ کوئی چائے لیے ہمارے گھر کا رخ کر لیتا۔ میں نے ایک پیالی مزید بڑھا دی تھی۔

میں صحن میں پہنچی تو محفل گرم تھی۔ علوان سینڈوچ رکابی میں رکھتے ہوئے توصیفی انداز میں کہنے لگا۔
"اپنا سوہنیا بھابھی! آج مجھے یقین ہو گیا آپ کی معلومات میں کافی بہتری آئی ہے۔"
میں سمجھ گئی اب بھابھی کی شامت آنے والی ہے۔
"ہائے میں صدقے۔ دیکھا میرا بھائی مجھ پر کتنا غور کرتا ہے۔" سوہنیا بھابھی نے اس کی بلائیں لیں۔
"بھابھی! اس پر بعد میں واری جایئے گا۔ پہلے وجہ دریافت کر لیں۔" عارفین اپنے بھائی کی جانب سے مشکوک تھا۔ یقین وہ شخص کرتا جو علوان کو جانتا نہ ہوتا تاہم بھابھی اکثر اس کے جھانسے میں آجاتی تھیں۔
"ہاں بتاؤ علوان۔"
عارفین کو گھور کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
اس نے پہلے رکابی میز کے دوسرے کونے تک کھسکائی۔ پھر کرسی اٹھا کر خود بھی دوسری سمت جا کر یوں بیٹھا کہ بوقتِ ضرورت بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہو۔
"دیکھیں ناں آپ نے آپی کو "اے عینا" پکارا تھا یعنی اب آپ کو پتا چل چکا ہے عینا اے سے شروع ہوتا ہے، ای سے نہیں۔"
عارفین کے بے ساختہ قہقہے نے درختوں سے پرندے تک اڑا دیے۔
میں بآواز بلند ہنسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس لیے مسکراہٹ چھپانے کے لیے پیالی منہ کے آگے کر لی۔
"دفع۔" سوہنیا بھابھی تنتنا کر علوان کی طرف لپکیں جو دو چھلانگوں میں ان کی پہنچ سے دور ہو چکا تھا۔
"عینا! کل شام جاسم آئے گا۔ اس نے تمہارے ون لائنر کے بارے میں کچھ بتانا ہے۔ دل کرے تو آجانا۔" پیالی میز پر پٹخ کر وہ دھم دھم کرتے ہوئے دروازہ پار کر گئیں۔
"کیا مصیبت ہے تم لوگوں کو۔ کر دیا ناں بھابھی کو ناراض۔ اب وہ مجھے کچھ بھی بتانے پر رضامند نہیں ہوں گی۔" میں روہانسی ہو گئی تھی۔
"ارے چھوڑو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بھابھی بھی تمہاری طرح بھلکڑ ہیں۔ کل تک بھول بھال چکی ہوں گی۔" عارفین فرنچ فرائز پر ڈھیر ساری کیچپ انڈیل کر لطف اندوز ہونے لگا۔ میں اس کی بے فکری پر اش اش کرتی چائے زہر مار کرنے لگی۔

☆☆☆

اگلے دن میں امی سے اجازت لے کر بھابھی کی طرف چلی گئی۔ جاسم افراز کی آمد کے دور دور تک آثار نہیں تھے۔ ہم صحن میں آن بیٹھے۔ مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور موسم خوشگوار ہو چلا تھا۔ نیلے آسمان پر بدلوں کی بدلیاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ سنہری دھوپ کی ہلکی سی تمازت بدن کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ یہ ویسے بھی میرا پسندیدہ مہینہ تھا۔ مابدولت نے اسی حسین موسم میں دنیا میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ میں ماحول کی نیرنگی میں مست تھی جب بھابھی نے کھنکار کر مجھے متوجہ کیا۔
"تمہیں پتا ہے میں سب سے بڑی ہوں۔ میں نے اپنے بھائیوں پر شروع سے کڑی نظر رکھی۔"
میں نے اس بے وقت کی راگنی پر الجھ کر انہیں دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائیں۔
"میں نے امی ابو سے بڑھ کر ان کی حفاظت کی۔ ان کو یوں سینت سینت کر پالا جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے۔"
"پھر میں شادی ہو کر یہاں آگئی اور میرے بھائی خود مختار ہو گئے۔ ایک نے پھپھو کی بیٹی پسند کر لی، پھپھو بھی وہ جن سے پوری زندگی امی کی نہیں بنی اور دوسرے کو۔"
انہوں نے برا سا منہ بنایا۔ ایک لحظہ خاموش ہو کر مجھے بغور تکنے لگیں۔ ان کی آر پار ہوتی نگاہوں سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ آخر وہ کیا کہنے کی کشمکش میں تھیں۔ میں عجیب سا محسوس کرنے لگی۔
"بھابھی خیریت تو ہے ناں؟"
"خیریت کہاں، میرے چھوٹے بھائی کو پہلی

نظر کی محبت ہو گئی ہے۔ پتا نہیں پہلی نظر کی محبت لوگ کیسے کر لیتے ہیں۔ لوگوں کو ایسے محبت ہو بھی کیسے جاتی ہے مجھے یہی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہانڈی میں نمک ڈالنا آتا نہیں، محبت ان کو پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔''

یک لخت انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے یوں ٹکا لیا جیسے، بہت تھک گئی ہوں۔

''مجھے پہلی نظر کی افسانوی محبت پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی تاوقتیکہ میرا اپنا بھائی اس کا شکار ہو گیا۔''

میں اچھل پڑی۔ یعنی جاسم افراز نامی بندہ جس کو میں نے چھوٹتے ہی چغد کا لقب دے دیا تھا اور جس کو عارفین شوہدا کہتے کہتے رک گیا تھا، اسے پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ بھئی واہ، کتنی خوش نصیب تھی وہ لڑکی جس کی خاطر اتنا وجیہہ شکیل اور دولت مند بندہ گوڈے گٹے محبت میں دھنسوا بیٹھا تھا۔ میں یکدم پرجوش ہو گئی۔

''ارے واہ! مجھے آگے بھی بتائیں۔ اتنے دن سے مجھے پلاٹ نہیں مل رہا تھا۔ کتنا مزے کا موضوع ہے اس پر تو ایک شاندار مزے دار جان دار بلکہ دھانسو سا ناول لکھا جا سکتا ہے۔ آپ کو یقیناً وہ لڑکی بری لگ رہی ہو گی۔ آپ بطور نند اپنے بھائی اور اس کی محبت کے درمیان دیوار چین بن جائیں گی۔ دیوار کے اس پار آپ کا بھائی ٹکریں مارے گا اور دیوار کے اس پار آپ کی ہونے والی بھابھی اداس پوز بنا کر بیٹھی ہو گی۔ کیا سماں ہو گا واہ واہ۔''

میں اپنی منظر کشی پر خود ہی جھوم جھوم گئی۔

سوہنیا بھابھی کا اشتعال دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ ان کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ انہوں نے اچانک مجھ سے غیر متوقع سوال پوچھ لیا۔

''تمہاری بات ہوتی ہے جاسم سے۔''

''بات کیا ہوتی ہے سوائے ون لائنر کے۔ چونکہ وہ میرے بھائی کو شوہدا سا لگتا تھا۔ اس نے مجھے نئی سم نکلوا کر دی تاکہ بس کام کی بات ہو۔ ہم نے گفتگو کی بنیاد ہی نئی سم پر رکھی تھی۔ اگر وہ بندہ پٹڑی سے اترتا تو میں نے اس کو بلاک کر کے عافی کو بتا دینا تھا اور وہ سم بند کروا دیتا۔ اللہ اللہ تے خیر صلا۔'' میں نے جوش میں اپنا راز فاش کر دیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں یکدم چپ کر گئی۔

ادھر سوہنیا بھابھی کو پتنگے لگ گئے۔

''کیوں میرا بھائی ٹھرکی ہے، لچا لفنگا ہے۔ سو رشتے ہیں اس کے لیے لیکن پتا نہیں کیسے وہ تم جیسی چکیلی ڈال پر پھسل گیا۔ ارے توبہ، میرے بھائی کو بھی کوئی اور نظر نہ آئی اور وہی لڑکی اس کے بارے کیسے سوقیانہ گمان رکھے ہوئے ہے۔''

''یہ سب آپ مجھے کیوں سنا رہی ہیں۔'' میں روہانسی ہو کر بولی۔ مجھے ابھی تک یہ معاملہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ''لگتا ہے آپ کے بھائی نے نہیں آنا اس لیے میں جا رہی ہوں۔ آپ جا کر متعلقہ لڑکی کو جو مرضی سنائیں۔ میں تین میں نہ تیرہ میں، خواہ مخواہ کیوں لن ترانیاں سنتی رہوں۔'' میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئے ہائے لڑکی چھری تلے دم لو۔ تم نے مجھے نئی فکر ڈال دی ہے۔ تمہارے گھر والے میرے بھائی کے بارے میں ایسی سوچ رکھتے ہیں جیسے وہ لڑکیوں سے باتیں کرنے کو مرا جا رہا ہے۔ تمہارے گھر والے نہ مانے تو کیا بنے گا اس کا۔''

''ایک منٹ ایک منٹ، آپ کے بھائی کا میرے گھر والوں سے کیا تعلق ہے؟''

''لو جی۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔ اور دوسری طرف ایسا گل کھلا ہے کہ لڑکا اتاولا ہوا جا رہا ہے کہ ایہو کڑی لینی اے۔''

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بعینہٖ یہی جملہ میں نے کچھ دن پہلے اپنی کہانی کے بارے میں سوچا اور یہی بات جاسم افراز نے کہہ دی۔ کیسی غضب کی مماثلت تھی، کیا ذہنی ہم آہنگی تھی۔ دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا واللہ۔ ڈپٹ کر اسے سیدھی راہ دکھائی۔ چپ کر کے بیٹھو دل کہیں کے۔

''گھر والوں کی باری تو بعد میں آئے گی۔ پہلے میں ہی نہیں مانوں گی ہونہہ۔'' میں تنتنا اٹھی۔

''ایسا مت کہو۔ تم خود اتنی اچھی رائٹر ہو تمہیں

نہیں پتا محبت کی کہانیوں میں ہیرو کیسے روتے ہیں۔ ایسے ہی میرا بھائی روئے گا۔ ارے کیسی ظالم مصنفہ ہو کچھ تو خیال کرو۔"

"میں اتنی ہی ظالم ہوں۔ اپنی کہانی میں ہیرو ہیروئین کو سولہ فٹ دور رکھتی ہوں۔ اگر وہ قریب آنے پر تل جائیں تو ان کی محبت کا گلا گھونٹ دیتی ہوں۔"

میری آنکھوں سے شرارے نکلتے دیکھ کر سوہنیا بھابھی ہکا بکا رہ گئیں۔ ابھی وہ کچھ کہتیں کہ علوان آ گیا۔ آنکھیں گول گول گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ جاسم...... بھائی ابھی تک نہیں آئے۔"

اس نے وقفہ لے کر بھائی کا لفظ یوں بولا گویا کونین نگلی ہو۔ سوہنیا بھابھی کلس کر رہ گئیں۔

"کہیں کام پڑ گیا ہوگا۔"

"اچھا اچھا میں سمجھا شاید میڈیا والے اسی طرح وقت ضائع کروانے کے عادی ہوتے ہیں۔"

علوان کا طنز انہوں نے امرت سمجھ کر پیا۔

مجھے یقین ہو گیا تھا بھابھی نے مجھے اپنے بھائی سے متنفر کرنے کے لیے بلوایا تھا مگر اب پانسا پلٹ چکا تھا۔

"تم خیر سے آئے تھے؟ بیٹھو ناں۔"

"نہیں، میں کھیلنے جا رہا ہوں۔ امی نے آپی کو بلا بھیجا ہے کہ آ کر کپڑے دھو لیں۔"

"اچھا عینا! خالہ جی کو بتانا میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں۔"

سوہنیا بھابھی شاید کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھیں۔

میں پاؤں پٹخ کر وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

میں پائنچے اوپر چڑھا کر سر پر دوپٹا باندھے (تاکہ وقت کے وقت ڈھونڈنا نہ پڑے) واشنگ مشین میں چھپڑ چھپڑ کپڑے دھو رہی تھی جب بھابھی کی اشفاق بھائی کے ہمراہ آمد ہوئی۔

"دیکھو شوبز میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ہے اور میرے بھائی کی نظر رکی تو اس سوکھی چرخ پر جو سر پر ڈھاٹا باندھے اور بھی عام سی لگ رہی ہے۔

ستم تو یہ ہے کہ اس کے گھر والے مان رہے ہیں نہ یہ مان رہی ہے۔"

مجھے طیش تو بہت آیا لیکن اشفاق بھائی کی خاطر دوپٹا جھٹک کر اوڑھتی ہوا باورچی خانے میں گھس گئی۔

میں لوازمات میز پر رکھ رہی تھی جب بھابھی نے شیریں لہجے میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"میں عینا کے لیے اپنے بھائی جاسم افراز کا رشتہ لے کر آئی ہوں۔"

"عینا کے لیے پہلے ہی ایک بہت اچھا رشتہ ہمارے زیر غور ہے۔"

ابو کے جواب پر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ یہ کون سا رشتہ تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

میں نے ہونقوں کی طرح بھابھی کو دیکھا۔ ان کے چہرے سے حیرانی مترشح تھی۔ وہ سوچ رہی ہوں گی میرے گھر والے اتنے متنفر ہیں کہ کبھی رضامند نہیں ہوں گے کبھی آنے بہانے سے ٹال رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر امی کے پاس جا بیٹھیں اور مخصوص دبنگ لہجے میں قطعیت سے بولیں۔

"خالہ جی! مجھے یقین ہے عینا کا کوئی بھی رشتہ جاسم کے ہم پلہ نہیں ہوگا۔ میرا بھائی میڈیا پرسن ہے۔ شہرت اس کی باندی ہے۔ اچھا کماتا کھاتا ہے۔ بنگلہ ہے، گاڑی ہے اور آپ کی بیٹی کنہیا اناڑی ہے۔" لہک لہک کر بولتے وہ ان کی زبان بہکی "اوہ سوری! پھسل گئی۔"

اور بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ دوبارہ پرجوش ہو کر امی ابو کو راضی کرنے کی کوشش کرنے لگیں جس پر ابو نے کہہ دیا۔

"جو میری بیٹی کا فیصلہ ہوا، میں اس پر راضی ہوں گا۔"

مجھے منہ کھولتے کے لیے تیار دیکھ کر بھابھی نے پیش بندی کر ڈالی۔

"آہاں، فوراً نہیں کرنا۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

ناچار میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر میرے بھائیوں کی طرف مڑیں۔

”تم دونوں نے جانے کیوں جاسم سے بیر باندھ رکھا ہے۔ دو چار مرتبہ ملو جلو تو شاید تمہاری رائے بدل جائے گی۔“

”دراصل بھابھی! جاسم بھائی نے عافی بھائی کے کان کھینچ کھینچ کر پڑھایا ہوا ہے۔ ان کو وہی زمانہ یاد آجاتا ہوگا۔“ علوان نے مزے سے انکشاف کیا۔

”اور تم کس خوشی میں دشمن بنے بیٹھے ہو؟“ اشفاق بھائی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتا ہوں۔“ اس کے انکساری کے مظاہرے پر محفل زعفران زار بن گئی۔

سوہنیا بھابھی جاتے جاتے میرے پاس رکی تھیں۔

”جاسم کی کال آئے تو سن لینا۔ میں نے اسے تمہارا ذاتی نمبر دے دیا تھا۔ ساری بات سن کر وہ بہت ہنسا تھا۔“

میں خفیف سی ہوگئی۔

☆☆☆

تیری آنکھوں کی سمت وہ دیکھے
جس نے خوابوں میں خواب دیکھے ہوں
اَدھ کھلے آفتاب دیکھے ہوں
تیری آنکھوں کا رمزوہ سمجھے
جس نے ہستی کے بھید کھولے ہوں
دیوتاؤں کے دِل ٹٹولے ہوں
تیری آنکھوں کی وہ کرے پُوجا
کفر جس کا جہاں پہ بھاری ہو
جس پہ بس لااِلٰہ طاری ہو
تیری آنکھوں کو وہ بیان کرے
جو نئے لفظ ڈھال سکتا ہو
اپنی حیرت سنبھال سکتا ہو

میں جاسم افراز کی آواز کی گمبھیرتا میں کھوگئی۔

”جانتی ہو مجھے باجی کو منانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ اپنے بھائیوں کو کچھ زیادہ ہی انوکھا سمجھتی ہیں اور کسی حور پری سے کم پر راضی نہیں تھیں۔ میں نے امی کو سمجھایا کہ ہم عام سے لوگ پریوں کے ناز نخرے نہیں اٹھا سکتے۔ امی سمجھ گئیں پھر باجی کو انہوں نے ہی قابو کیا۔“

مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ بندے کی ظاہری شخصیت کے ساتھ ساتھ بول چال بھی مسحور کن ہے۔

”کچھ کہو گی نہیں؟ اچھا چلو فی الحال مجھے ہی سنو، بعد میں میں سنا کروں گا۔ باجی نے شرط عائد کی ہے کہ میں ان کے اوپر لکھی گئی کہانی پر ڈرامہ بناؤں جس کی رائٹر ہوں گی عینا بی بی۔“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ میں بوکھلا گئی۔

”میں کیسے لکھ سکتی ہوں ان پر ڈرامہ۔ مجھے تو اسکرپٹ لکھنا بھی نہیں آتا۔“

”میں کس لیے ہوں، میں سکھادوں گا یار! اپنی محبت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہم دونوں بیچارے یہ بھی کر گزریں گے۔“

مجھے اس کی بے چارگی پر ہنسی آگئی۔

”ہنسو ہنسو...... مجھے تو لگ رہا ہے ہم اپنی شادی پر کاپی پینسل سنبھالے جاسم پروڈکشن کے نیو پروجیکٹ کے لیے ون لائنر لکھ رہے ہوں گے کیونکہ باجی نے اس کی منظوری کے بغیر میری شادی نہیں ہونے دینی۔“

میں ہنس ہنس کر پاگل ہو رہی تھی۔

”لو بھئی عینا بی بی! آج تک بھابھیاں نندوں کے اعزاز میں پرتکلف عشائیے دے کر اور ان کی خدمتیں کر کے سسرال میں عزت پاتی تھیں۔ تم ہو نئے دور کی نئی بھابھی، جو اپنی نند کے اعزاز میں ایک عدد سٹ کام لکھو گی۔“

میں اپنی سوچ پر مسکرا دی اور سماعتیں جاسم افراز کی طرف مرکوز کردیں جو اپنے الفاظ سے کانوں میں امرت گھول رہا تھا۔

”سوعینا بی بی عرض مدعا یہ ہے کہ آپ ہمیشہ میری زندگی کے ڈرامے کا ون لائنر لکھتی رہیں جس کی پنچ لائن ہو ”مارچ پر بہار ہے۔“

☆☆

سوگوار شو

''صوفی! کھانا اچھا نہیں لاجواب ہونا چاہیے۔ پورے سال بعد اس گھر میں کوئی مہمان آرہا ہے۔ میں ان کی خاطر مدارات میں کسی قسم کی کمی نہیں چاہتی۔''

کچن کی کیبنٹس کھول کر وہ سارا سامان چیک کر رہی تھیں کہ کہیں کوئی چیز کم نہ پڑ جائے۔ اسی وجہ سے صوفی بھی معمول سے زیادہ ایکٹو ہو کر ہاتھ چلا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چار سال پہلے والی مسز فہیم لوٹ آئی ہیں جن کی جان کچن میں بستی تھی۔

''یہ لو میکرونیز کے دو پیکٹ یہاں رکھے تھے۔ بریانی مسالا بھی موجود ہے۔ اب تم فضلو کو بھیجو کہ بازار سے دو کلو چکن اور کلو قیمہ بنوا کر لے آئے۔

رات کھانے میں قیمہ مٹر بنا لینا۔ چکن کل بنا لیں گے۔ ویسے بھی انہوں نے دو مہینے تو رہنا ہی ہے تو اتنے عرصے ان کی پسند کے ہی کھانے بنیں گے۔"

اسے ضروری سامان لکھوا کر وہ اب گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں کہ خود جائزہ لے سکیں کہ کہیں کسی قسم کی کمی تو نہیں ہے۔ کتنے عرصے بعد وہ گھر کے کسی کام میں دلچسپی لے رہی تھیں اور یہ سب کل رات سے ہوا تھا جب ان کی خالہ زاد بہن لبنٰی کی انہیں کال آئی تھی۔ یہ بتانے کے لیے کہ ان کا بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ دو مہینے کے لیے ان کے ہاں رہنے آ رہا ہے۔ اس کا کمپنی کی طرف سے کوئی پروجیکٹ تھا جو دو مہینے چلنا تھا، اسی کے لیے وہ کراچی آ رہا تھا۔

گیسٹ روم ان کے اعلا ذوق کے مطابق تیار تھا۔ ڈبل بیڈ پہ ملٹی رنگ کی بیڈ شیٹ جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ انہوں نے مصنوعی پھول رکھوا دیے تھے۔ کونے میں دو نئے لیمپ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ سامنے ڈریسنگ پہ بھی ایک واز کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وارڈ روب میں نیا تولیہ، نئے ہینگرز سب موجود تھے۔ باتھ روم میں شیمپو، صابن، فیس واش، ٹوتھ پیسٹ سب نئے رکھ دیے گئے تھے۔ کل ہی انہوں نے صوفی سے گھر کی تفصیلی صفائی کروائی تھی۔ ایک نظر ہر چیز پہ ڈال کر وہ مطمئن سی باہر نکل آئی

تھیں۔
لاؤنج میں جاتی راہداری سے گزرتے ان کی نظر آئینے میں خود پہ پڑی تو ٹھہر گئیں۔ اپنے جھریوں بھرے چہرے اور سامنے سے سفید بالوں کو چھوتے ہوئے انہوں نے خود پہ وقت کے تیزی سے گزر جانے کو محسوس کیا تھا۔ ہونٹوں کا وہ گلابی پن جو اتنی عمر کا ہو جانے پہ بھی چار سال پہلے تک قائم تھا، آنکھوں کی چمک، شخصیت کا غرور، سب کھو گیا تھا۔
"آپ اس عمر میں بھی کمال ہیں یار۔" کسی کے الفاظ یاد آنے پہ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ اس لمحے وہ ماضی کی کسی بات کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ ماضی کسی آسیب کی طرح انہیں دبوچ لیتا تھا، اور پھر وہ حال سے کٹ جایا کرتی تھیں۔
"صوفی! یہ سب تصویریں میرے کمرے میں رکھ دو۔" سامنے المباری پہ رکھی، دیوار پہ لگی سب تصویروں کو انہوں نے بغور دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔
صوفی کچن سے نکل کر پہلے یہ کام کرنے لگ گئی۔ مسز فہیم وہیں سامنے راکنگ چیئر پہ بیٹھ کر اسے ان تصویروں کو اتارتے اور اپنے کمرے میں لے جاتا دیکھتی رہیں۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے اور زید نے شام کے چھ بجے تک پہنچ جانا تھا۔ اس وقت کو انگلی کی پوروں پہ گنتے ہوئے وہ رہ جانے والے کاموں کا سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

شام چھ بجے سے پہلے ہی وہ اپنی ایک پرانی ساڑھی پہنے، ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک لگائے، بالوں کا جوڑا بنا کر تیار ہو چکی تھیں۔ گو وہ پہلے سی نہیں لگ رہی تھیں لیکن پھر بھی بہت بہتر لگ رہی تھیں۔ پہلے والی بات رہی ہی کہاں تھی کہ وہ پہلے سی لگ سکتیں۔
"میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا صوفی۔؟" صوفی نے انہیں دیکھ کر ہولے سے مسکراتے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ ان کی کسی بات سے کبھی انکار نہیں کیا کرتی تھی۔ اسے اپنی مالکن کا خود پہ بے قابو ہو کر چلانے کی عادت سے ڈر لگتا تھا۔
اتنے میں گیٹ پہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ باہر کی طرف بڑھیں۔
"میں خود گیٹ کھولوں گی۔"
صوفی نے سر ہلاتے انہیں جانے دیا اور بڑبڑائی۔
"بے چاری باجی۔"
اسے اکثر ان کی حالت پہ ترس آتا تھا۔ مہمانوں کے لیے چائے کی تیاری کرنے وہ کچن میں چلی گئی تھی۔
گیٹ مسز فہیم نے کھولا تو گاڑی اندر زن سے داخل ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے زید نکلا اور دوسری طرف سے اس کی نازک اور بے حد حسین بیوی گود میں دو سالہ بچہ لیے۔ تب تک مسز فہیم گیٹ بند کر کے ان تک آ چکی تھیں۔
"زید...... میرا بچہ۔" اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ بڑے جذب کے عالم میں دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ اس چہرے میں کوئی اور چہرہ تلاش کر رہی تھیں۔
زید بھی گھبرا سا گیا تھا۔ اس کی اب ایسی بھی کوئی دلی وابستگی نہیں رہی تھی ان سے کہ وہ ایسی محبت سے مل رہی تھیں۔ وہ اس کی امی کی خالہ زاد بہن تھیں جن سے وہ پچھلے کتنوں سالوں سے نہ ملا تھا نہ رابطہ کیا تھا۔ بچپن میں بھلے وہ ان کے گھر کافی آتا جاتا تھا لیکن اپنی شادی کے بعد تو اس کا ایک چکر بھی نہیں لگا تھا۔ خود امی کا بھی ان سے ایک لمبے عرصے سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ ہاں کبھی کبھار وہ فون پہ بات کر لیا کرتی تھیں۔ اب زید کا پروجیکٹ تھا کراچی میں تو انہیں مسز فہیم یاد آ گئی تھیں کہ ان کا اتنا بڑا گھر بھلا کس کام آنا تھا۔ کسی کرائے کے گھر یا ہوٹل کے بجائے وہاں رہا جا سکتا تھا یوں گھر کا آرام بھی مل جاتا اور خرچے سے بھی بچا جا سکتا تھا۔

''کیسی ہیں خالہ؟'' کچھ جھجکتے اس نے ان کے ہاتھ پرے کیے تھے اور مرینہ کو دیکھا تھا جو سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے یہی لگا تھا کہ ان کی خاصی انسیت رہی ہے۔
''میں...... ٹھیک...... بس......'' تین وقفے لے کر انہوں نے تین ٹوٹے ہوئے الفاظ میں اپنی خیریت بتائی تھی۔
''یہ میری مسز ہیں۔ مرینہ۔'' اس نے ان کی توجہ مرینہ کی طرف مبذول کروائی۔
مسز فہیم اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھا دیکھا سا لگا تھا۔ اب ہر دوسرے چہرے پہ انہیں یہی گمان ہوتا تھا کہ انہوں نے اسے دیکھ رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے سر جھٹکا۔
''ماشاءاللہ۔'' مرینہ گھوم کر ان کی طرف آئی تھی۔ اسے پیار کر کے ملتے انہوں نے اس کے بیٹے کو بھی چٹاچٹ پیار کیا تھا۔
''کتنا پیارا بچہ ہے تمہارا۔ ماں باپ بھی تو حسین ہیں۔''
زید نے مرینہ کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان کو اپنے ساتھ اندر لاتے وہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ زید یک دم اکتاہٹ کا شکار دکھائی دے رہا تھا اور مرینہ کچھ متذبذب تھی۔
اندر سارے گھر میں ایک ترتیب ہو کر بھی بے ترتیبی نظر آ رہی تھی جوان گھروں میں دکھائی دیتی ہے جو اپنی مالکن کی توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔
''خالہ آپ اکیلی رہتی ہیں اتنے بڑے گھر میں؟'' زید گھر کا تنقیدی جائزہ لیتے پوچھ رہا تھا۔ مرینہ خاموشی سے سارے گھر کو دیکھ رہی تھی۔
''اکیلی کہاں ہوں۔ صوفی رہتی ہے میرے ساتھ۔ وہ میری نوکرانی ہے۔ اس کا ایک بھائی بھی ہے۔ دونوں اچھے بچے ہیں میرے سارے اندر باہر کے کام کر دیتے ہیں۔ اس کا بھائی فضلو ڈرائیونگ کرتا ہے یہیں کسی گھر میں۔ رات کو یہاں رہ لیتا ہے۔ مجھ بڈھی کو سہارا مل گیا اور ان دونوں کو چھت۔'' اس بات کے اختتام پہ وہ کافی دیر بے مقصد ہنستی رہی تھیں۔
مرینہ نے پریشان سا ہو کر زید کو دیکھا جو بیزاری سے مسز فہیم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت جلد ایسے لوگوں سے اکتا جاتا تھا جو اس کے معیار پہ پورا نہیں اترتے تھے۔
''میں دیکھوں صوفی چائے کیوں نہیں لائی۔'' یک دم یاد آنے پہ وہ اٹھ کر کچن کی طرف چل دی تھیں۔
''یہ تو بالکل کھسکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ نجانے مام نے مجھے اس پاگل خانے میں کیوں بھیج دیا؟'' ان کے جاتے ہی زید سر جھٹک کر بڑبڑا رہا تھا۔
مرینہ نے تاسف سے اپنے شوہر کو دیکھا جو سخت ناگواری سے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ مرینہ کو اس گھر میں سوائے بے ترتیبی کے کوئی مسئلہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن یہ سچ تھا کہ مسز فہیم کچھ عجیب سا برتاؤ کر رہی تھیں۔ اسے ان کی ذہنی حالت نارمل نہیں لگی تھی۔ اس عمر میں اکثر بوڑھے ایسے ہو جایا کرتے ہیں، یہ بھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔
کچھ دیر بعد صوفی اندر سے چائے کی ٹرالی گھسیٹ لائی تھی۔ انہیں سلام کر کے وہ انہیں چائے کے ساتھ لائے لوازمات سرو کرنے لگ گئی۔ مسز فہیم زید سے اس کی ماں اور بہنوں کا پوچھ رہی تھیں۔ مرینہ گود میں کسمساتے احد کو فروٹ کیک کھلانے لگ گئی تھی۔
چائے کے دوران وہ خاصا بہتر برتاؤ کر رہی تھیں۔
''تمہاری شادی کو کتنے سال ہو گئے زید؟'' مرینہ نے اس سوال پہ خاموشی سے زید کو دیکھا۔
''تین سال ہوئے ہیں خالہ۔''
زید کا جواب انہیں اداس کر گیا تھا۔ ایک ایسی اداسی جو شاید ہر وقت ان کے چہرے پہ رہتی تھی اور اس گھر کی مکین بھی تھی۔ وہ مرینہ کو دیکھتے بار بار الجھ رہی تھیں۔ نجانے کیوں انہیں اس کی صورت میں کسی

کی شبیہ دکھائی دے رہی تھی لیکن یہی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ شبیہ کس کی تھی۔

"خالہ آپ نے جاب چھوڑ دی۔؟" کچھ یاد آنے پہ زید نے پوچھا تھا۔

"سب چھوڑ دیا بیٹا...... سب کچھ چھوڑ دیا۔ اب کیا کرنا کچھ کر کے۔" ایک گہری دکھ بھری آہ ان کے منہ سے نکلی تھی۔ مرینہ نے کن انکھیوں سے سامنے بیٹھی خالہ کو دیکھا جو اب ماضی میں کھو کر بولے جا رہی تھیں۔

"کس کے لیے کماؤں؟ کس کے لیے نوکری کروں؟ کسی چیز کا مقصد ہی نہیں رہا اب تو۔ بس زندگی گزار رہی ہوں، یہ میری مجبوری ہے۔ تمہاری شادی کو تین سال ہو گئے۔ اس کی شادی کو بھی تین ہی ہو جاتے۔ دو سال کا تمہارا بیٹا ہے۔ شاید اس کا بھی دو کا ہوتا۔"

زید نے اپنی بیزاری چھپانے کی کوشش کی اور پہلو بدلا پھر اس نے مرینہ کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

"خالہ ایک کالج میں پرنسپل تھیں۔"

مرینہ یک دم متاثر سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں لیکن ان کا حال کچھ اور ہی کہتا تھا۔

شاید بڑھاپا ہر ان پڑھ اور پڑھے لکھے کو برابر کر دیتا ہے۔ ڈھلتی عمر میں ہر شے ہی ڈھل جاتی ہے۔ کیا علم، کیا تدبر، کیا حسن، کیا سلیقہ، کیا ذہانت۔

"اب تم لوگ سو جاؤ۔ کافی تھک گئے ہو گئے یہاں پہنچتے ہوئے۔"

"ساڑھے سات بجے کون سوتا ہے خالہ؟ ہم بس آرام کریں گے۔" زید کچھ استہزائیہ مسکرایا۔

"ٹھیک ہے آرام کر لو۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔"

"ابھی اتنا کچھ کھا لیا ہے کہ کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ پلیز کھانے کا انتظام مت کیجیے گا۔ کل میرا فرسٹ ڈے ہے تو میں صبح جلدی نکلوں گا۔ ناشتا ٹائم سے بنوا دیجیے گا بس۔"

انہوں نے سر ہلاتے گیسٹ روم کی طرف ان کی رہنمائی کر دی۔

"یہ تم لوگوں کا کمرہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے اچھا سجا سکوں۔ پتا نہیں کیسا سجا ہے؟" کمرے سے اندر داخل ہوتے وہ پھر سے ہر چیز کو دیکھنے لگیں۔

"مجھے اب اتنا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چیز کہاں رکھنا چاہیے۔ صوفی نے رکھ دیا ہے سب۔ اچھا ہی رکھا ہے...... ہے نا؟" وہ اب مرینہ سے پوچھ رہی تھیں۔ مرینہ نے زبردستی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"سب بالکل ٹھیک ہے خالہ۔"

وہ خوش ہو کر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"تم بہت ہی پیاری ہو۔"

مرینہ پھیکا سا مسکرا دی تو وہ باہر چلی گئیں۔

"سائیکو ہو چکی ہیں یہ۔ میں یہاں دو ماہ کیسے رہ سکتا ہوں بھلا؟" زید نے اپنا کوٹ بیڈ پہ پٹخا۔ "مام کو کم از کم مجھے بتانا تو چاہیے تھا کہ ان کی یہ حالت ہے۔"

"یہ اکیلی کیوں رہتی ہیں؟ میرا مطلب ان کے شوہر، بچے؟" مرینہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے، اپنی بے چینی کو سوال کی صورت دے ڈالی۔ کتنی دیر سے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پوچھے نہ پوچھے۔ کہیں زید اسے ڈانٹ ہی نہ دے۔

"شوہر چھوڑ چکے ہیں ان کو جوانی میں ہی اور ایک ہی بیٹا تھا جو مر چکا ہے۔"

مرینہ یک دم شاکڈ ہو گئی تھی۔

"میرا ہی ہم عمر تھا۔ بلکہ شاید مجھ سے سال دو سال چھوٹا ہو گا۔ چار سال پہلے اس کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ ایسی کھسک گئی ہوں گی۔ ورنہ دیکھنے لائق تھی ان کی پرسنالٹی۔" وہ اتنی بے رحمی سے ان کے لیے یہ سب کہہ رہا تھا اور مرینہ کا دل دکھی ہو رہا تھا۔

"جوان اولاد کی موت ایسا ہی حال کر دیتی ہو

گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب شوہر بھی چھوڑ جائے۔" اس سوچ پہ اس نے تڑپ کر احد کو دیکھا جو بیڈ پہ بیٹھا موبائل پہ نظمیں سن رہا تھا۔

☆☆☆

صبح زید ناشتا کرتے ہی جلدی نکل گیا تھا۔ اس کی پروجیکٹ سائٹ یہاں سے گھنٹے کی مسافت پہ تھی اور کراچی کے رش کا حال وہ جانتا تھا۔ زید کے جانے کے بعد مرینہ تسلی سے ناشتا کرنے لگی۔

"تمہیں یہاں کسی قسم کی بے آرامی تو نہیں ہوئی؟" مرینہ ناشتا کر رہی تھی اور مسز فہیم اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

"بالکل بھی نہیں۔" وہ بہ مشکل مسکرائی۔ "بہت اچھا گھر ہے آپ کا اور لان بھی پیارا ہے۔" وہ دل سے کہہ رہی تھی۔ اس کی بات پہ وہ کھل اٹھی تھیں۔

"یہ گھر میرے ابو نے بہت شوق سے بنوایا تھا۔ ایک ہی بھائی ہے میرا، وہ باہر ہوتا ہے اپنی فیملی کے ساتھ۔ اسی لیے میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ بہت بار اسے کہا ہے کہ یہاں آجاؤ لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ اب یہاں سیٹ نہیں ہو سکتا۔ گھر بھی اس نے میرے نام کر دیا ہے...... اور میں اتنے بڑے گھر کا اب کیا کروں گی۔ کتنا جیوں گی۔" ٹھہر ٹھہر کر وہ کہہ رہی تھیں۔ مرینہ کو ان پہ ترس آنے لگا تھا۔

"تم زید کے ساتھ خوش تو ہو نا؟" اس سوال پہ مرینہ کے ناشتا کرتے ہاتھ تھمے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ نچڑ گیا تھا۔ گلے میں ایک نمکین گولا اس نے دھکیلا تھا اور ہلکی سی 'ہوں' کی تھی۔ یک دم ناشتا بدمزا لگنے لگا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چائے کے چند گھونٹ بھرے اور اٹھ گئی۔

"میں احد کو دیکھ لوں۔" وہ تیزی سے کمرے میں چلی آئی تھی۔ احد سو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پہ آئے بالوں کو مرینہ نے پیچھے کیا اور کھڑکی تک آئی۔ پردے ہٹا کر باہر دیکھا تو سارا لان دکھائی دیتا تھا۔ لان بے رنگ پڑا تھا حالانکہ وہاں خاصی تعداد میں گملے موجود تھے لیکن سب پودے مرجھائے ہوئے تھے۔ شاید کبھی وہ ایک بہت خوب صورت لان رہا ہوگا کیونکہ ابھی بھی وہ اچھا خاصا تھا۔ لان کی مرجھائی گھاس پہ ماضی کی ایک یاد ابھری تھی۔

"خوب صورت لڑکیاں میری کمزوری ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خوب صورت لڑکی کے روپ میں اپنی بیوی کو سر پہ بٹھا لوں۔ مجھے بیوی اس کی اوقات میں ہی پسند ہے۔" وہ پڑھا لکھا سول انجینئر زید عابد تھا جو اس کا شوہر تھا اور شادی کے تیسرے دن وہ اس سے محبت کے اظہار کے بجائے یہ کہہ رہا تھا۔

"کوشش کرنا مجھے خوش رکھ سکو۔ میری پسند نا پسند کا خیال رکھو۔" مرینہ جیسی شوخ لڑکی پہلے ہی دن کملا کر رہ گئی تھی۔

"مجھے تابع دار بیوی بہت پسند ہے۔ شوہر کو خوش رکھنے والی، اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی۔ مجھے امید ہے تم ایسی ہی ہوگی۔"

اور اس نے ان تین سالوں میں اپنی پوری کوشش کی تھی لیکن پھر بھی زید اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ تھک گئی تھی یہ جانتے جانتے کہ آخر اسے خوش رکھنے کے لیے وہ ایسا کیا کرے۔ اب احد کے بعد اس نے یہ کوششیں خاصی کم کر دی تھیں کیونکہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بس اپنی ذات سے خوش رہنے والا بندہ ہے۔ دوسرے جتنے بھی پرفیکٹ کیوں نہ ہوں اسے کبھی مطمئن نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

احد کو ناشتا کروا کر وہ باہر لان میں لے آئی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا تھا وہاں ایسا کوئی لان نہیں تھا اور گھر میں جس ایک چیز کی اس کی خواہش تھی وہ لان ہی تھا۔ احد اپنے کھلونے لیے لان میں کھیلنے لگا تھا اور مرینہ وہیں ایک طرف لان میں جاتی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نظریں احد پہ جمی تھیں جب ہی مسز فہیم اندر سے فروٹ کی باسکٹ لیے باہر آئی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی۔ وہ وہیں قریب میں بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ایک اچھی

میزبان تھیں تبھی بار بار ان دونوں کے آرام اور کھانے پینے کا اتنا خیال کر رہی تھیں۔

"بہت کم باہر نکلتی ہوں میں۔ دل نہیں چاہتا یہاں آنے کا۔ یہاں آؤں تو دل گھبراتا ہے میرا۔" باسکٹ ایک طرف رکھ کر اب وہ پلیٹ گود میں رکھے اس میں سیب کاٹ کر رکھ رہی تھیں۔ ساتھ احد کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ مرینہ کو لگا تھا وہ کافی عرصے بعد مسکرا رہی ہیں۔

"پہلے ہمارے لان میں آؤٹ ڈور چیئرز بھی رکھی ہوتی تھیں۔ اب اٹھوا دی ہیں۔ جب بیٹھنا نہیں ہوتا تو کرسیاں رکھ کر کیا کرنا۔" سیب کی قاش اس کی طرف بڑھاتے وہ کہہ رہی تھیں۔

مرینہ نے احد کو دیکھا اور ساتھ اسے چند تاکید کیں جو مائیں بچوں کو کرتی ہیں۔

"تم زید کے ساتھ خوش نہیں لگتیں؟ تین سالوں میں کوئی شادی شدہ جوڑا اتنا بیزار تو نہیں ہوتا جتنا تم دونوں ہو۔"

وہ جو سمجھ رہی تھی کہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے تو وہ کچھ کچھ غلط تھی۔ ان کی ذہنی حالت جیسی بھی تھی وہ ٹھیک بات تک پہنچ ہی گئی تھیں۔ کوئی اندھا بھی جان جاتا کہ وہ دونوں کیسے میاں بیوی ہیں۔ ان کا آپس کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی کیسی جا رہی ہے اور بہر حال مسز فہیم اندھی نہیں تھیں۔

مرینہ خاموش رہی تھی۔ اسے اس ٹاپک پہ وضاحتیں دینا پسند نہیں تھا۔ ہم لوگوں کی سوچ نہیں بدل سکتے۔ وضاحتیں ان کے شکوک کو کم نہیں کرتیں بلکہ مزید پختہ کرتی ہیں۔ لوگ وہی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں پھر خواہ مخواہ خود کو ہلکان کیا کرنا۔

"میرے شوہر اور میرے درمیان کا تعلق بھی ایسا ہی تھا۔ روکھا پھیکا، بے رنگ، کسی ان چاہے رشتے جیسا، فوراً سے سب کی نظروں میں آجاتا تھا۔ انہیں پہلے سے کسی سے محبت تھی اسی لیے شادی ہو جانے پہ بھی اس سے رابطے میں رہے تھے۔ میں تو ان کی امی کی خواہش پہ ان کی زندگی میں آئی تھی۔ پھر میں نے ہی بیٹی کی پیدائش کے بعد انہیں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لیں لیکن ناجائز تعلق مت رکھیں۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور شادی کر لی۔ میں نے ظرف بڑا کیا تھا اسی لیے انہیں شادی کی اجازت دے دی لیکن اس کا ظرف بہت چھوٹا تھا۔ آنے سے پہلے ہی مجھے نکلوا دیا گھر سے۔ میں اپنے ایک سال کے بچے کو گود میں لیے ابو کے گھر آ گئی اور ابو نے بھی مجھے گلے سے لگا کر رکھ لیا۔ پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھا میں نے۔ اس نے بھی نہیں پوچھا کہ مر گئی ہو یا زندہ ہو۔ نہ بیٹے سے ملنے کی کسی خواہش کا اظہار کیا۔ ایسے انسان کے پاس لوٹ کر کیا جانا تھا جو اپنی زندگی میں خوش تھا اور ہمیں بھول گیا تھا۔"

اپنی داستان سناتی اس عورت کی آنکھوں میں بہت ویرانی تھی۔ ایسی ہی ویرانی اس گھر میں بھی تھی جو مرینہ کو اپنے اندر اترتی محسوس ہوتی تھی۔

"فہیم نے مجھے طلاق نہیں دی، نہ میں نے لی تھی لیکن بس ہمارا رشتہ ایسے ہی ختم ہو گیا۔ اتنی ہی خاموشی سے جس خاموشی سے وہ بنا تھا۔" انہوں نے سیب کی قاشیں اس کی طرف بڑھائیں۔ مرینہ نے ایک اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

"شکر ہے میرے پاس میرا بیٹا تھا ورنہ میں کیسے زندگی گزارتی۔"

ان کی بات پہ مرینہ نے احد کو دیکھا۔ ایسا ہی شکر وہ بھی احد کو دیکھ کر کیا کرتی تھی جب زید کی لاپروائی اسے بہت کرلاتی تھی۔

"زید بھی کسی اور کو پسند کرتا ہے؟" اب وہ مرینہ کو دیکھتے پوچھ رہی تھیں۔ مرینہ نے فوراً سے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی کو بھی نہیں۔"

اس کا جواب سن کر وہ طنزاً مسکرا دیں۔

"کسی کو پسند نہ کرتا ہوتا تو تم پہ جان دیتا بیٹا۔ ایسی پیاری صورت تو نظریں ہٹانے ہی نہیں دیتی۔"

اس کی موہنی صورت دل میں اتر جانے والی تھی۔ لیکن مرینہ جانتی تھی کہ ایسی صورتیں بھی کسی کے دل میں نہیں بھی اترا کرتیں اور وہ بہت لوگوں کے دل میں نہیں بھی اتری تھی۔ اس نے گہری سانس بھری۔

اب مسز فہیم اٹھ کر احد کے ساتھ کھیلنے چلی گئی تھیں۔ انہیں بچے پسند تھے لیکن ان کے آس پاس کوئی بچہ تھا ہی نہیں جس کے ساتھ وہ کھیلتیں۔

احد کو دیکھتے ہوئے چہرے گڈمڈ ہونے لگے اور وہاں اب ایک نیا منظر ابھر رہا تھا۔

گہرے نیلے رنگ کے لباس میں بال کھولے وہ ڈارک سا میک اپ کیے اپنی ساس کی تاکید کے مطابق بہت شاندار تیار ہوئی تھی۔ اس کی نندوں نے بھی اسے خاص طور سے سراہا تھا۔ آج زید کے تایا ابو کے گھر دعوت تھی۔ پورا گھرانہ ہی انوائیٹڈ تھا۔ وہ سب تیار ہو کر زید کے آفس سے لوٹنے کا ہی انتظار کر رہے تھے اور جب وہ لوٹا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ آتے ہی اس نے اپنا آفس بیگ سامنے صوفے پہ اچھالا اور جوتے وہیں دائیں بائیں اتار کر پھینکے۔ وہ غصے کا تیز تھا اسی لیے جب وہ ایسے موڈ میں گھر آتا تو کوئی اس سے وجہ نہیں پوچھتا تھا۔

''میرا آفس کا لنچ کس نے بنایا تھا؟'' وہ دھاڑا تھا۔ مسز ہمدانی جو سامنے صوفے پہ ہی بیٹھی تھیں انھوں نے ڈری سہمی مرینہ کی طرف دیکھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھیں کہ آج کا لنچ مرینہ نے تیار کیا تھا کیونکہ اب یہ اس کی ذمہ داری تھی۔

''جب آپ جانتی ہیں کہ مجھے آملیٹ نہیں پسند تو کیا ضرورت تھی میرے سینڈوچ میں چیز آملیٹ ڈالنے کی؟'' سامنے رکھی ایش ٹرے اس نے زمین پہ پٹخی تو مرینہ کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی تھی۔

''آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' انہوں نے بہو کو کور کیا تھا کیونکہ بیٹے کی خصلت سے وہ واقف تھیں۔

''ابھی بھی ایسا کیوں ہوا؟'' نجانے کیسے وہ خود سمجھ گیا تھا کہ مرینہ سے ایسی غلطی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اس کی جانب مڑا تھا۔

''اس نے بنایا تھا نا؟''

مسز ہمدانی فوراً اس کے سامنے آگئیں۔

''کہا نا آئندہ میں دھیان رکھوں گی۔ تمہاری ساری پسند ناپسند اسے بتا دوں گی۔ نہیں ہوگا ایسا۔ اب جاؤ اور جا کر ڈنر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔'' یہ وقت نہیں تھا کہ وہ معاملے کو طول دیتیں۔ اس لیے انہیں اسے بخوبی ہینڈل کرنا تھا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔''

''زید فضول باتیں مت کرو اور جا کر تیار ہو جاؤ۔ تم جانتے ہو تایا ابو مائنڈ کریں گے اگر تم نہ گئے تو......'' وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے پہ آگئی تھیں۔

''کیا سوچ کر آپ اس لڑکی کو میری زندگی میں لائی ہیں۔ آخر کون سی خوبیاں اس میں آپ کو دکھائی دی ہیں؟ نہ یہ میرے کپڑوں کا دھیان رکھ سکتی ہے۔ نہ میری چیزوں کا......اور تو اور میرے کھانے پینے کا بھی اسے نہیں پتا۔ ایسی ہوتی ہیں بیویاں، اتنی لاپروا اور سست مزاج۔''

مرینہ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا یہ سب تو شادی کے دو دن بعد سے ہوتا آ رہا تھا۔ کبھی اسے اس کی کیا بات بری لگتی تھی تو کبھی کیا۔

''تمہیں ایک بے حد خوب صورت بیوی چاہیے تھی وہ تمہیں مل گئی۔ اب کیا چاہتے ہو؟''

''خوب صورتی کے سوا اس میں کچھ ہے بھی نہیں۔'' وہ طنزیہ ہنسا تھا۔

''تمہیں تو ویسے بھی کچھ نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اس بچی میں وہ سب ہے جو تم جیسے منہ زور انسان کی بیوی میں ہونا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ یہی تمہارے ساتھ اچھے سے گزارا کر سکتی ہے۔ اب جاؤ اور تیار ہو جاؤ ورنہ میں تایا ابو کو کال کر کے بتا رہی

ہوں کہ ہم میں سے کوئی نہیں آ رہا۔" اسے اپنا فیملی میں اچھا امیج بنائے رکھنے کا خبط تھا اسی لیے وہ اس دھمکی پہ اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے تیار ہونے چلا گیا تھا۔

مرینہ کو مسز ہمدانی نے ساتھ لگا کر تھپکا تھا۔

"یہ غصے میں ایسے ہی پاگل ہو جاتا ہے بیٹا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تم پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن وہ اپنی ساس سے کہہ نہیں سکی کہ یہ پاگل پن اس کی ذات کا حصہ ہے۔ وہ ہمیشہ غصے میں ہی ایسے پاگل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ نارمل حالت میں بھی ایسی اور اس سے کہیں بری باتیں اس سے کرتا تھا جو بتانے لائق بھی نہ تھیں۔

احد نے فٹبال اس کے پاؤں پہ ماری تو وہ چونکی۔ اس نے فٹبال واپس اس کی طرف اچھالا۔

شادی کے تین سال بعد بھی اس کی ساس کے اتنا ساتھ دینے کے باوجود بھی سب ویسا ہی تھا۔ نہیں بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اب زید کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔ اب اس کا بیٹا ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔

☆☆☆

رات کھانے کی میز پہ مسز فہیم نے مرینہ سے زید کی پسند پوچھ کر کھانا بنوایا تھا۔ کھانا بہت اچھا بنا ہوا تھا لیکن زید بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ اسے کسی کسی کے ہاتھ کا ذائقہ پسند آتا تھا۔ تین سالوں میں مرینہ کی بنائی کوئی ایک ڈش بھی اسے پسند نہیں آئی تھی حالانکہ سارا خاندان اس کے کھانے کی تعریف کرتا تھا۔ وہ مرینہ کے ہاتھ کا بنا سب کچھ کھا لیا کرتا تھا لیکن تعریف کبھی نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں بیوی کی تعریف کرنے کی عادت ہی نہیں ہوتی یا انہیں یہ نہیں پتا ہوتا کہ بیوی کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ مرینہ کو تو اس کی عادت کا پتا تھا اسی لیے خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ البتہ مسز فہیم اسے بار بار کھانا پیش کر رہی تھیں۔ کبھی کوئی ڈش کبھی کوئی اس کے سامنے رکھ رہی تھیں اور وہ منع کر رہا تھا۔

"خالہ! میں رات کے وقت اتنا نہیں کھاتا۔" بالآخر وہ اکتا کر بول پڑا تھا۔ گھر میں ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ مجھے یہ کھانا نہیں پسند۔ اور کچھ اور بنوا لیتا لیکن یہاں اس کی مجبوری تھی۔ وہی دوسروں کے سامنے اچھا بننے کی عادت۔

"چلو جتنا کھانا چاہو کھا لو۔" شاید انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ تنگ پڑ رہا ہے تب ہی وہ کھسیا کر اب احد کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور اسے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں توڑ کر دے رہی تھیں۔

"تمہارے سب بھائیوں کی شادیاں ہو گئی ہیں؟" زید نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"میرا کوئی بھائی نہیں ہے خالہ۔ دو بہنیں ہیں۔ جن میں سے ایک کا نکاح ہوا ہے اور دوسری ابھی پڑھ رہی ہے۔"

انہوں نے جیسے یاد کر کے سر اثبات میں ہلایا۔ نجانے کیوں انہیں لگا تھا کہ اس کے اور بھائی بھی ہیں۔ پھر مرینہ پہ نظر پڑی جو کھانے میں چمچہ چلاتے ہوئے جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پھر ٹھٹکیں۔

"پتا نہیں مجھے پہلے روز سے کیوں لگ رہا ہے کہ اس بچی کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بس یاد نہیں آ رہا مجھے کہ کہاں دیکھا ہو گا۔" وہ کہے بنا رہ نہیں سکیں۔

زید اور مرینہ کی نظریں ملی تھیں۔ پھر زید نے ان کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔

"شادی کی تصویروں میں دیکھا ہو گا خالہ۔" وہ اب چاول ڈال رہا تھا۔

"تم یہیں کراچی کی ہو؟" مرینہ چونکی تھی۔

"نہیں لاہور کی ہوں میں۔" وہ زید کو دیکھتے ہوئے پھر خالہ کو دیکھنے لگی۔

"اچھا مجھے لگا کہ یہاں کی ہو۔ سوچا کیا پتا میرے کالج میں پڑھتی رہی ہو گی اسی لیے دیکھی دیکھی لگتی ہو۔"

زید اب لاتعلقی سے کھانا کھاتے موبائل پہ کوئی میسج کر رہا تھا۔ مرینہ کچھ کہنے لگی تھی پھر خاموش ہو گئی۔

رات کمرے میں لوٹنے کے بعد زید کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ آفس کے پاس کوئی گھر رینٹ پہ دیکھ لوں۔ دو ماہ کیسے خالہ کے ساتھ رہا جا سکتا ہے۔ بہت فالتو باتیں کرتی اور دماغ کھاتی ہیں۔ ویسے بھی مجھے یہاں سے آفس بہت دور پڑتا ہے۔''

''دو ماہ کی ہی تو بات ہے اور ویسے بھی آپ تو سارا دن آفس میں ہوتے ہیں۔ رات کو ہی ملاقات ہوتی ہے۔''

مرینہ کو خالہ بری نہیں لگی تھیں۔ دو دن میں ہی اسے ان سے ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارے، ان کا خیال رکھے۔ یوں شاید وہ ٹھیک ہو جائیں یا کم از کم کچھ بہتر محسوس کرنے لگ جائیں۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ تنہائی کا شکار ہیں اسی لیے ایسی ہو گئی ہیں۔

''تم تو یہیں ہوتی ہو نا۔'' وہ اسے بھی یہاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ان کے ساتھ رہنے میں۔ ویسے بھی گھر رینٹ پہ لیں گے وہ بھی فرنشڈ تو خرچا زیادہ ہوگا۔ پھر ملازم بھی رکھنا پڑیں گے۔ اور اس دور میں اجنبی شہر میں بھلا کہاں قابل بھروسا ملازم ملتے ہیں۔'' وہ صاف نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ یہیں رہنا چاہتی ہے اسی لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تو اسے بنانا ہی تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' زید پھر اپنے موبائل پہ مصروف ہو گیا تھا۔ مطلب وہ مان گیا تھا یہاں رہنے کے لیے حالانکہ وہ اتنی آسانی سے ماننا نہیں تھا۔ مرینہ اب احد کو سلانے لگ گئی تھی۔

☆☆☆

پھر مرینہ نے کھانے کی ذمہ داری خود لے لی تھی۔ زید اس کے ہاتھ کا کھانا کم از کم اعتراض کیے بنا کھا لیتا۔ صوفی کا کھانا وہ پیٹ بھر کر نہیں کھاتا تھا اور رات کمرے میں جا کر پھر اسے بھوک لگ جاتی تھی۔ پھر مجبوراً مرینہ کو ہی آدھی رات کو اٹھ کر کچھ بنانا پڑتا تھا۔ ویسے بھی سارا دن وہ بور ہو جاتی تھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے۔ سو مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔

''تم تو مہمان ہو۔ کچن میں کام کیسے کر سکتی ہو؟'' اسے کچن میں کھڑا دیکھ کر مسز فہیم گھبرا گئیں۔

''مہمان تین دن کا ہوتا ہے خالہ، اور اب تین دن گزر چکے ہیں۔'' وہ محبت سے کہہ رہی تھی۔ مسز فہیم پھر بھی مطمئن نہیں تھیں۔

''لیکن زید کیا کہے گا بیٹا؟ میں نے اس کی بیگم کو کام سے لگا دیا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''کچھ بھی نہیں کہیں گے وہ۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے اور آج میں ڈنر میں لزانیہ بنانے والی ہوں۔ زید کو بہت پسند ہے۔'' صوفی کے ساتھ مل کر اس نے تھوڑی بہت تیاری کر لی تھی۔ مسز فہیم وہیں کرسی لے کر بیٹھ گئی تھیں اور اس سے اپنی کوکنگ کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ اس سے دنیا جہاں کی باتیں کرتی تھیں لیکن نہ تو اپنے شوہر کے متعلق کوئی بات کرتی تھیں نہ ہی بیٹے کے متعلق۔

پھر اس نے مسز فہیم کی اجازت سے صوفی کو ساتھ لگا کر لاؤنج اور ڈرائنگ کی سیٹنگ بھی کچھ تبدیل کی تھی۔ مسز فہیم کو یہ دیکھ کر بہت اچھا لگا تھا کہ وہ انہی کی طرح گھر کو سجانے سنوارنے کی شوقین تھی۔ اسے دیکھتے وہ سوچ رہی تھی کہ ان کی اپنی بیٹی یا بہو ہوتی تو وہ بھی بالکل ایسی ہی ہوتی۔

''تم تو بہت پڑھی لکھی بچی ہو لیکن تمہیں گھر سجانے کا کتنا شوق ہے۔'' وہ اس کے اعلا ذوق کو داد دیے بنا رہ نہیں سکی تھیں۔ مرینہ مسکرا دی۔ اس وقت وہ بالکل ماسیوں والے حلیے میں زمین پہ بیٹھی پانی پی رہی تھی۔ مسز فہیم اسے محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ بالکل ایسی بہو کی انہیں خواہش تھی لیکن ایسی بہو ان کے نصیب میں نہیں تھی۔

"میں نے پڑھائی بس ابو کا شوق پورا کرنے کے لیے کی تھی خالہ۔ ورنہ مجھے تو گھر داری کا ہی شوق تھا۔" وہ بڑی بے تکلفی سے بتا رہی تھی۔

"اور کیا کیا شوق ہیں تمہیں۔؟" وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے پوچھ رہی تھیں جواب آنکھیں پٹپٹا کر اپنے شوق گنوا رہی تھی۔

"موویز دیکھنا، کتابیں پڑھنا، گھومنا پھرنا۔" اس جملے کے اختتام پہ دونوں کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ مرینہ نے اپنے سب ہی وہ شوق گنوائے تھے جو وہ شادی سے پہلے رکھتی تھی۔ شادی کے بعد کے یہ بھی شوق زید کے غصے کی نذر ہو چکے تھے۔

مسز فہیم کو بہت کچھ یاد آ گیا تھا اسی لیے وہ اداس ہو گئی تھیں۔ یہ سارے شوق ان کا بیٹا ان کی بہو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بیٹا جو اب اس دنیا سے جا چکا تھا۔

"تم اب ریسٹ کرو۔ میں بھی اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ اس وقت وہ اکیلی رہنا چاہتی تھیں۔

مرینہ کو جاتی ہوئی مسز فہیم کی پشت دیکھتے کچھ یاد آیا تھا۔

"یہ موویز دیکھنا، کتابیں پڑھنا، گھومنا پھرنا فارغ لوگوں کا شوق ہوتا ہے۔ نہ مجھے ایسے شوق پسند ہیں اور نہ ہی ایسے فارغ لوگ۔" یہ زید تھا جو شادی کے ہفتے بعد کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی ایک ہفتے میں ہی مسز فہیم سے خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ مسز ہمدانی کو فون پہ ان کی حالت کے بارے میں بتا چکی تھی۔ انہوں نے خاص تاکید کی تھی کہ وہ مسز فہیم کا خیال رکھے۔ وہ نہ بھی کہتیں تو بھی وہ ان کا خیال رکھ رہی تھی۔ اس عورت میں نجانے کیوں اسے اپنا مستقبل دکھائی دیتا تھا اور وہ ڈر جاتی تھی۔ اگر ایسا کچھ اس کے ساتھ ہو تو وہ کیا کرے گی۔ وہ تو اس سے بھی بری حالت کا شکار ہو جائے گی۔ شوہر کی بے پروائی کسی بھی عورت کے لیے سب سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور ایسے میں اس کے رستے زخموں پہ اولاد کی محبت دوا کا کام کرتی ہے۔ مسز فہیم کی وہی اولاد جوان کے دکھوں کی دوا تھی، چھن گئی تھی۔

وہ احد کو کھانا کھلاتے ہوئے ساتھ ساتھ کوئی کہانی سنا رہی تھی، کسی ایک آدھ بات پہ بیچ میں ٹوک بھی رہی تھی۔ مسز فہیم سامنے کرسی پہ بیٹھے ہوئے سب دیکھ رہی تھیں۔ انہیں مرینہ کی جگہ اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھی بالکل اسی طرح بنٹی کو نوالے بنا کر کھلایا کرتی تھیں حتیٰ کہ وہ کالج میں آ گیا تھا تو بھی انہوں نے اپنی اس عادت کو جاری رکھا تھا۔

"مائیں بیٹوں سے بہت اٹیچ ہو جاتی ہیں، اتنا زیادہ کہ ان کے حصے کی سانس بھی خود لینا چاہتی ہیں۔ غلط کرتی ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ ایک عرصے بعد انہیں جیسے کوئی سامع ملا تھا جس سے وہ اپنی سالوں کی ان کہی باتیں کر لینا چاہتی تھیں۔ اپنا سارا حال دل کہنے کو بیتاب تھیں۔

"میں نے بھی اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنے بیٹے کو خود سے اتنا اٹیچ کر لیا کہ میں اسے کپڑے تک اپنی مرضی سے نہیں پہننے دیتی تھی۔ میں بھول ہی گئی تھی کہ میں اس کی شخصیت کو کمزور بنا رہی ہوں۔ لڑکوں کو تو آگے چل کر ایک گھر کی ذمہ داری اٹھانا ہوتی ہے۔ کسی کی بیٹی بیاہ کر لانا ہوتی ہے۔ اسے مضبوط ہونا چاہیے۔ اس کی قوت فیصلہ مضبوط ہونا چاہیے لیکن میں یہ سب بھول گئی۔ ہم جیسی مائیں جو شوہر سے دھتکاری جائیں یا بیوہ ہو جائیں وہ بیٹوں میں ہی پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ ان کو پلو سے باندھ لیتی ہیں۔ ہم بہت غلط کرتی ہیں۔ اپنے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔ جب بیٹوں کی شادی کا موقع آتا ہے تو ہم نہیں چاہتیں کہ وہ ہماری مرضی کے خلاف جائیں۔"

مرینہ خاموشی سے انہیں سن رہی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ احد اور اس کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔

وہ احد کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی تھی جس کے گرد اس کی زندگی گھومتی ہے۔ لیکن وہ کیا کرتی کہ ایک یہی رشتہ اسے اپنا لگتا تھا۔

"اگر وہ زندہ بھی ہوتا تو جتنی میں اس کے لیے پوزیسو تھی، اس کی شادی کے بعد شاید ڈپریشن میں چلی جاتی یا اس کی ازدواجی زندگی کو خراب کر دیتی۔"

مرینہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"آپ ایسے کیوں سوچ رہی ہیں؟"

"ایسے ہی ہے۔ جب ہم جیسی مائیں بہوئیں لاتی ہیں تو ساتھ ہی ان سیکیور بھی ہو جاتی ہیں کہ وہ ہمارا بیٹا ہم سے دور کر دے گی۔ ہم اپنی محبت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتیں۔ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں کسی اور کے لیے محبت دیکھنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ہم اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگتی ہیں۔ جس محبت پہ اتنے سال ہماری اجارہ داری رہی ہوتی ہے وہ کسی اور کی جھولی میں ڈال دینا بڑا مشکل امر ہوتا ہے اور یہی کام ہم ڈھنگ سے نہیں کر پاتیں۔"

مرینہ کو بہت کچھ یاد آ گیا تھا جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس نے سر جھٹکا۔

"خالہ! آپ ہمارے ساتھ لاہور چلیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ کہہ رہی تھی حالانکہ جانتی تھی کہ زید یہ بات پسند نہیں کرے گا لیکن وہ اپنی ساس کے ذریعے یہ کام کروا سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ لاہور میں کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے ان کا علاج کروائے۔ وہ ٹھیک ہو سکتی تھیں بس تنہائی کا شکار تھیں۔ انہیں انسانوں کے ساتھ کی ضرورت تھی اور اسی چیز کی ان کی زندگی میں کمی رہی تھی۔

"اپنا گھر چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی ہوں؟" وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔ انہیں بھی مرینہ اور احد سے بے حد انسیت ہو گئی تھی۔ اندر سے وہ ان کا ساتھ چاہتی تھیں لیکن ساتھ جاتے ہوئے ڈر رہی تھیں۔ جس رشتے سے بھی وہ محبت کرنے لگتی تھیں ان سے چھن جاتا تھا۔

"کچھ عرصے کے لیے ہی سہی۔ چینج ہو جائے گا۔ وہاں سب ہوں گے تو آپ بہتر محسوس کریں گی۔" اس کی بات پہ وہ خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

اس روز مسز فہیم اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھیں۔ صوفی سے اسے پتا چلا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ وہ ان کے کمرے کی طرف بڑھی تو صوفی نے ٹوک دیا۔

"بی بی مت جائیں۔ وہ ڈانٹ دیں گی۔ آج وہ اکیلے رہنا چاہتی ہیں۔" مرینہ نے مڑ کر صوفی کو دیکھا۔

"کیوں آج ایسا کیا ہے؟"

"آج ان کے بیٹے کی برسی ہے۔"

مرینہ کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے کمرے کا دروازہ کھول کر بنا اجازت اندر چلی آئی تھی۔ مسز فہیم اپنے بستر پہ آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے بستر پہ کئی پرانے البم بکھرے پڑے تھے۔ کئی پینٹ شرٹس اور کئی کتابیں۔ کچھ پرفیومز کی بوتلیں، کچھ موزے اور ٹائیاں۔ وہ آج اپنے بیٹے کا ماتم منا رہی تھیں۔ ایک پل کو اس کا دل کیا کہ وہ یہاں سے چلی جائے لیکن پھر اس نے نہ جانے کا فیصلہ کرتے ان کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے قریب بستر پہ بیٹھ کر اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھتے پکارا۔

"خالہ......" وہ تڑپ کر سیدھی ہوئیں۔

مرینہ نے ان کے آنکھوں میں زندگی کو مرتے دیکھا تھا۔ وہ کسی زندہ انسان کی آنکھیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اتنی مردہ، اتنی ویران۔ وہ خالہ بالکل نہیں لگ رہی تھیں جن سے وہ روز ملتی تھی۔

"وہ چلا گیا مجھے چھوڑ کر۔ جیسے اس کے باپ نے مجھے اکیلا کیا، وہ بھی کر گیا۔ اس نے میرا نہیں سوچا۔ ایک لڑکی کے لیے اس نے یہ سب کیا۔"

مرینہ نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن انہوں نے اس کا

بڑھا ہاتھ جھٹک دیا۔

"دو سال کی محبت کو اس نے ماں کی محبت پہ ترجیح دی۔ ایک لڑکی کے لیے مجھ سے لڑائی کی۔ اس کے لیے مجھے تنہا کر دیا۔" وہ اب بلند آواز ... نے لگی تھیں یہ مرینہ کی نظر ان کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑی اور وہ ٹھٹکی۔ وہاں ایک خوبرو نوجوان زندگی سے بھرپور مسکراہٹ لیے، شرارتی آنکھوں سے اپنی ماں کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس کی ماں اس کے پہلو میں اتنی حسین لگ رہی تھی کہ وہ نظریں ہٹانا بھول گئی تھی۔ اتنی مکمل تصویر، اتنی حسین تصویر اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔

"کاش کہ اس دن میں نے اسے غصے میں نہ جانے دیا ہوتا۔ کاش میں مان گئی ہوتی اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ چلا جائے گا۔ کاش میں ایک دفعہ ہی اس لڑکی سے مل لیتی تو شاید آج میرا بیٹا زندہ ہوتا۔ کاش کہ میں نے اس کی ضد کے آگے اپنی ضد نہ رکھی ہوتی۔"

"یہ......" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

"میرا ابنی۔ میرا بیٹا۔" وہ تصویر سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔

مرینہ پتھرائی نظروں سے کھڑی ہوئی اور منہ پہ ہاتھ رکھے، بھاگتے ہوئے، ان کے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

شاہ ویز اور اس کی دوستی انجینئرنگ کے دوسرے سال میں ہوئی تھی۔ ایک پروجیکٹ میں سر شمسی نے ان کا اکٹھا گروپ بنا دیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو بس ان کی ہیلو ہائے ہی تھی۔ پروجیکٹ کا کام کرتے ہوئے ہی عام سی دوستی کب دونوں کے درمیان محبت میں بدلی تھی خود انہیں بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ لیکن اسے شاہ ویز کی معصومیت اور سادگی بہت پسند تھی۔ وہ عام لڑکوں سے بہت ہٹ کر تھا۔ حساس، سنجیدہ اور اپنے دیے رہنے والا لیکن بہت خیال رکھنے والا مرد۔

اس کے برعکس مرینہ بہت چلبلی اور شرارتی سی تھی اور شاہ ویز کو اسی لیے وہ پسند تھی۔ وہ اس کی کمپنی میں اچھا محسوس کرتا تھا۔ اس کی باتوں پہ ہنستا رہتا تھا۔ دو سال کی یہ محبت کسی کلاس فیلو سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی لیکن ان دونوں کو کسی کی خاص پروا نہیں تھی۔ اس محبت میں بھی انہوں نے کبھی کسی مقام پہ اپنی لمٹس نہیں کراس کی تھیں۔ اس لیے ان پہ بھی کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"تم میں وہ سب خوبیاں ہیں مرینہ جو کسی بھی آئیڈیل وائف میں ہو سکتی ہیں۔" اس کے ہاتھ کا پیزا کھاتے ہوئے وہ انگلیاں چاٹتا رہ گیا تھا۔ اور وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے ہاتھ کے بنے کھانوں کی اسی طرح تعریف کرتا تھا۔ وہ اچھا پکاتی تھی وہ جانتی تھی لیکن جب شاہ ویز اسے اس طرح سراہتا تھا تو اسے لگتا تھا کہ اس سے بہترین کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔

"مما بہت متاثر ہوں گی تم سے جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کی ہونے والی بہو کی کوکنگ اتنی شاندار ہے۔" وہ ہمیشہ اسے یہی امید دلاتا تھا کہ جیسے اس نے اس کا دل جیت لیا ہے، اس کی ماں کا بھی جیت لے گی۔

"اب اتنی بھی اچھی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آنٹی مجھے فیل کر دیں گی۔"

مرینہ اس کے منہ سے اس کی مما کی کوکنگ کی بہت تعریف سنا کرتی تھی۔ اسی لیے ڈرتی تھی۔ یوں بھی اسے شاہ ویز کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مما اس کے معاملے میں خاصی پوزیسو ہیں۔ ان کی پرسنالٹی کافی ڈومینیٹنگ تھی۔ انہوں نے شاہ ویز کے فادر کے بعد اس کو بہت خدشات کے ساتھ پالا تھا۔ بہت محتاط ہو کر زندگی گزاری تھی، اور اتنی محتاط وہ شاہ ویز کو لے کر بھی تھیں۔

"مما بہت اچھی لگ ہیں لیکن تم بھی کوئی کم نہیں ہو۔ مقابلہ ہوا کرے گا ہمارے گھر۔"

وہ ہنس دیتی۔

ساتھ اٹھتے بیٹھتے وہ مستقبل کے کتنے خواب دیکھا کرتے تھے انہیں خود بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ دونوں کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ انہیں ایک دوسرے کے بنا رہنا پڑے گا۔

"اگر کبھی تمہاری مما نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تو کیا ہو گا شاہ ویز؟" وہ گھبرا کر پوچھتی۔ اسے اندر کہیں یہ ڈر لگتا تھا کہ وہ اسے مسترد بھی کر سکتی ہیں۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی پرفیکٹ بہو بھلا انہیں کہاں ملے گی؟ تم میں وہ سب کوالٹیز ہیں جو کسی بھی مرد کو اپنی بیوی میں چاہیے ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر تم اتنی کیئرنگ ہو، لونگ ہو۔"

"یہ سب تم جانتے ہو، تمہاری مما نہیں۔ اپنی بہو کو لے کر ان کی بھی تو کوئی خواہش ہو گی نا۔" اس کی بات کاٹ کر وہ بولی تھی۔

"انہیں ایسی بہو چاہیے جو ان کے بیٹے کے ساتھ پرفیکٹ لگے اور وہ تم ہو۔ ایسی بہو چاہیے جو ان کے گھر کو جنت بنا دے اور وہ تم بنا دو گی یہ میں شرط لگاتا ہوں۔"

وہ اپنی ماں کو لے کر بہت شیور تھا کہ اس کی پسند کو وہ کبھی ٹھکرا نہیں سکتیں حالانکہ اس کے لیے تو کپڑے تک وہ خود پسند کر کے لاتی تھیں۔ ہاں بس وہ اس کی ضد مان لیا کرتی تھیں لیکن وہ اتنی ضد کرتا ہی کہاں تھا۔ یہیں اس سے غلطی ہو گئی تھی جو اسے جلد پتا چل گئی تھی۔

شاہ ویز کے اتنا یقین دلانے پہ بھی اسے لگتا تھا کہ اس کی مما کو منانا آسان نہیں ہو گا لیکن شاہ ویز ان کا اکلوتا بیٹا تھا سو انہیں کچھ بھی کر کے منا ہی لے گا اس کا بھی یقین تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کا لاسٹ ایئر تھا جب ایک رات امی مرینہ کے کمرے میں آئی تھیں۔ اور اسے بتا کر گئی تھیں کہ اگلے ہفتے اس کے ابو کے ایک قریبی دوست اپنے بھتیجے کا اس کے لیے رشتہ لا رہے ہیں۔ اس بات نے مرینہ کو پریشان کیا تھا اسی لیے اس نے امی کے جاتے ہی شاہ ویز کو کال کی تھی۔ اسے ساری بات بتا کر بس اتنا کہا تھا کہ وہ اپنی مما سے بات کرے۔

"ایک دم سے کیسے ان سے بات کر سکتا ہوں؟"

وہ خود بھی پریشان ہوا تھا کیونکہ ابھی وہ ذہنی طور پہ اس بات کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے تو یہی سوچ رکھا تھا کہ یونیورسٹی کے بعد نوکری تلاش کرے گا اور پھر اس کا ہاتھ مانگنے جائے گا۔ ابھی تو مما کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ اب ایک دم سے کیسے ان کے سر پہ جا کر سوار ہو جاتا کہ رشتہ لے کر چلیں۔ اس صورت حال پہ مما کبھی نہیں مانیں گی وہ جانتا تھا۔

"تو کب بات کرو گے؟ جب میری بات پکی ہو جائے گی تو......؟" وہ تپ گئی تھی۔ صورت حال ہی ایسی ہو چلی تھی کہ وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

"اچھا میں کرتا ہوں بات۔ تم ٹینشن نہ لو۔"

اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی تھی لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے کرے۔

اگلے دن وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ ناشتے کی میز پہ اس نے مما سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"آج آپ کالج مت جائیں مما۔ ہم سارا دن ساتھ رہیں گے۔ مل کر کوئی مووی دیکھیں گے اور آپ اچھا سا کھانا بنانا میرے لیے۔" ان کے گلے میں بازو ڈال کر وہ لاڈ سے کہہ رہا تھا۔ ایسے لاڈ وہ تب کرتا تھا جب اسے کوئی فرمائش کرنا ہوتی تھی۔ اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تھی۔ مما مسکرا دی تھیں۔ وہ اس کی اس ادا سے بخوبی واقف تھیں۔

"کیا بات ہے وہ بتاؤ۔ کیا چاہیے میرے بیٹے کو۔ کالج کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ میں لیٹ چلی جاؤں گی۔" اس کے بازو تھام کر انہوں نے اسے سیدھا کیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے گال پہ چٹکی بھری تھی۔

"مما! اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے بچوں کی

طرح مت ڈیل کیا کریں۔" مصنوعی خفگی سے کہتے وہ سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔
انہوں نے اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ بے چینی سے لب کتر رہا تھا۔
"اب بتادو کیا بات ہے؟" چھری کانٹے سے آملیٹ کو کاٹتے وہ منہ میں رکھتے پوچھ رہی تھیں۔
"میری ایک کلاس فیلو ہے مما۔"
ان کا ہاتھ اس بات پہ تھما تھا۔
"اس کے گھر جانا ہے میرا پروپوزل لے کر۔"
ان کا چلتا منہ بھی رکا تھا اور انہیں لگا تھا کہ دنیا رک گئی ہے۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اپنے کانوں پہ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔
"مما آئی لو ہر۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ سوری آپ کو لیٹ بتا رہا ہوں لیکن یہی سوچا تھا کہ پہلے ایجوکیشن کمپلیٹ ہو جائے تو پھر ساری بات آپ کو بتاؤں گا۔ اب بیروزگار لڑکے کو تو کوئی اپنی بیٹی نہیں دیا کرتا نا۔"
وہ بالکل شاکڈ کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھیں۔
"لیکن اب اس کا کوئی رشتہ آرہا ہے تو مجھے اس سے پہلے اس کے گھر اپنا رشتہ بھیجنا ہوگا تاکہ وہ لوگ مجھے کنسیڈر کریں۔" اس نے مما کو ساری بات سمجھائی تھی۔ بے چینی سے ان کے سامنے اٹھ کر گھٹنوں پہ بیٹھ گیا تھا۔
"مما! شام کو چلیں ان کی طرف پلیز۔"
پلیز وہ ایسے کہہ رہا تھا کہ ایک چھوٹے بچے کو اپنا من پسند کھلونا درکار تھا اور اسے ماں کو مارکیٹ لے کر جانا تھا تاکہ وہ اسے دلا سکیں۔
"نیور۔" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔
شاہ ویز کچھ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔
"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" اسے لگا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ اس کی مما یہ کیسے کہہ سکتی تھیں اور وہ بھی اتنی درشتی سے تو کبھی کہہ ہی نہیں سکتیں۔
"مما! آپ کیا کہہ رہی ہیں اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟" وہ اب خود بھی شاکڈ تھا۔
"میں نے سن لیا تم جو کہہ رہے ہو۔ اب میری بات سن لو کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے نہیں ہو سکتی۔" ان کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ بلکہ بہت سخت ہوا تھا۔
"مما! آپ اس سے مل کر تو دیکھیں۔ وہ بہت شان دار لڑکی ہے۔ آپ بہت متاثر ہوں گی اس سے۔" بیٹے کی آنکھوں میں محبت کی جلتی جوت نے ان کی آنکھوں میں انگارے بھر دیے تھے۔ وہ کسی اور لڑکی کو ان پہ فوقیت دے بھی کیسے سکتا تھا۔ انہیں بتائے بنا کسی کو پسند کیسے کر سکتا تھا۔
"مجھے کسی ایسی شان دار لڑکی سے تمہاری شادی نہیں کرنا جس نے تمہاری سادگی کا فائدہ اٹھاتے تمہیں پھنسالیا ہے۔"
شاہ ویز تڑپ اٹھا تھا۔
"آپ غلط بات کہہ رہی ہیں مما۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔" آج ان کا بیٹا کسی لڑکی کے لیے انہیں غلط کہہ رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں وہ۔
"کہا نا بیٹی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" کرسی کو پرے دھکیلتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ "تمہاری شادی میں بہت سوچ سمجھ کر ایک بے حد زبردست لڑکی سے کروں گی، کسی راہ چلتی سے نہیں۔"
"مما۔ میں شادی کروں گا تو بس اسی سے کروں گا۔" وہ غصے سے اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا اور غصے سے کرسی کو لات مارتے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
مسز فہیم نے جاتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی کو انہیں کبھی بہو نہیں بنانا جس نے آنے سے پہلے ہی ان کے بیٹے کو ان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

☆☆☆

شوہر کی بے رخی کے بعد انہوں نے شاہ ویز کو ہی اپنا کل اثاثہ سمجھا تھا۔ وہ جان دیتی تھیں اس پہ۔ اس کی تربیت انہوں نے ایسے ڈھنگ سے کی تھی کہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا کہ وہ سنگل پیرنٹ کی اولاد ہے۔ اسے پڑھایا لکھایا تھا۔ ہر معاملے میں قابل بنایا

تھا۔ وہ ایک بہترین بیڈمنٹن پلیئر تھا۔ اس نے اسکول اور کالج کے زمانے میں کئی میچ جیت کر گھر کے ایک کارنر کو اپنی ٹرافیز سے سجایا تھا۔

بس اپنی اس بے انتہا محبت میں وہ ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئی تھیں۔ اتنا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ، چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ تک خود نہیں کرنے دیتی تھیں۔ اس کے کپڑے، جوتوں، اس کے کھانے پینے سب میں ان کی مرضی چلتی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ بہتر فیصلہ کرتی ہیں اور وہ بھول گئی تھیں کہ اب وہ بچہ نہیں۔ ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہے جو عنقریب ایک قابل انجینئر بن کر نکلنے والا ہے۔ عملی میدان میں قدم رکھنے والا ہے۔ بس یہی بھول ان سے ہوئی تھی۔

مرینہ کو پسند کرنے کا، اس سے شادی کا فیصلہ اس نے بنا انہیں بتائے خود لیا تھا، یہ وہ کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتی تھیں۔ کوئی ان کا بیٹا ان سے چھین کر اس پہ اپنی اجارہ داری کیسے قائم کر سکتی ہے۔ وہ ان کا بیٹا تھا، ان کی زندگی کی جمع پونجی۔ اب وہ کیسے کسی ان چاہی لڑکی کو یہ اجازت دیتیں کہ وہ آئے اور ان کا کل اثاثہ لے جائے۔ ایسا وہ کبھی نہیں ہونے دیں گی۔ شاہ ویز کا کیا تھا وہ تو تھا ہی پاگل۔ ابھی ضد کر رہا تھا، کل کو وہ اس کو جذباتی طور سے دھمکا کر، سمجھا بجھا کر منا لیں گی تو بھول جائے گا اور پھر وہ اپنی مرضی اور پسند کی لڑکی لائیں گی۔

اس دن پہلی بار شاہ ویز پورا دن اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ نہ اس نے کھانا کھایا تھا، نہ اس نے دروازہ کھولا تھا۔ مسز فہیم اس کا دروازہ بجا بجا کر واپس لوٹ آئی تھیں۔ کھانا انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا کہ خود ہی کھا لے گا۔ اگر وہ ضد پہ آگیا تھا تو وہ بھی اس کی ماں تھیں۔ اس کی ضد کے آگے ہار نہ ماننے والی۔

اگلی صبح وہ کمرے سے باہر آئیں تو رات کا کھانا جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جا چکا تھا، بنا کچھ بھی کھائے پیے اور ان سے ملے۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی پارکنگ سے نکل رہی تھی جب شاہ ویز بھاگتا ہوا اس تک آیا تھا۔

"مرینہ...... رکو پلیز۔" اس کے سامنے آکر وہ رکا تھا۔ "پلیز میری بات سنو یار۔"

"اب تم مجھ سے تب ملنا جب تم اپنی مما سے ہمارے رشتے کے متعلق بات کر لو گے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"میں یہی بتانے تو آیا تھا کہ میں نے مما سے بات کی ہے یار۔" مرینہ چونکی تھی۔

"ابھی وہ نہیں مان رہیں لیکن میں انہیں منا لوں گا۔ آئی سویر میں انہیں منا لوں گا۔" وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن تب تک اگر میری بات طے ہو گئی ہوگی تو پھر مجھے مت کہنا۔"

"کیا ہو گیا ہے یار تمہیں؟ تم انہیں کسی بھی طرح کچھ عرصے کے لیے ٹال نہیں سکتیں؟ میں کہہ رہا ہوں نا کہ میں لے آؤں گا مما کو۔" وہ بے بسی سے بالکل پاگل سا ہو رہا تھا۔

"کیسے ٹالوں میں انہیں، تم بتاؤ شاہ ویز۔ اتنا پڑھا لکھا لڑکا، اتنے اچھے خاندان کا رشتہ، گھر والے اس قدر خوش ہیں اس رشتے پہ۔ کیسے ٹالوں میں؟" وہ رو دی تھی۔ شاہ ویز تڑپ اٹھا تھا۔

"مجھے تھوڑا تو وقت دو۔ بس تم کسی طرح اس رشتے کو ٹال دو۔ میں مما کو جلدی لے کر آؤں گا۔"

مرینہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی تھی لیکن اس کا موڈ بحال نہیں ہوا تھا۔ شاہ ویز بے بسی سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ مزید کلاسز لیے بنا ہی وہ گھر لوٹ گیا تھا۔ اس میں کلاسز لینے کی ہمت نہیں تھی، کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مرینہ سے دست بردار ہونا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی صورت اسے کھو نہیں سکتا تھا۔

وہ گھر لوٹا تو مما کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر بہت ضبط سے بولا تھا۔

"آپ اٹھیں اور ابھی میرے ساتھ اس کے گھر چلیں مما۔" وہ بالکل جنونی ہو رہا تھا۔ ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر مسز فہیم پریشان ہو گئی تھیں۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے بنٹی؟" اس کا چہرہ تھام کر وہ پوچھ رہی تھیں۔ اپنا سارا غصہ وہ اس کی حالت دیکھ کر ہی بھول گئی تھیں۔

"میں اس کے بغیر مر جاؤں گا مما۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟" ان کے ہاتھ جھٹک کر وہ چیخا تھا۔ اس نے کبھی ایسے چیخ کر، چلا کر بات نہیں کی تھی ان سے۔ ان کا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔

"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا بیٹا۔"

"آپ میرے ساتھ چل رہی ہیں یا نہیں؟" اس نے دو ٹوک پوچھا تھا۔

"بنٹی دیکھو بیٹا۔ میں اس سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی سے تمہاری شادی کروں گی......" ان کی بات کاٹ کر وہ بہت کرب سے کہہ رہا تھا۔

"وہ مرینہ تو نہیں ہو گی نا مما۔ وہ میری محبت تو نہیں ہو گی نا۔ ساری زندگی میں نے آپ کی پسند سے گزاری ہے جیسے کوئی روبوٹ ہوتا ہے۔ آپ کہتی تھیں بنٹی یہاں جاؤ، وہاں بیٹھو، یہ کھالو، وہ پہن لو، سو جاؤ، اب جاگ جاؤ۔ مما میں سب مانتا رہا ہوں نا۔ جو جو آپ نے کہا میں نے کیا۔ میں انجینئر نہیں بننا چاہتا تھا لیکن آپ چاہتی تھیں کہ میں بنوں تو میں بن گیا۔ اب تو مجھے اپنی بھی ایک پسند منوا لینے دیں مما۔ اب ایک بات میری بھی مان لیں۔ مجھے مرینہ چاہیے مما۔ پلیز میرے ساتھ اس کے گھر چلیں۔" وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔

"تم ساری زندگی کی فرماں برداری کا صلہ مانگ رہے ہو مجھ سے؟ مت بھولو کہ میں نے بھی بہت محنت کی ہے تمہارے پیچھے۔ بہت مشکل وقت کاٹ کر پالا ہے تمہیں۔ اپنی ساری جوانی جھونک دی ہے تم پہ۔" وہ اسے جتا رہی تھیں۔

"تو بدلے میں ہمیشہ اپنی بات منوائی تو ہے آپ نے۔ اب میری محبت تو مت مانگیں مجھ سے۔ ایک بار مل کر تو دیکھ لیں اس سے مما۔ بس ایک بار۔"

مسز فہیم نے اس کے جڑے ہاتھ نظر انداز کر دیے اور سختی سے بولیں۔

"یہ نہیں ہو سکتا بنٹی۔ مجھ سے وہ کرنے کو مت کہو جو میرے لیے ناممکن ہے۔"

وہ ساکت سا انہیں دیکھتا رہا اور پھر تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ جس غصے میں وہ نکلا تھا، جس غصے میں اس نے گاڑی نکالی تھی، جس غصے سے وہ گیٹ کو رگیدتا ہوا گیا تھا اسی وقت مسز فہیم کا دل ہول گیا اور انہیں لگا کہ ان سے بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔

ابھی شاہ ویز کو نکلے آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ پی ٹی سی ایل پہ کال آنے لگی۔ بے چینی سے انہوں نے کال اٹھائی تھی۔ دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔

"یہ شاہ ویز کا گھر ہے؟" پتا نہیں انہوں نے کیا کہا تھا لیکن اگلی بات سیسے کی مانند کانوں میں پڑی تھی۔

"آپ کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ مر چکا ہے۔" وہ وہیں ڈھے گئی تھیں۔

☆☆☆

لان میں ایک طرف بیٹھی مرینہ کے آنسو رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ آج دس مارچ تھی اور آج ہی شاہ ویز کی کار ایکسیڈنٹ میں موت واقع ہو گئی تھی۔ زید کی جس خالہ کے گھر رہنے وہ آئی تھی، اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شاہ ویز کا گھر ہو گا۔

شاہ ویز کی موت کی خبر اسے ایک کلاس فیلو سے ملی تھی اور پھر وہ دنوں ڈپریشن کا شکار رہی تھی۔ اسے اسی ڈپریشن سے نکالنے کے لیے اس کے بھیا نے کراچی سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی انجینئرنگ مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ واپس یونیورسٹی جاتی۔ جانے سے پہلے ایک بار وہ شاہ ویز کی مما سے ملنا چاہتی تھی لیکن بھیا نے صاف منع کر دیا تھا۔ وہ اسے زبردستی لاہور لے آئے تھے۔

ماحول کے بدلنے سے کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ کی شوخ و چنچل مرینہ بالکل خاموش

ہو گئی تھی۔
کچھ مہینے بعد سادگی سے اس کا نکاح زید سے کر دیا گیا تھا اور یوں اس کی زندگی کا ایک باب بند ہو گیا تھا لیکن اس کے اندر وہ ہمیشہ کھلا ہی رہا تھا۔
آج مسز فہیم کو شاہ ویز کی مما کے طور پہ دیکھ کر اس کے سارے زخم ادھڑ گئے تھے۔ اس کی موجودہ زندگی، زید کی لاپروائی، شاہ ویز کی بے پناہ محبت اور اس کی موت، مسز فہیم کی یہ حالت، سب اسے بری طرح رلا رہے تھے۔
"میں خالہ کو کبھی نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی مرینہ ہوں، وہ لڑکی جس سے شاہ ویز شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کی تکلیف میں اضافہ نہیں کروں گی۔ وہ یقیناً مجھ سے نفرت کرتی ہوں گی کہ میری وجہ سے ان کا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میں انہیں کبھی نہیں بتاؤں گی۔" ایک فیصلہ لیتے اس نے آنسو صاف کیے اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔
☆☆☆
مسز فہیم کی حقیقت جان لینے کے بعد اس کے برتاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر ان کا خیال رکھنے لگی تھی۔ اس نے فون پہ بھی مسز ہمدانی سے بات کر لی تھی کہ وہ مسز فہیم کو اپنے ساتھ لاہور لانا چاہتی ہے تاکہ ان کا اچھے سے خیال رکھ سکے، علاج کروا سکے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مسئلہ زید سے بات کرنے کا تھا اور اس کی ذمہ داری مسز ہمدانی نے خود لے لی تھی۔ انہوں نے جیسے تیسے زید کو منا لیا تھا اور یہی طے ہوا تھا کہ زید انہیں اپنے ساتھ لاہور لے آئے گا۔ ان کا گھر رینٹ پہ دے دیا جائے گا۔ کچھ عرصے وہ اپنا علاج کروائیں گی اور پھر جب وہ بہتر ہو جائیں تو ان کی مرضی ہے کہ وہ لاہور میں رہنا چاہیں یا اپنے گھر لوٹنا چاہیں۔
ان کی واپسی میں بس ایک ہفتہ ہی رہ گیا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیسے مسز فہیم کو منائے گی لیکن اسے انہیں ساتھ لے جانے پہ آمادہ کرنا تھا۔
اس دوپہر مسز فہیم پرانے البم لے کر بیٹھی ہوئی تھیں جب ان کے سامنے شاہ ویز کی یونیورسٹی ویلکم پارٹی کی تصاویر آ گئیں۔ شاہ ویز اس تصویر میں ایک کونے پہ کھڑا تھا۔ اس کی تصویر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھیں کہ یونہی سرسری سی نظر ایک چہرے پہ پڑی اور پھر ٹھہر گئی۔ اس چہرے کو انہوں نے کہیں دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا تھا بس یہ یاد نہیں آ رہا تھا اور اچانک ان کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ اس چہرے کو تھوڑا صحت مند کر دیا جاتا، بالوں کی کٹنگ کرا دی جاتی وہ چہرہ مرینہ کا چہرہ تھا۔
تب ہی مرینہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس پہ نظر پڑتے ہوئے انہوں نے پھر سے سامنے پڑی تصویر کو دیکھا تو ان کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ یہ تصویریں انہوں نے بہت بار دیکھی تھیں۔ ان میں سے کتنی تصویروں میں وہ شاہ ویز کے ساتھ کھڑی تھی۔ کتنی بار دیکھی گئی تصویروں کے باوجود نجانے مرینہ سے ملنے پہ وہ اسے پہچان کیوں نہیں پائیں۔ شاید اس لیے کہ اب وہ پہلے سے قدرے بدل گئی تھی یا وہ اس لڑکی کی زید کی بیوی کے طور پہ موجودگی کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔
"خالہ۔ میں آپ سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔" ان کے کمرے کے پردے ہٹاتے ہوئے، کھڑکیاں کھول رہی تھی۔
وہ خاموشی سے آنسو بہاتے اسے دیکھ رہی تھیں۔ شاہ ویز نے کتنا کہا تھا کہ وہ ایک بار اس سے مل لیں تو اس سے ضرور متاثر ہوں گی۔ کتنا کہا تھا کہ وہ ایک آئیڈیل لڑکی ہے بالکل ویسی جیسی اس گھر کو چاہیے، انہیں چاہیے، اسے چاہیے لیکن وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ وہ کسی اچھی لڑکی کا انتخاب بھی کر سکتا ہے۔ کتنا کہا تھا کہ ایک بار اس کے گھر چلی جائیں لیکن وہ بضد تھیں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔ کاش کہ وہ ایک بار اس سے مل لیتیں، ایک بار اس کے گھر چلی جاتیں۔
"میں آج لنچ میں کڑھی بنا رہی ہوں۔" وہ مزے سے بتاتے اب ان کا بستر ٹھیک کر رہی تھی۔
وہ ان کے کمرے میں آئی تھی، شاہ ویز کی

تصویریں دیکھی تھی تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نہ جانتی ہو کہ وہ کون ہیں۔ وہ سب جانتی تھی لیکن ایک بار بھی اس نے نہیں جتایا۔ وہ سب جان کر بھی ان کا اتنا خیال رکھ رہی تھی۔ وہ سب جان کر بھی اتنی اچھی کیسے تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ انھوں نے اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ ندامت اور پچھتاوے کا کوئی وجود ہوتا تو وہ مسز فہیم ہوتیں۔

"خالہ۔" اس نے ان کی غیر معمولی خاموشی محسوس کرتے ہوئے ان کی طرف رخ کیا۔ ان کے پاس آ کر انہیں روتے دیکھا اور ان کے سامنے نیچے بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ہے خالہ؟"

"تم جانتی تھیں نا سب۔ پھر بھی کچھ نہیں کہا۔"

مرینہ ساکت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کیوں مرینہ؟ مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

وہ ہنوز چپ بیٹھی تھی۔

"کہا کیوں نہیں کہ تم ہی میرے بیٹے کی پسند تھی۔ تم ہی وہ لڑکی تھی جس سے ان دیکھے عناد پال کر میں نے اپنا بیٹا کھو دیا۔" مرینہ کی آنکھیں بھرا گئیں اور سر جھک گیا۔

"کاش کہ میں نے اس کی بات مان لی ہوتی۔ کاش کہ میں ایک بار تم سے ملنے چلی جاتی۔" وہ اب کھل کر رو رہی تھیں۔

"میں نے کتنا ظلم کیا ہے اب سمجھ میں آتا ہے۔ اس پہ، خود پہ اور تم پہ......" مرینہ نے آنسو بہاتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"جیسی لڑکی اس گھر کو چاہیے تھی وہ تم ہی تو تھی لیکن میری انا نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ میرا بیٹا اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں ان سیکور تھی، ہمیشہ سے ان سیکور تھی کیونکہ شاہ ویز کے علاوہ میرے پاس کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس لڑکی سے ڈر گئی تھی جس نے مجھ سے میرے بیٹے کو ہتھیا لیا تھا۔ اپنے انھی خدشات کی بدولت میں نے ہمیشہ کے لیے اپنا بیٹا کھو دیا۔" مرینہ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایسی باتیں مت کریں خالہ۔ مجرم تو میں ہوں آپ کی۔ میری وجہ سے شاہ ویز آپ سے لڑا، خفا ہوا اور اسی غصے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میں ایک عرصے سے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن جو نقصان آپ کا ہوا، اس پہ میری معافی سے کیا مداوا ہو سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے معاف کر دیں۔"

مسز فہیم نے اس کے جڑے ہاتھ تھام لیے۔

"جو ہونا تھا وہ تو اسی طرح ہونا تھا۔ اس کی اتنی ہی زندگی لکھی تھی، یہ سب باتیں نہ ہوئی ہوتیں تو کچھ اور ہوا ہوتا۔ ہاں لیکن اس کے جانے سے ہم دونوں اپنی اپنی آگ میں جل رہے ہیں۔"

مرینہ ان کے گلے لگ گئی تھی۔ وہ دونوں کتنی دیر روتی رہی تھیں۔

"خالہ! میں چاہتی ہوں کہ اب آپ ہمارے ساتھ چل کر رہیں۔ پلیز منع مت کریے گا ورنہ مجھے یہی لگے گا کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

مسز فہیم متذبذب سی اسے دیکھنے لگیں۔

"لیکن اپنا گھر چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی ہوں؟"

"گھر صرف دیواروں کا نام نہیں ہوتا۔ گھر اپنے پیاروں کے ہونے کا نام ہے اور یہاں آپ اکیلی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ چل کر رہیں اور امی بھی یہی چاہتی ہیں۔ آپ کو اپنوں کی ضرورت ہے خالہ۔ اور میں اب کسی صورت آپ کو یہاں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی۔" مسز فہیم نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

"مجھے کچھ دن دو سوچنے کے لیے۔"

"دن بے شک لیں لیکن جانا آپ کو میرے ساتھ ہی ہے۔ بیٹا نہیں رہا تو کیا ہوا، بیٹی تو ہے نا اور میں یہاں اکیلے آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔" انہوں نے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کے ماتھے پہ بوسہ لیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اندر ایک 'کاش' نے پھر سے سر ابھارا تھا کہ آج شاہ ویز زندہ ہوتا تو۔

اور کچھ کاش ہماری زندگی کا ہمیشہ حصہ رہتے ہیں کیونکہ انسان کی کچھ حسرتیں اس کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

☆☆

سالگرہ نمبر
ام اقصیٰ
اعتماد

مجھے علینہ فاطمہ اچھی لگتی تھی اور بے حد اچھی لگتی تھی۔ خوب صورت، ذہین، پر اعتماد اور بااخلاق۔ سب اچھی خوبیاں تھیں اس میں۔ مجھ سمیت پوری کلاس اس کی گرویدہ تھی۔ وہ اگلی رو میں سب سے اگلی بنچ پر سب سے آگے بیٹھنے والی لڑکی تھی۔ جبکہ میں واجبی شکل کی، رٹے سے پاس ہونے والی پچھلے بنچوں میں آخر سے ذرا پہلے بیٹھنے والوں میں سے تھی۔

ایف ایس سی میں، میں ایک اچھے سرکاری اسکول سے اس کالج میں آئی تھی۔ جبکہ علینہ ایک بہت اچھی شہرت رکھنے والے اسکول سے تھی۔ خوب صورت، تراشیدہ بالوں کو ہمہ وقت پونی یا کیچر میں جکڑے رکھتی۔ خوب صورت تھی مگر اپنے حلیے سے لاپروا رہتی۔ کورس کے علاوہ بھی کوئی بات ٹیچر نے پوچھنا ہوتی تو نگاہ اسی کی سمت اٹھتی۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں رہتی۔ نقوش اچھے تھے پر بہت مبہوت کردینے والے نہ تھے۔ رنگ البتہ اس کا بے حد گورا تھا۔ اس کی جنرل نالج بہت اچھی تھی اور حاضر جواب تو بے حد تھی۔

مجھ سمیت کلاس کی اکثر لڑکیوں کی وہ آئیڈیل تھی۔ ایف ایس سی اور بی ایس سی کے چار سالہ دور میں مجھ میں کبھی اتنی ہمت نہ آسکی کہ اسے بتاؤں میں اسے کتنا آئیڈلائز کرتی ہوں۔ درحقیقت میں ایک دبو سی لڑکی تھی۔ جسے گھر میں اس کی اس عادت کے باعث پسند کیا جاتا کہ تنگ تو نہیں نا کرتی۔

بی ایس سی کے آخری دنوں میں نے ایک خوب صورت ارغوانی رنگ کی منہ بند کلی پیش کرتے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ جواباً وہ بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

"ارے ماننیہ۔ واؤ زبردست۔ یعنی میں تمہاری آئیڈیل۔ مجھے تمہاری پسند پہ فخر ہے۔ مجھے تم بہت پسند تھیں...... کم گو، کیوٹ سی......" میرا گال چھوتے مسکراتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ "افسوس کہ ہمارا تعلیمی دور اس کالج سے اختتام کو ہے، ورنہ میری تم سے دھواں دھار قسم کی دوستی ہوجاتی۔"

کچھ ہی دیر تک ہمارا فون پر رابطہ رہ سکا تھا۔ بی ایس سی میں حسب معمول اس نے ٹاپ کیا تھا، ہمارے ضلع میں سے...... جبکہ میں بمشکل ہی فرسٹ ڈویژن لا پائی تھی۔

ابا کی محلے میں پرچون کی دکان تھی سو وہ میرے یونیورسٹی کے اخراجات برداشت نہ کرسکتے تھے۔ ہم پانچ بہنوں جن میں دو بڑی شادی شدہ تھیں اور دو بھائیوں کے اخراجات ہی اتنے ہوتے کہ بڑی مشکل سے گھر کا چولہا جلا رہتا۔ مجھ میں اعتماد کی کمی تھی۔ دبو سی تھی۔ گھر میں دوسری بار روٹی سالن تک نہ مانگ پاتی۔ اماں نے ایک بار جو اور جتنا پلیٹ میں ڈال دیا۔ اسے ہی کافی سمجھتی۔

بی ایس سی کے رزلٹ کے بعد محلے میں ایک جاننے والی نے اسکول کھولا جو بہت اچھا چل نکلا تھا۔ سو اس نے مجھے بھی بلالیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آٹھویں نویں کے بچوں کو پڑھاؤں لیکن کلاس میں داخل ہوتے ان بڑے "بچوں" کو دیکھتے ہی میری تو ٹانگیں ہاتھ کانپنے لگتے سو روزینہ باجی سے التجا کی کہ مجھے کوئی چھوٹی کلاس دیں۔ اول کلاس کے تیس بچوں کے سامنے گھبراہٹ تو ہوتی مگر میں قابو پالیتی۔

ایک سال اسکول میں پڑھاتے مجھے یونیورسٹی جانے کا شوق ہوگیا۔ کچھ اعتماد بھی آگیا تھا اور بچت بھی...... مگر اگلے ہی ہفتے احمر کا پروپوزل میرے لیے آگیا۔ احمر ہمارے دور کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ ایم بی اے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے تھا۔ سب فیملی تو پنڈی میں تھی مگر وہ جاب کے سلسلے میں لاہور میں رہتے تھے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ بہت کوشش کے باوجود میں علینہ فاطمہ کو نہ بلاسکی کہ وہ ان دنوں بین الصوبائی مباحثے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

☆☆☆

شادی کے ابتدائی دو ماہ تو دعوتوں کی نذر ہوئے۔ عملی زندگی کے آغاز پر میں تو بوکھلا کے رہ گئی۔ احمر صبح کے گئے شام کو لوٹتے۔ آفس خاصا دور تھا سو لنچ بریک میں بھی نہ آپاتے۔ سارا دن میں تو بولائی

بولائی پھرتی۔ کسی ایکٹیویٹی میں دل لگتا، نہ سوشل میڈیا بھاتا۔ سوشل تو کبھی میں رہی ہی نہ تھی۔

''ایڈمیشن اوپن ہیں، آپ ایم ایس سی ہی کیوں نہیں کر لیتیں۔''

رات احمر کی بات پر میں چونک اٹھی۔

''میں......''

''جی۔ آپ ہی سے مخاطب ہوں۔''

''میں کیسے......؟ آئی مین یونیورسٹی میں تو بہت لوگ ہوتے...... وہ لڑکے وغیرہ تو......'' میں تو بوکھلا ہی گئی تھی۔

''ہاں، تو کیا ہوا؟'' قریب بیٹھے احمر نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بغور دیکھا۔

''میں نہیں کر سکتی۔ آئی مین اتنے سارے لوگوں میں میرا دل گھبراتا ہے۔''

مجھے شادی کے بعد اٹینڈ کی جانے والی سب دعوتیں یاد آئیں۔ جب ایک دن پہلے ہی میرا دل گھبرانے لگتا۔ سارا وقت خود کو حوصلہ دلاتے گزرتا۔ لرزتے، جھجکتے، کھانا چکھتی، میزبان کے سوالات کا مختصر سا جواب دیتی۔ احمر البتہ خوب لمبی گپ شپ لگاتے۔ اکثر مجھ سے پوچھے گئے سوالات کا خود ہی جواب دے دیتے۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، ایم ایس سی کر لیں۔ جتنے زیادہ لوگوں کا سامنا کریں گی، اتنی ہی ہمت آئے گی آپ میں۔'' احمر ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ میری نیم رضامندی جان کر اگلے ہی دن وہ پراسپکٹس لے آئے۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے پہلے دن صحیح معنوں میں کانپ رہی تھی۔ احمر کی کوئی ضروری میٹنگ تھی، باوجود اس کے وہ مجھے نہ صرف یونیورسٹی بلکہ کلاس تک چھوڑ کے گئے۔ فرسٹ رو کی جس چیئر پر وہ مجھے بٹھا کے گئے تھے، میری ہمت ہی نہ تھی اٹھ کے پیچھے جاتی۔

''ہو از مانیہ ظفر؟ (مانیہ ظفر کون ہے؟)'' سر ارسلان نے پہلی اسائنمنٹ کی چیکنگ کے بعد پوچھا تھا۔

سیکنڈ لاسٹ چیئر سے میں قدرے جھجکتے ہوئے کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا آپ یہاں آ سکتی ہیں؟'' انہوں نے اپنے قریب اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ کانپتے قدموں سے سست روی سے میں آگے بڑھی۔ انہوں نے پوری کلاس کو اسائنمنٹ دکھاتے تالیاں بجوائی تھیں۔ میری اسائنمنٹ کو وہ ''ایکسلینٹ ورک'' بول رہے تھے۔ اتنے چہروں کے سامنے میں خوف زدہ تھی، کسی ایک چہرے، چیز کو میری نگاہ پکڑ نہ پا رہی تھی۔

گھومتی، اٹھتی، گرتی نگاہوں سے میں سب دیکھے گئی۔ حقیقتاً مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا اور سچ تو یہ تھا اس اسائنمنٹ کو بنانے میں احمر نے میری بھرپور مدد کی تھی۔

اگلے دن یونیورسٹی جانے کے لیے میں نے خود ڈریس سلیکٹ کیا۔ میچنگ شوز بیگ نکالے ورنہ تو جو ہاتھ لگے پہن لیتی تھی۔ ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ آج مجھے علین فاطمہ بہت یاد آ رہی تھی۔ ان دنوں میں نے دوبارہ اس سے رابطے کی کوشش کی تھی مگر پتا چلا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ چھ ماہ ہو گئے تھے اس کی شادی کو۔

پہلے سمسٹر کے رزلٹ میں، میں ٹاپ فائیوز میں سے تھی۔ احمر نے یوں خوشی کا اظہار کیا گویا میں نے تمام یونیورسٹیز میں سے ٹاپ کیا ہو۔ وہ مجھے شاپنگ پر لے گئے۔ پہلی دفعہ میں مال جا کر بھی بہت گھبرائی تھی۔ احمر سارا وقت میرا ہاتھ تھامے رکھے تھے۔ لیکن اب جا کے میں قدرے ٹھیک ہوئی تھی۔

مال میں احمر نے ہر وہ چیز مجھے دلوائی جس کے لیے میں نے ذرا سا بھی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ کینڈل نائٹ ڈنر کے خواب پرور ماحول میں احمر نے میرے ہاتھ میں خوب صورت نازک سا بریسلیٹ پہنایا تھا۔ باقاعدہ کیک کاٹا تھا۔ اس دن میں خوش تھی بے حد خوش۔ گھبرانا، شرمانا، لجانا کہاں کا؟ بن تتلی میرا وجود آسمان کی وسعتوں کے ہلکورے لیتا تھا۔

دوسرے سمسٹر میں، میں ٹاپ تھری میں رہی تھی۔ تھرڈ سمسٹر میں اول پہ تھی جبکہ چوتھے اور آخری سمسٹر میں، میں ساتویں نمبر پر تھی کہ ان دنوں صبان کی آمد ہوئی تھی۔ ہمارا رشتہ ایک خط سے خوب صورت تکون میں بدل گیا تھا۔ ناتجربہ کاری اور اکیلے ہونے کے باعث بہت مشکل لگا تھا یہ مرحلہ مجھے......

مگر یہاں بھی احمر نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ڈائپر بدلنے سے کمبل لپیٹنے تک احمر ہر مرحلے میں میرے ساتھ رہے۔

صبان آٹھویں مہینے میں تھا، جب پی سی ایس امتحان میں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا اور بطور لیکچرار میری تقرری ہوئی۔ زندگی مکمل تھی اور بے حد خوب صورت بھی۔

میں علین کو سوچا کرتی، جتنی وہ ذہین تھی، جانے بلندیوں کی کن سیڑھیوں تک پہنچی ہوگی۔ کتنی منزلوں کو عبور کیا ہوگا؟

☆☆☆

صبان پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ پچھلے ایک دو دن سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ آج چلتے چلتے اچانک گر کے بے ہوش ہوگیا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فٹافٹ احمر کو کال کی اور صبان کو گود میں لیے باہر لپکی۔ گھر کے قریب واقع چائلڈ اسپیشلسٹ چھٹی پر تھا۔ مجھے کوئی ہوش تھا نہ حواس قائم۔ احمر نے گاڑی سول ہاسپٹل روڈ کی طرف موڑ لی۔ ڈاکٹر ناصر احمر کے دوست آن ڈیوٹی تھے۔ ہسپتال میں مخصوص رش تھا مگر واقفیت اور کچھ صبان کی سیریس کنڈیشن کے باعث جلدی باری آگئی۔ ایچ بی کم تھی صبان کی، جب ہی تھک کے بے ہوش ہوگیا تھا۔ کوئی زیادہ سیریس مسئلہ نہ تھا۔ واپسی پر کاریڈور سے گزرتے بلیک چادر کے ہالے میں ایک چہرہ شناسا سا لگا۔ میں اسے بے ساختہ پکار بیٹھی۔

"علین فاطمہ......"

اس نے چہرہ موڑ کے میری جانب اجنبی نگاہوں سے دیکھا۔

"علین تم...... کیسی ہو......؟"

"آپ......؟" وہ اب بھی ناسمجھی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میں مانیہ...... مانیہ ظفر......"

"ارے تم......" وہ خوشی سے میرے گلے لگی۔

پانچ چھ ماہ کا بچہ اس کی گود میں تھا۔ ڈیڑھ دو سال کا بچہ اس کی انگلی پکڑے ہوئے تھا۔

"میرے بچے ہیں۔" میری نگاہوں کے تعاقب کو رشتہ بتلایا۔

"ارے واؤ......"

بچے خوب صورت تھے مگر بے حد کمزور اور خود علین ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدل چکی تھی۔ ذہین نگاہوں میں تھکن نمایاں تھی۔ ہمیشہ اچھا پہننے اوڑھنے والی نے ہلکا سا سوٹ پہن رکھا تھا جو کئی بار کا دھلا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں اس سے کچھ اور پوچھ پاتی، کرخت آواز نے سماعتوں کو دہلایا۔

"کہاں مرگئی ہو۔ آ بھی جاؤ...... کوئی ملا نہیں اور اس کی باتیں شروع ہوئیں نہیں۔ سو کام ہیں اور فارغ نوکر نہیں ہوں تمہارا۔"

علین بعجلت آگے بڑھ گئی۔ آواز کے تعاقب میں ایک خوش شکل و خوش پوش نوجوان بے زاری لیے کھڑا تھا۔

میں ضرور اس کی شخصیت سے متاثر ہوتی اگر اس کا کریہہ پن جان نہ گئی ہوتی۔ خوش لباسی میں اندر کی غلاظت کا تعفن اڈ پڑ رہا تھا۔

میرا دل نہایت دکھ سے بھرا۔ تب ہی احمر رپورٹ لیے قریب آئے۔ میرے چہرے کی دکھی پن کو صبان کی طبیعت سے منسوب کرتے بے ساختہ انہوں نے میرا ہاتھ تھاما۔ سارا راستہ بے حد پریشانی اور ریش ڈرائیونگ میں بھی بار بار ہاتھ تھام کے دلاسا دیتے تھے۔ میرا اعتماد میرے ساتھ میرے ہم قدم تھا۔

لڑکیاں تو یوں ہی نازک لچکیلی ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ ان کے اعتماد، ان کے محرم ہوتے ہیں۔ ورنہ تا عمر یوں ہی لرزتی کانپتی زندگی کا سفر بتا دیتی ہیں۔

☆☆

عندلیب زہرا

دل درد مشترک

میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

مدثر آج کل مجھے بہت یاد آرہے تھے۔ ان کو فوت ہوئے پندرہ برس بیت گئے تھے۔ لیکن تنہا اور ٹوٹا ہوا، اپنا آپ مجھے آج لگا تھا۔

سمیرا خود خاموش رہتی۔ لیکن محسن اس کی زبان بولتا، یہ سب جانتے تھے۔ میں نہیں جانتی، سمیرا کس طرح میرے گھر پر حاوی ہو گئی تھی۔ نہیں...... گھر نہیں بلکہ محسن کے دل و دماغ پر...... اسے ماں بہن فساد کی جڑ لگتیں...... میری بیماری ڈھکوسلا...... بس اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مگن رہتا۔

فرحین کے دم سے آسرا تھا۔ نجانے وہ کس طرح اپنی سخت مزاج ساس کو مطمئن کر کے آتی...... میرے لیے کھانا پکاتی...... بچوں کو پاس بٹھاتی۔

"آج کل بیٹیاں نہیں بیٹے رخصت ہوتے ہیں...... پتا نہیں یہ آنے والیاں کیا گھول کر پلاتی ہیں کہ خونی رشتے بھول کر بس بیوی کی سیوا میں معروف ہو جاتے ہیں...... امی آپ بھی ناں......"

فرحین مسلسل ٹینشن میں بول رہی تھی۔ میں صدمے میں تھی اور گویائی جیسے کسی نے چھین لی تھی۔ شاید محسن کی نافرمانی نے میرے حواس سلب کر دیے تھے۔ میری امیدوں کا مرکز...... دعاؤں اور منتوں کا حاصل...... ماں سے یوں بے رخی برتے گا...... جسے میں نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا تھا۔ آنسو خاموشی سے بہ رہے تھے۔ لڑیوں کی صورت...... لب خاموش تھے اور دل کی دھڑکن مدھم۔

میں محسن کو کوئی بددعا نہ دینا چاہتی تھی۔ بھلا اپنی زندگی کو کوئی بددعا دے سکتا ہے؟ اپنی دھڑکن کے رکنے کی آرزو کر سکتا ہے؟

فرحین نے میرا چہرہ دیکھا تو خاموش ہو گئی۔

"میں، آپ کو ایک لمحے کے لیے ادھر نہ رہنے دوں گی۔ ابھی آپ کی بیٹی زندہ ہے۔ اس کا گھر سلامت ہے۔"

فرحین شروع سے جوشیلی تھی۔ اس لیے تو کامیاب مقررہ تھی۔ بے لاگ...... دوٹوک گفتگو کرتی ساس بہت سخت مزاج تھی۔ میری بچی کا حوصلہ تھا۔ جو اس سخت ماحول میں رہ کر بھی ماں کی خبر گیری کرتی۔ اس لیے تو سیانے کہتے ہیں کہ ہم بیٹے رخصت کرتے ہیں۔ بیٹیاں نہیں...... سمیرا میرے ارمانوں سے لائی بہو تھی۔ کام کاج میں تیز...... اب یہ میری کوتاہی تھی یا وہ بہت کائیاں تھی۔ جو محسن کو یوں انگلیوں پر نچایا کہ سب حیران رہ گئے۔

وہ محسن جس کی صبح مجھے دیکھے بغیر نہ ہوتی تھی جو میرے بنا ایک لقمہ نہ کھاتا تھا۔ اب یوں بے رخی لاتعلقی اور بے حسی سے رہتا ہے جیسے میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے اس کے لیے یہ تو میرے مرحوم شوہر کی پنشن تھی اور فرحین کا وجود...... ورنہ میں بھی لاوارثوں کی طرح اولڈ ہوم میں ہوتی......

"آہ! میرے مجازی خدا، یوں کیوں چلے گئے اچانک......"

"نانو کو کمپنی دو...... نانو کا خیال رکھو......"

نواسا، نوسی میری دل جوئی کرتے حتیٰ المقدور میرے لبوں پر بے ساختہ دعائیں رہتیں...... فرحین کے لیے، اس کے شوہر کے لیے...... بچوں کے لیے۔ لیکن میں اس کے گھر رہنے کے لیے کیسے جاسکتی بھلا...... اس کے سسرالی عزیز...... ساس جو شیر کی نگاہ رکھتی تھیں۔

"تب اس عورت کو ایک ایک چیز کا حساب دینا پڑتا ہے۔" اکثر فرحین کہتی۔ "بڑی بھابھیاں تو جان چھڑا کر چلی گئی ہیں بس میری گردن ان کے زیر عتاب رہتی ہے۔"

"میری بچی" میں اس کے لیے آب دیدہ ہوجاتی۔

فراز اچھا تھا جو اس کا سہارا تھا۔

محسن اپنی فیملی کے ساتھ امریکا سیٹ ہورہا تھا۔ یہ مجھے اب پتا چلا تھا۔ کب پاسپورٹ بنے...... ویزا لگا...... تیاریاں ہوئیں...... روانگی سے تین دن پہلے مجھے علم ہوا...... میں رو، رو کر ہلکان ہورہی تھی۔

"آپ تو یوں واویلا کررہی ہیں جیسے میں دنیا سے جارہا ہوں۔" محسن نے میرے رونے سے بیزار ہوکر کہا۔

"اللہ نہ کرے۔ میری عمر تجھے لگے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ڈرامہ" کیمرا کے لب ہلے...... میں نے دیکھ لیا......

"پھر مجھے ہنستے مسکراتے رخصت کریں...... میں روز فون کروں گا۔" اس نے مجھے لولی پاپ دیا۔

"گھر میں تو ماں نظر نہیں آتی...... سات سمندر پار جاکر کیا خاک نظر آئے گی؟" فرحین نے طبیعت صاف کی۔

"میں اکیلی کیسے رہوں گی اتنے بڑے گھر میں......" میں نے دہل کر عالیشان گھر پر نظر ڈالی۔

"گھر میں، کرائے پر دے رہا ہوں۔ فرحین آپ کو اپنے ساتھ رکھے گی۔" اس نے اپنا منصوبہ اگل دیا۔ ہم ماں بیٹی ششدر رہ گئیں۔

"فراز بھائی اچھے ہیں۔ تعاون کرتے ہیں...... فرحین کو کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔" کیمرا نے لب کشائی کی۔

اوہ، تو یہ منصوبہ کیمرا کا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی اور مجھے دل کے ساتھ بیٹے کو رخصت کردیا۔

فرحین نے شوہر کو کیسے راضی کیا ہوگا؟ ساس کی منت سماجت کی ہوگی؟ میری مجبور بچی...... بیٹی کی مجبوری اور بیٹے کی بے حسی مجھے رلا رہی تھی۔ اس کی ساس سرد مزاج عورت تھی۔ تینوں بہوؤں کو خاصا ٹف ٹائم دیا تھا۔ پتا نہیں اب کیسی ہوگی؟ میری تو عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

فرحین نے مجھے کل لینے کے لیے آنا تھا۔ اس کی ساس کی طبیعت خراب تھی آج میں گھر میں اکیلی تھی۔ کام والی بھی گھر چلی گئی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں وہ رات کیسے کٹی یہ میں جانتی تھی یا میرا خدا...... کبھی کوئی آہٹ سنائی دیتی۔ میں چونک کر دعائیں پڑھنے لگی۔ کبھی کوئی چاپ دل دہلا دیتی۔ مہیب سائے نظر آتے۔ دیواریں جیسے خود پر آرہی تھیں۔ پھر بارش شروع ہوگئی۔

اس گھر اور اولاد کے لیے ساری زندگی عورت جدوجہد کرتی ہے اور آخر میں یہ تنہائیاں؟؟

"میں تسبیحات پڑھتی رہی، فجر کی اذان کے ساتھ فرحین فراز کے ساتھ آگئی۔

"امی" وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

"ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ امی اکیلی کیسے رہ رہی ہوں گی۔" وہ سوں سوں کرتی رو رہی تھی۔

"چلو فرحین، آنٹی کا سامان پیک کرو۔" فراز نے ہم دونوں کو الگ کردیا۔ اور میں نے افسردگی کے ساتھ اپنے گھر پر نظر ڈالی، اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یادوں کا ہجوم میرے ساتھ تھا۔ آنسو بہے جارہے تھے۔ فرحین اور فراز نے مجھے دانستہ رونے دیا۔ تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہوسکے۔

☆☆☆

"نانو! نانو......" میرے نواسے نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ ہاتھوں کے بوسے لیے...... گلے لگے...... اور گال چوم لیے۔

سچ ہے محبت بھرے لمس سے بڑا کوئی جادوگر نہیں۔

دل ایک دم شانت ہوگیا تھا۔

فرحین نے کون سی ڈش تھی جو تیار نہ کی ہو۔ کپڑے سلوا کر رکھے تھے۔

"امی! ٹھیک سے بیٹھیں۔"
"امی! کچھ چاہیے۔"
"ٹی وی لگادوں۔ اچھا آیئے، لان میں بیٹھ کر ماضی کی باتیں کرتے ہیں۔"
اس نے بچوں کے ساتھ مل کر میرا بیڈ سیٹ کیا۔
"نانو کو پریشان نہیں کرنا۔" اس نے بچوں کو تنبیہہ کی تھی۔ وہ بھی میرا خیال رکھتے۔
"فرحین! تیری ساس ملنے نہیں آئیں۔" مجھے تیسرا، چوتھا دن تھا میں لاؤنج میں بیٹھی مارننگ شو دیکھ رہی تھی۔ جب اچانک مجھے خیال آیا۔
"مما اپنے بیڈ روم میں وظائف پڑھتی ہیں۔ ہفتوں باہر نہیں نکلتیں۔ میں سب کچھ انہیں وہیں دے دیتی ہوں۔" فرحین نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ آج وہ میرے لیے قیمہ مٹر بنارہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یخنی بنارہی تھی۔ میں سر ہلا کر ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔
فراز اور فرحین نے اپنا لان بہت اچھا سجا کر رکھا تھا۔ ہم سب شام کو بیٹھ کر چائے پیتے۔ رات کو واک کرتے۔ بچوں کے ساتھ فراز بھی بچہ بن جاتا۔ میں اور فرحین ہنستے مسکراتے یہ منظر دیکھتی رہتیں۔
فرحین کی ساس سے ایک بار ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو اور ایک سرد مزاج عورت تھیں۔ سر کے اشارے سے جواب دے کر بیڈروم میں چلی گئیں۔
"مما کو دودھ پتی اپنے ہاتھ کی پسند ہے۔ وہی بنانے کچن میں آئی تھیں۔" فرحین کا انداز مجھے صفائیاں دینے والا لگا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ کیا کہہ سکتی تھی۔
موسم خوش گوار تھا۔ بچے میرے ساتھ لان چیئر پر بیٹھ گئے تھے۔ اور اسکول کے قصے سنانے لگے۔ میں بھی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اچانک میری نظر کھڑکی پر پڑی۔ فرحین کی ساس خاموشی سے بچوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اتنی حسرت اور یاسیت تھی کہ میں ہنستے ہوئے خاموش ہوگئی۔ فارا اور تیمور نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ان دونوں کو بھی چپ لگ گئی۔ پھر وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر چلے گئے۔ بعد میں میرے استفسار پر بتایا کہ دادو کو شور پسند نہیں ہے۔ میں کڑھ کر رہ گئی۔
"ناشکری عورت۔"
فرحین اور فراز مجھے سیر کرواتے، لنچ کرواتے، شاپنگ کرواتے۔
"امی! آپ کی دعا چاہیے بس......" فرحین اور فراز دونوں میرے آگے سر جھکا لیتے۔ میں نہال ہو جاتی۔ رب نے مداوا کردیا تھا۔

☆☆☆

"رمضان میں آپ عمرہ کرنے جائیں گی۔" فرحین نے مجھے خوش خبری سنائی میں سجدۂ شکر بجالائی تھی۔
میری نظر اٹھی تو اپنے بیڈ روم کے دروازے پر فرحین کی ساس کھڑی تھیں۔ انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔
"مبارک ہو نفیسہ بہن۔" انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔
"خیر مبارک۔" میں نے خوش دلی سے سر ہلایا۔
"آپ کب جائیں گی؟" میں نے یونہی استفسار کیا۔ انہوں نے خاموش نظر فراز پر ڈالی اور وہ جز بز ہوگیا۔ فرحین بچوں کو خواہ مخواہ ڈانٹنے لگی۔ ماحول مکدر ہوگیا۔
ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ فرحین کی باتوں کے برعکس اس کی ساس بے ضرر اور لاتعلق ہے۔
"اب ایسی ہوگئی ہیں ورنہ پہلے تو......" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
اب میرا قیام مستقل تھا۔ کرایے کی معقول رقم اور پنشن کے باعث میں کسی کی محتاج نہیں تھی۔ فرحین میرا بیڈروم سیٹ کرنا چاہتی تھی۔ ایک بیڈ روم اس کا اور فراز کا تھا۔ دوسرا بچوں کا اور تیسرا بیڈروم میں اس کی ساس براجمان تھیں۔
"میں اپنے بیڈروم میں کسی کا وجود برداشت نہیں کرسکتی۔" انہوں نے ایک کٹیلی نظر مجھ پر ڈالی اور میں شرمندہ ہوگئی۔ فرحین کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔
"کون سا ہم جائیداد نام لکھوار ہے ہیں۔ دل بڑا

رکھیے مما" بیٹی کا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"بیٹا! میں اپنے گھر واپس چلی جاتی ہوں۔" میں نے بدمزگی کے خیال سے فرحین کا ہاتھ دبایا۔ مگر وہ بے خوفی سے ساس کو دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں ناگواری اور تپش لیے۔

گھر میں ایک ٹینشن کا آغاز ہوگیا تھا۔ فرحین کی ساس کمرہ خالی کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ فرحین ان کا سامان آہستہ لاؤنج میں رکھ رہی تھی۔ مجھے پہلی بار فرحین میں بے مروتی اور بدلحاظی نظر آئی۔ وہ تو بس بیٹی میری تھی۔ ورنہ ایک بے مروت، عورت تھی۔

"رہنے دو بیٹا۔"

"میں اپنا کمرہ خالی نہیں کروں گی۔ تمہاری بیوی میرا سامان نکال رہی ہے۔" فرحین کی ساس نے بیٹے سے شکایت کی۔

فراز نے فرحین کو دیکھا تو اس نے نظریں چرالیں۔

بات آئی گئی ہوگی۔ دو دن بعد فراز اور اس کی ماں میں بہت بحث ہو رہی تھی۔ فرحین لاتعلق اور بےحس جیسے کچھ بھی نیا نہ ہو ان کے لیے۔

"آپ ایاز بھائی کے یہاں کیوں نہیں جاتیں۔ انہیں بھی خدمت کا موقع دیں ناں...... سارا بوجھ مجھ پر ہے۔" فراز تنگ کر کہہ رہا تھا۔

"یہاں میرے شوہر کی یادیں ہیں۔ ان کے ساتھ آخری گزرا وقت اور ایاز کی بیوی مجھے پسند نہیں کرتی۔ جھگڑا کرتی ہے۔"

مجھے لگا جیسے محسن بول رہا ہے اور میں سن رہی ہوں۔ میں ساکت ہوگئی تھی۔

"ہاں سارے فرائض تو میرے ہیں ناں، میں نے ایاز بھائی سے درخواست کی ہے۔ آپ پندرہ دن ان کے گھر گزاریں۔ فراز نے بدلحاظی سے کہا۔

"اور باقی پندرہ دن۔" حمیدہ بیگم نے استفسار کیا۔

فراز جزبز ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دفعتاً مجھ پر دونوں کی نظر پڑی۔ دونوں خاموش ہوگئے۔

"میری بیٹی ہوتی تو میں بھی اس کے یہاں قیام پذیر ہو جاتی۔" آہستگی سے کہا گیا جملہ میں نے سن لیا تھا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

فرحین میرا سامان سیٹ کرنے لگی۔ میں خاموش تھی بالکل خاموش۔

"آج کل بیٹیاں نہیں بلکہ بیٹے رخصت ہوتے ہیں۔"

"اگر بیٹیوں کو اپنے گھر میں والدین کو رکھنے کی اجازت ہو تو بھی انہیں اولڈ ہوم میں نہ جانا پڑے......"

"اگر سب لڑکیاں، ساس سسر کو ہی اپنا والدین سمجھ لیں تو کتنا اچھا ہو ناں......"

ٹی وی پر ٹاک شو میں گرم گرم بحث ہو رہی تھی۔ گھر میں خاموشی تھی سو میزبان کی آواز گونج رہی تھی۔ میں خاموشی سے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ دل کی وہی حالت تھی جو محسن کی نافرمانی سے ہوئی تھی۔ کب فرحین نے کمبل اوڑھا دیا۔ ماتھے پر بوسہ دیا اور لائٹ آف کر کے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے علم نہ ہو سکا...... میں نے آنکھیں موند لیں۔ سوچوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ پیاس نے بے تاب کیا تو اٹھ کر باہر آگئی۔

لاؤنج نیم تاریک تھا۔ سرد اور بے مہر...... شاید یہ رویے ہوتے ہیں جو در و دیوار کو کبھی گرم جوش اور کبھی بے حس بنا دیتے ہیں۔ اداسی اور خاموشی میں لپٹا ہوا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔ تو تخت کے کونے میں ایک وجود گٹھڑی بنا نظر آیا۔ سسکیاں لیتا...... لرزتا ہوا۔ میں نے قدم بڑھائے اور چپ کر کے تخت کے کونے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ مجھے دیکھا تو ایک لمحے کی حیرت ان بوڑھی...... گدلی آنکھوں میں اتر آئی۔ پھر وہی چپ کی چادر ہم دونوں کے بیچ میں تن گئی تھی۔ روز اول کی طرح میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ تنہا، بوڑھی، اداس آنکھیں جن میں بے رنگ پانی تھا۔ اپنی بے وقعتی کا احساس، اولاد کی بے حسی اور لاتعلقی کی داستان دونوں کی نگاہوں میں تھی۔ چند لمحے گزرے ہم دونوں کپکپاتے لبوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے...... پھر گلے لگ کر نیر (آنسو) بہانے لگیں۔ ہمارا درد مشترک تھا۔

☆☆

شعاع عمیز

کرن کرن خوشبو

القرآن

قرآن مجید میں جن آرزوؤں کا تذکرہ ہوا ہے۔

☆ کاش میں ہوتا مٹی (سورۃ نبا 40)

☆ کاش میں نے آگے بھیجا ہوتا اپنی اس (اخروی) زندگی کے لیے کچھ (سورۃ الفجر 24)

☆ اے کاش نہ دیا جاتا میرا نامہ اعمال (سورۃ الحاقۃ 25)

☆ اے کاش ہم اطاعت کرتے اللہ کی اور اطاعت کرتے رسول کی۔ (سورۃ الاحزاب 66)

☆ اے کاش اختیار کیا ہوتا میں نے رسول کے ساتھ سیدھا راستہ۔ (سورۃ الفرقان 27)

☆ اے کاش ہوتا میں بھی ان کے ساتھ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی۔ (سورۃ النسا 73)

☆ کاش میں نہ شریک بناتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو۔ (سورۃ الکہف 42)

موت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات قسم کی اموات سے پناہ مانگی۔

1۔ اچانک اور ناگہانی موت۔

2۔ درندے کی چیر پھاڑ سے موت۔

3۔ جل جانے سے موت۔

4۔ سانپ کے ڈسے سے موت۔

5۔ پانی میں ڈوب جانے سے موت۔

6۔ کسی چیز پر گرنے یا اس پر کسی چیز کے گر جانے سے موت۔

7۔ میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے موت۔

(مسند احمد بن حنبل: 6594)

فہمیدہ جاوید ...... ملتان

جنت کے دروازے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی چیز کا جوڑا خرچ کرے، اسے جنت کے دروازے سے آواز دی جاتی ہے۔ جو شخص غازی ہوتا ہے اسے غازی والے دروازے سے پکارا جاتا ہے۔ جو مجاہد ہوتا ہے اسے جہاد والے دروازے سے پکارا جاتا ہے۔ جو روزہ دار ہوتا ہے اسے باب الصیام سے پکارا جاتا ہے۔ جو صدقات وخیرات کرتا ہے اسے باب الصدقات سے پکارا جاتا ہے۔

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

''یارسول اللہ! کیا کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جسے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔''

حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) مجھے یقین ہے وہ شخص تم ہو جسے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔''

(صحیح بخاری)

اقصیٰ امان ...... کوٹلہ جام بھکر

کنفوشس نے کہا

☆ اگر تم نے نفرت کی تو تم ہار گئے

☆ میں کسی کو کچھ بھی نہیں سکھا سکتا۔ میں لوگوں کو سوچنے پر مجبور کرتا ہوں۔

☆ عظمت یہ نہیں کہ کوئی انسان کبھی نہ گرے، بلکہ کئی بار گر کر دوبارہ اٹھنا عظمت ہے۔

☆ صرف ان لوگوں کی رہنمائی کرو، جو اپنی کم عملی کے بارے میں جانتے ہوں اور اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔

☆ میرے لیے سب سے مشکل چیز انکم ٹیکس کو سمجھنا ہے۔

ثناء شہزاد...... کراچی

بزنس مائنڈ

شبنم نے ندیم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو ندیم نے محبت نامے واپس مانگ لیے۔

''تم اپنے محبت نامے واپس کیوں لینا چاہتے ہو؟ شبنم حیرت سے پوچھا۔'' کیا تمہیں ڈر ہے کہ میں ان خطوط کے ذریعے تمہیں بلیک میل کروں گی؟''

''نہیں! مجھے ایسا کوئی خوف نہیں ہے۔ دراصل میں نے وہ محبت نامے ایک معروف ادیب سے بھاری معاوضے پر لکھوائے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی میرے کام آتے رہیں۔ کم از کم یہ احساس تو ہو کہ پیسے وصول ہو گئے۔'' ندیم نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔

حریم سلمان...... کراچی

تربوزی لیگ

جناب بھٹو صاحب کے دور میں جناب حنیف رامے صاحب پنجاب کے چیف منسٹر رہے اپنے آپ کو سوشلسٹ (سرخا) کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی جماعت مسلم لیگ کے نام سے قائم کرنے کا اعلان کیا اس پر لاہور کے کسی دانشور نے کہا۔'' جناب رامے صاحب کی مسلم لیگ تربوزی لیگ ہوگی جو اوپر سے سبز اور اندر سے سرخ ہوگی۔''

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

کہاوتیں

☆ پیٹ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے کان نہیں ہوتے۔ (اردنی کہاوت)

☆ جو بات عقل چھپاتی ہے نشہ اسے ظاہر کر دیتا ہے (لاطینی کہاوت)

☆ بے تکلف تعلقات کے بھی کچھ تکلفات ہوتے ہیں (جاپانی کہاوت)

☆ اندھیرے پر لعنت بھیجنے سے شمع روشن کرنا بہتر ہے (چینی کہاوت)

☆ جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے (چینی کہاوت)

☆ مرد کو سمجھو عورت کو دیکھو (فرانسیسی کہاوت)

☆ اندھے کے لیڈر بھی اندھے ہوا کرتے ہیں (جرمن کہاوت)

شبرین اسلم...... بہاولپور

حکمت و دانائی

کسی شخص نے ایک عالم سے پوچھا! مجھے کوئی ایسی نصیحت کریں جو زندگی بھر میرے کام آئے۔

انہوں نے جواب دیا۔ بس بھر بچنا چاہتے ہو تو دو چیزوں کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ ایک یہ کہ نہ خود خدا بننا اور نہ مخلوق میں سے کسی کو بنانا...... اور دوسرا یہ کہ نہ خود رسول بننا اور نہ کسی امتی کو رسول کا درجہ دینا۔

اس شخص نے حیرانی سے پوچھا! بھلا کوئی مسلمان ایسا کیسے کر سکتا ہے؟

عالم نے جواب دیا! اس میں حیرانی والی بات کون سی ہے، اکثریت یہی تو کر رہی ہے۔ سنو! خدا بننا اور بنانا یہ ہے کہ...... اللہ کے حکم مقابلے میں نفس کی ناجائز خواہشات پر عمل کرنا...... اور رسول بننا اور بنانا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح فرمان سامنے ہو لیکن اسے چھڑ کر اپنی من مانی کرنا یا کسی امتی کی بات پر عمل کرنا اور اس کی ہر بات کو اپنے لیے حرف آخر سمجھ لینا۔

صبا قاضی...... اٹک

تمغے

☆ کون کہتا ہے خواتین کی عزت نہیں اگر کوئی خاتون فیس بک پر اب ت بھی لکھ دے تو 540 لائکس اور 890 کمنٹس ایک گھنٹے میں آجاتے

ہیں۔
☆ ایمبولینس ہو یا بارات دونوں کو جلدی راستہ دے دینا چاہیے کیونکہ دونوں ہی زندگی کی جنگ لڑنے جا رہے ہوتے ہیں۔
☆ ہم پاکستان واحد قوم ہیں جو کہتے ہیں "بھائی ایک ٹھنڈی کولڈ ڈرنک دینا۔"
☆ اکثر میاں بیوی ایک دوسرے سے سچا پیار کرتے ہیں اور "سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔"
☆ صرف ننانوے فیصد پھوپھیوں کی وجہ سے پھوپھو بدنام ہیں۔
☆ ایک نئی تحقیق کے مطابق سکون صرف اس گھر میں ہوتا ہے جہاں ایک سے زیادہ چارجر ہوں۔
☆ جو بیوی اپنے شوہر کی ساری غلطیاں معاف کر دیتی ہے، وہ بیوی صرف ڈرامے کی آخری قسط میں پائی جاتی ہے (مشتاق احمد یوسفی)

سندس بخاری...... میر پور میرس

تین کہانیاں

1۔ ایک مرتبہ گاؤں والے بارش کی دعا کے لیے اکٹھے ہوئے تو ایک بچہ چھتری لے آیا۔ "یہ ہے ایمان"

2۔ بچے کو کھلاتے ہوئے جب ہوا میں اچھالتے ہیں تو بچہ ہنستا ہے کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے کہ اچھالنے والا گرنے نہیں دے گا۔ "یہ ہے یقین"

3۔ ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ صبح زندہ اٹھیں گے کہ نہیں مگر پھر بھی رات کو سوتے وقت الارم لگاتے ہیں۔ "یہ ہے امید"

اللہ پر ایمان، یقین اور اللہ سے امید میں دنیا کے ہر مسئلے کا حل ہے۔

دعا مصطفیٰ...... میر پور میرس

قابل غور

☆ سارا مسئلہ پیٹ کا ہے۔ اگر پیٹ خالی ہے تو نہ فن کے کوئی معنی ہیں اور نہ فکر کے۔ جس چیز نے انسانوں کی زندگی کو اس کے لیے ایک سزا بنا دیا ہے وہ ضرورت ہے جو پوری نہیں ہوتی (جون ایلیا)
☆ تاریخ صرف کتابوں میں نہیں ہوتی۔ کتابوں میں لکھے جانے سے بہت پہلے تاریخ لوگوں کے بدنوں پر لکھی جاتی ہے (امرتا پریتم)
☆ مرد سے انا کا مقابلہ کرنے والی عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنا دشمن بنا لیتی ہے۔ اکھڑ پن اور ضد کر کے مرد سے بات منوائی جا سکتی ہے۔ اس کے دل میں اپنی عزت اور محبت نہیں بڑھا جا سکتی۔ (عمیرہ احمد)
☆ انسان گناہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں نہیں جاتا۔ بلکہ گناہ پر مطمئن رہنے اور توبہ نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے (حضرت واصف علی واصف)
☆ بدترین غلامی وہ غلامی ہے جس میں غلام کو اپنی غلامی کا بھی احساس نہ ہو (مولانا ابوالکلام آزاد)
☆ عشق جیومیٹری ہے نہ الجبرا...... بس بکواس ہے...... چونکہ بکواس ہے...... اس لیے اس میں گرفتار ہونے والے کو بکواس ہی سے مدد لینی چاہیے۔
(سعادت حسن منٹو)
☆ کس زمانے میں غلط کے سامنے ڈٹ جانے والوں کے نام تاریخ میں درج ہوتے تھے اب غلط اور درست کے پورٹ فولیو آپس میں بدل گئے ہیں اب غلط پہ ہاتھ ڈالنے والے عبرت کا نشان بن جاتے ہیں (رفعت ناہید سجاد)

عروج فاطمہ...... میر پور میرس

بس اتنا یاد ہے

دعا تو جانے کون سی تھی
ذہن میں نہیں
بس اتنا یاد ہے
کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں
جن میں ایک میری تھی
اور اک تمہاری

(پروین شاکر)

بشریٰ محمود

اقصیٰ امان، کی ڈائری میں تحریر

اعزانا احمد آفندی کی غزل

درخت جاں پر عذاب رُت تھی نہ برگ جاگے نہ پھول آئے
بہار وادی سے جتنے پنچھی ادھر کو آئے ملول آئے

نشاط منزل نہیں تو ان کو کوئی سا اجر سفر ہی دے دو
وہ رہ نوردِ رہ جنوں جو پہن کے راہوں کی دھول آئے

وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
ہمارے حصے میں عذر آئے جواز آئے اصول آئے

اب ایسے قصے سے فائدہ کیا کہ کون کتنا وفا نگر تھا
جب اس کی محفل سے آ گئے اور ساری باتیں ہی بھول آئے

وفا کی نگری لٹی تو اس کے اثاثوں کا بھی حساب ٹھہرا
کسی کے حصے میں زخم آئے کسی کے حصے میں پھول آئے

بنام فصل بہار آذر وہ زرد پتے ہی معتبر تھے
جو ہنس کے رزق خزاں ہوئے ہیں جو سبز شاخوں پہ جھول آئے

افشاں سمیع، کی ڈائری میں تحریر

جون ایلیا کی غزل

دل کی تکلیف کم نہیں کرتے
اب کوئی شکوہ ہم نہیں کرتے

جانِ جاں تجھ کو اب تری خاطر
یاد ہم کوئی دم نہیں کرتے

دوریٔ یار کی ہوس ہے ہم
سرِ تسلیم خم نہیں کرتے

وہ بھی پڑھتا نہیں ہے اب دل سے
ہم بھی نالے کو نم نہیں کرتے

جُرم میں ہم کمی کریں بھی تو کیوں
تم سزا بھی تو کم نہیں کرتے

نوال شاکر، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت نظم

اس کی ہر ادھوری بات کو
ہم دل میں سمجھائے بیٹھے ہیں
اس کے بن کہے جملے کو
خود سے کئی بار دہرائے بیٹھے ہیں
اس کی اَن دیکھی نگاہوں کو
خود میں سمائے بیٹھے ہیں
اس کی اَن کہی بات کو
بن کہے اسے جتلائے بیٹھے ہیں
اس کے بے نام تعلق کو
ہم کئی کئی نام دیے بیٹھے ہیں
جو آج تک اس نے کہا نہیں
ہم اس کو کئی بار محسوس کیے بیٹھے ہیں
اس کے اقرار نہ کر لینے سے ہم خود کو
ایک خوش فہمی کے جال میں ڈالے بیٹھے ہیں
فرق صرف اتنا ہے کہ وہ فقط دوستی
اور ہم محبت کو نبھائے بیٹھے ہیں

حریم سلمان کی ڈائری میں تحریر

رفعت اندروی کی غزل

مجھ کو تو گر کے مرنا ہے
باقی کو کیا کرنا ہے!

شہر ہے چہروں کی تمثیل
سب کا رنگ اترنا ہے

وقت ہے وہ ناٹک جس میں
سب کو ڈرا کر ڈرنا ہے

میرے نفس ثانی کو
مجھ میں ہی سے ابھرنا ہے

کیسی تلافی کیا تدبیر
کرنا ہے اور بھرنا ہے

جو نہیں گزرا ہے اب تک
وہ لمحہ تو گزرنا ہے

اپنے گمان کا رنگ تھا میں
اب یہ رنگ بکھرنا ہے

ہم دو پائے ہیں سو ہمیں
میکنز پہ جا کر چرنا ہے

چاہے ہم کچھ بھی کر لیں
اب ایسوں کو سدھرنا ہے

ہم تم ایک ملے کے
پھر بھی وعدہ کرنا ہے

فہمیدہ جاوید کی ڈائری میں تحریر

شگفتہ شفیق کی غزل

ہم سے تو کسی کو بھی ستایا نہیں جاتا
اپنوں کو بلندی سے گرایا نہیں جاتا

چاہت کو کبھی رُلایا نہیں جاتا
الزام کبھی جھوٹا لگایا نہیں جاتا

ہم اپنی طبیعت سے ہیں مجبور یقیناً
چاہیں بھی تو احسان جتایا نہیں جاتا

یہ بات تو سچ تم نے کہی ہے مرے ہمدم
بس جائے جو دل میں وہ بھلایا نہیں جاتا

مشکل ہے بہت راہِ محبت بھی کٹھن ہے
اب مجھ سے ترا پیار نبھایا نہیں جاتا

چپ رہ کے شگفتہ نے اسے ایسی سزا دی
ہر بار تو اب شور مچایا نہیں جاتا

ثمرہ، اقراء کی ڈائری میں تحریر

تہذیب حافی کی غزل

کیسے اس نے یہ سب کچھ مجھ سے چھپ کر بدلا
چہرہ بدلا، رستہ بدلا بعد میں گھر بدلا

میں اس کے بارے میں یہ کہتا تھا لوگوں سے
میرا نام بدل دینا وہ شخص اگر بدلا

وہ بھی خوش تھا اس نے دل دے کر دل مانگا ہے
میں بھی خوش ہوں میں نے پتھر سے پتھر بدلا

میں نے کہا میری خاطر خود کو بدلو گے؟
اور پھر اس نے نظریں بدلیں اور نمبر بدلا

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

مضطرب دل کو تسلی صرف اللہ ہی دیتا ہے۔ بدگمانی تباہی ہے۔ یقین واحد کشتی ہے جو ہزار طوفان پر بھی کنارے سے لگ کر ہی رہتی ہے۔ تم اپنی ساری امیدیں اپنے رب سے لگاؤ، وہ سنتا ہے کیونکہ صرف وہی تو قریب ہے۔ آپ کے جو قریب ہے آپ اس سے کیوں دور ہیں؟ یہ دوری ایک پکار کے فاصلے پر ہے۔ یہ اداسی ایک سجدے کی دوری پر ہے۔ طلب کریں عطا ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

(سمیرا حمید...... طواف عشق)

فہمیدہ جاوید...... ملتان

''کبھی کبھی انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے سب ختم ہو گیا ہے زندگی سے جڑی ہر راحت و مسرت فنا ہو گئی ہے۔ دل صرف گوشت کا بے ہنگم لوتھڑا بن گیا ہے۔ جیون بوجھ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن پھر ہمارا رب ایسا راستہ نکال دیتا ہے کہ قدم چلنے سے ہی منزل مل جاتی ہے انسان حیران رہ جاتا ہے بے شک وہ بڑی حکمت والا اور وحدہ لاشریک ہے۔''

(اقراء صغیر احمد...... تیری زلف کے سر ہونے تک)

اقصیٰ امان...... کوٹلہ جام بھکر

اوسط

ایک بار ایک حساب دان نے دریا پار کرتے وقت اوسط نکالی تھی۔ لوگوں نے بہت منع کیا کہ بابا ڈوب جاؤ گے۔ لیکن اس نے بانس بنوایا۔ ایک جگہ آٹھ فٹ گہرا پانی تھا۔ دوسری جگہ تین فٹ اور ایک جگہ چار فٹ۔ اوسط نکلی پانچ فٹ سو یہ کچھ گہرائی نہ ہوئی۔ دریا میں اتر پڑا اور لگا ڈبکیاں کھانے لوگوں نے مشکل سے نکالا۔ پھر بھی حیران کہ اوسط پانچ فٹ کی ہے میں چھ فٹ کا ہوں گا۔ ڈوبا تو کیوں ڈوبا؟

(ابن انشاء)

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

منفی سوچ

دنیا کا سب خطرناک ترین ہتھیار ہماری کھوپڑی میں نصب ہے۔ یہ آن کی آن میں صحت مند کو مریض اور مریض کو صحت یافتہ کر دیتا ہے۔ پر امن ماحول کو خانہ جنگی سے بھرپور اور عالمی جنگ کو لمحوں میں سرد کر سکتا ہے۔ بس اپنی کھوپڑی میں نصب اس ہتھیار کو اس طرح استعمال کریں جیسے ایٹم سے بجلی بنا کر اندھیرے دور کیے جاتے ہیں نہ کہ ایٹم سے ہیروشیما اور ناگاساکی کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ سوچیں دماغ کی انگلیاں ہوتی ہیں اور دماغ ان کے ذریعے انسان کو نچاتا ہے۔ لہٰذا اپنے دماغ کو مثبت سوچوں سے اس طرح بھر دیں کہ اس میں منفی سوچ کی گنجائش اس باقی نہ رہے۔

(محمد ریاض...... سوچ ایک ہتھیار)

شہرین اسلم...... چوک شاہدرہ

ماں اور مامتا

''آج کی عورت، عورت بن کر جینا چاہتی ہے، ماں بن کر نہیں۔'' لنگی والا بولا۔

''میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا'' ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا۔'' بلیک سوٹ والے نے کہا۔

''تمہیں پتا بھی ہے۔'' رومی ٹوپی والا ہنس کر بولا۔ ''وہ تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے مامتا کو رد کر دیا تھا۔ اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے۔ جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔''

(ممتاز مفتی...... روغنی پتلے)

حریم سلمان...... کراچی

وقت گزر گیا

''اے میرے عزیز، تو نے غلط قیاس کیا۔ میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اگر جانتا ہوں تو بس اتنا کہ ایک وقت کشتی چلانے کا ہوتا ہے۔ اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اب بھرتا سمندر ہمارے پیچھے نہیں، ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی ہے......!

(انتظار حسین...... آگے سمندر ہے)

نوال شاکر...... ٹنڈو محمد خان

فہمیدہ جاوید...... ملتان

اس بار فروری 2021ء کا کرن مجھے تو سالگرہ نمبر لگا وجہ یہ کہ جس طرح ترتیب دیا اتنے زیادہ افسانے اور ناولٹ اور زیادہ خطوط واہ بہت اچھا لگا کرن۔ "ثانیہ مرید" سے ملنا بھی اچھا لگا اور ثانیہ اگر کتا گلی میں ملے تم نہیں ڈرو گی۔ واہ بھئی بہادری۔ آسیہ جی کے ناول میں ارسلہ نہ ہوتی تو ناول مزے کا نہ ہوتا زیادہ کہ منفی کردار بھی ضروری ہیں تا کہ درست اور غلط کا اندازہ ہو سکے۔ مہوش کے ناول کی ابھی ابتداء ہی مگر آغاز بہت پسند آ رہا ہے۔ فرح کے ناول میں ثمامہ اور شازمہ کو سزا ملے گی۔ سوار کی طرف سے کنعان کی باپ کا دل صاف اور دونوں کی ہو گی شادی اور ہنی مون، پر دوسرے ملک کی ضرورت نہیں کہ جہاں رہتے ہیں وہ جگہ بڑی دلکش ہے۔ یہ ہی ہو گا آخری قسط میں شاید۔ نازیہ کنول نازی کو قسط وار ناول کے ساتھ آمد پر دیکھ دل جھوم اٹھا۔ سوزان اور انجشاء کتنے پیارے نام رکھے نازیہ تم نے اور آغاز میں نظم لاجواب اور ناول کی ابتداء بھی متاثر کن رہی۔ شائلہ العباد کا ناول موجودہ ٹک ٹاک کے زمانے کے لحاظ سے بہت اصلاحی رہا۔ انعم خان کا ناولٹ بھی ٹھیک تھا اور حارث اپنی آئمہ کو اینڈ میں مناتا ہے یہ اچھی لگی بات کیونکہ غلطی حارث کی تھی۔ نادیہ امین کا "انتقام" خاصا فلمی اور ڈرامائی سا لگا کہ یوسف نے حبیبہ کی بہن سے شادی کی مگر انتقام محبت میں بدل ہی گیا۔ خیر اچھا تھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ افسانوں کے پاس چلتی ہوں تو "ماہر نفسیات" ماں کی چھٹی حس اچھی لگی گڈ فرح ماں کی اہمیت کو اچھا بیان کیا۔ "ڈھال" مختصر مگر سبق آموز اور ناخن کاٹنے پر گھی انگلیاں کہنا بڑا مزاحیہ رہا۔ عائشہ تنویر کے افسانے میں گڑیا کو شروع میں، میں بھی جادو ہی سمجھی مگر اینڈ بہت ہی اچھا کیا عائشہ کمال کر دیا تم نے۔ یہ افسانہ لکھ کر۔ "ذرا سی روشنی ہے" میں حنا اصغر نے جس موضوع پر لکھا یہ خیال اچھا رہا۔ بینش کی بچی اب تم سکینہ اور اس کے شوہر کی ترقی سے جلتی رہنا کہ آگ ہو تم ہاہاہا۔ فائزہ بھٹی کے افسانے بھی ہیرو ہیروئن کی پیار پر مجھے بھی بڑا پیار آیا اتنی محبت اور عزت دونوں کی اور اس قدر خیال واہ۔ "خالہ امی" میں بھانجی نے نمک اور چینی سے اچھا سبق دیا اور افسانہ بھی بہتر تھا۔ "نسخہ عشق" زیادہ پسند نہ آیا۔ کوثر ناز کی "مات" سب سے پسند آیا زیادہ کہ موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ صدف سمیع کے افسانے میں ہیرو کا اپنی ماں پر بھروسا اچھا لگا اور ہیرو کو اس کی مراد بھی مل گئی۔ "کرن کرن روشنی" میں تمام بہنوں بیٹیوں کی اچھی اچھی نگارشات پسند آئیں۔ انشراح ایمان کو کرن میں خوش آمدید۔ جبکہ عاصمہ، بشریٰ اور آمنہ یامین ملک بہنوں کے خطوط پڑھ کر اتفاق پسند آیا۔ ماریہ بیٹی خدا تمہیں اور تمام کو تعلیمی مقاصد میں کرے کامیاب۔ بھئی وہ تمام بہنیں میری پسندیدہ ہیں جو ڈائجسٹ کی جنون کی حد تک شوقین ہیں اور اچھا ہے فائدہ ہی ہے لڑکیوں کا تو یہ جنون بھی اچھا ہے۔ ہاں نادرہ میں بہنوں سے یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ میں ڈاکخانہ سے رجسٹری کی جگہ UMS کرواتی ہوں اور 250 گرام تک وزن کے 100 روپے لگتے ہیں۔ بہنوں اب میں کرن وشعاع وخواتین میں طویل خط و تمام سلسلوں میں مراسلات پوسٹ کر رہی ہوں اور یہ 250 گرام تک ہی ہے تو 100 روپے لگیں گے اور UMS جلدی بھی جاتا ہے۔

ج: فہمیدہ جی! بہت شکریہ کہ آپ کو کرن کی کہانیاں پسند آئیں۔ آپ بہنوں کی تعریف کرنے سے ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے کہ اور اچھے سے اچھا لائیں اور ہماری مصنفات کی کا بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ماہنیہ عمران، آمنہ ریمس، حریم فاطمہ...... گجرات

خالدہ جیلانی کے بارے میں پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ میری فیورٹ تھیں بہت اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ انٹرویو میں ساحین رشید صاحبہ بندہ تو آپ نے اچھا ڈھونڈا ہے۔ گڈ پرسنیلٹی اور کام بھی عمدہ دکھتا ہے ان کا۔ "میری بھی سنیے" سحر خان گڑیا اچھی لگی۔ "مقابل ہے آئینہ" ثانیہ مرید خاصی جولی طبیعت کی ہیں۔ تسلی بخش جوابات تھے۔ اس سلسلے کو تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ جاری رکھیں۔ اٹ از ناٹ بورنگ۔ سب سے پہلے مہوش افتخار کو پڑھا۔ ادب کی ملکہ ہیں جناب یقیناً یہ تحریر بھی اچھی رہے گی۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" نادیہ شاہ اور آبص کو پلیز ملا دیں۔ ارسلہ تو ہیں ہی لالچی بلا۔ "کنار خواب جو" واہ سواد آ گیا یہ مال روڈ اور لیلی برف باری اور برف کا دل کیا رومینس تھا۔ نازیہ کنول نازی "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" ہیرو، ہیروئین کی مزے دار سی نوک جھوک سے خوش ہو رہے تھے کہ باقی آئندہ کو بھی پڑھنا پڑا جو کہ زہر سے بھی کڑوا لگتا ہے۔ "محبت فروری کی دھوپ" مجھے بہت پسند آئی۔ ہر گھر کی کہانی ہے یہ۔ جب مائیں ہی ضد میں اپنی اولاد کو خراب کر دیتی ہیں۔ تب پھر یہی حال ہوتا ہے۔ جو ریاض ہاؤس کے مقیم کا ہوا ہے۔ ناولٹ "مجھے تیری ضرورت ہے" اچھا موضوع تھا۔ اکثریت اسی بات پر متفق ہوتی ہیں کہ جیسی بیٹی ویسی ماں، جیسا باپ ویسا بیٹا، اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے۔ عائشہ تنویر ویلڈن۔ اللہ پہ یقین رکھنے والوں پر یہ وہم اثر انداز نہیں ہوتے۔ "محبت سب سے بہتر ہے" سب سے پہلے تو فائزہ بھٹی میرے سے بھی منگنی کی مبارک وصول کرو اور اتنے اچھے افسانہ کی بھی۔ واہ، کیا تمہاری تحریر نے بنت سحر کی یاد دلا دی۔ ان دیکھا عشق ہو رہا ہے تم سے۔ ہاں ناں تجی، فائزہ جی اپنے منگیتر صاحب کو بھی پڑھانا تھا افسانہ۔ اگر نظم تمہاری اپنی ہے تو جناب خوش کیا اس شاعری نے۔ آئندہ کسی جیپ والے آرمی مین کی تحریر کی امید لگالی ہیں آہوتے ہور کی۔ ساڈے نال آرمی والوں کو بھی تو خوش رکھنا ہیں جناب آپ نے۔ "بازی مات نہیں" اور "مات" دونوں دلچسپ اور سبق آموز تھے "کرن" کا سرورق گرل کا حسن متاثر کن تھا اور اندر حورین کا دکھ۔ وہ دکھ زیادہ جان لیوا ہوتا ہے جس پر اک عرصے سے مٹی ڈال کر خوش رہنے کا ڈرامہ رچا ہوتا ہے۔ کی ہویا جے اک محبت ہور زل گئی۔ "یادوں کے دریچے" ہر دریچہ خوب صورت یاد سے سجا ہوا تھا۔ "کچھ موتی چنے ہیں" ہر موتی سچا موتی لگا۔ "کرن کتاب" ٹیکنالوجی سر سے گزر گئی میں نے بھی پروا نہیں کی اور آگے صفحے وہ امن دی کو پڑھنا شروع۔ اس بار سردی میں میری ہمسایہ ثمینہ اظہر نے بھی السی کے لڈو دیے تھے اور میں نے تیل کی پنیاں بنائی تھیں۔ ذہنی باؤ یہ ایسی بلا ہے جو قبر میں پہنچا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ "کچن اور آپ" فہمیدہ جاوید کے جوابات پسند آئے۔ حقیقت تو یہی ہے ناں جدید دور کے جدید کھانے ہو گئے ہیں۔ ہماری ممانی جب ہم چھوٹے تھے تو ساری دالیں اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر پکا کر دیتی تھیں اب وہی پرانی ریسپی کو جدید اسٹائل میں بنا کر کھایا جا رہا ہے۔ کرن کا دسترخوان خوب سجایا رکھا تھا۔ "نام میرے نام" کچھ نئے نام بھی شامل تھے، اچھی بات ہے۔ اقصیٰ شہزاد آپ کے بھائی، ماریہ نذیر آپ کی امی کا بہت افسوس ہوا۔ آپ کا یہ جملہ دل چیر گیا۔ آج سے میں آپ کی لسٹ میں شامل ہو گئی۔ رب سب پر کرم فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اقصیٰ شہزاد، ماریہ نذیر اور مجھے صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

ج: فوزیہ جی! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ موت کا وقت تو دعا بھی نہیں بدل سکتی۔ بس اللہ سے تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ آمین

صفیہ مہر ......خان پور

نیا ناول "دامن سحاب" فیوڈل لارڈ پر لکھا ناول میرا پسندیدہ ناول بنتا جا رہا ہے۔ آسیہ مرزا کا ناول "میرے ہم نوا" ارسلہ کا لالچ بڑھتا جا رہا ہے ایسے لوگوں کی وجہ سے زندگی جبس زدہ بن جاتی ہے۔ مکمل ناول "کنارہ خواب" فرح بخاری سوار کو صرف کنعان ملنی چاہیے رہی ثمامہ تو سوار کو اس کا اصلی چہرہ کب دکھے گا۔ ام ہانی "سیماب" واقعی بہنوں کی محبت بھائیوں کے لیے بلا مشروط ہوتی ہے، ویسے پہلا بھائی ایسا دیکھا جو بہن سے حسد کرتا ہے۔

ناولٹ "آدم اور حوا" میمونہ صدف اچھا موزوں لیے دل میں گھر کر گیا ہے ناولٹ "کانچ سے سائبان" میں واقعی یہ رشتہ شیشے کی مانند نازک ہوتا ہے، احتیاط اور برداشت سے یہ رشتہ قائم رہتا ہے، مصباح جی ایسے آتی رہیے گا۔ افسانے سارے بہترین اور اصلاحی تھے۔ انٹرویو سارے لاجواب تھے۔ "مقابل ہے آئینہ" بھی بہن کے جواب پسند آئے۔ "یادوں کے دریچے سے" فائزہ بھٹی کی ڈائری میں نقش نظم دل کو بھا گئی "کرن کرن خوشبو" سب بہنوں کی خوشبوئیں معطر کر گئیں "کچھ موتی چنے ہیں" ثانیہ مرید کا موتی زیادہ دلکش اور چمک دار لگا۔ "نامے میرے نام" ساجدہ جاوید، زرتاشیہ نعمان اور اقراء سرور کے خط دل چسپ لگے۔ کرن کتاب میں اورک کی چائے ہم کب سے یہ ڈھونڈ رہے تھے شکر اس بار اسے شائع کر کے آپ نے ہمیں خوش کیا۔ "کچن اور آپ" انیلا طالب کو پڑھ مزا آیا۔

ج: صفیہ جی! خوش نصیب ہیں آپ کہ آپ کو ایسے بھائی نہیں دکھائی دیے اور نہ اللہ دکھائے۔ مگر دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔

زرتاشیہ نعمان ...... ملتان

آداب! سب سے پہلے تو کرن کی پوری ٹیم سے تعزیت کروں گی کہ انہوں نے اپنی ایک دیرینہ ساتھی خالدہ جیلانی صاحبہ کو کھویا ہے۔ اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ وہ خالدہ جی کے درجات بلند فرمائے اور سوگواران کو صبر جمیل عطا کرے (آمین)۔ انف دل ...... افسردہ سے ملال میں گھر گیا یہ جان کر کہ اگلے ماہ "کنار خواب جو" کی آخری قسط ہو گی یقین مانیں یوں لگا جیسے فرح جی نے ہم سے کہا ہو "چلو اٹھو رخت سفر باندھو بہت رہ لیا تم لوگوں نے مری میں" فرح جی! اتنی بھی کیا جلدی ہے یار، ابھی تو پہلی برف باری دیکھی ہے۔ کچھ تھوڑا اور انجوائے کرنے دیں پلیز۔ اس بار افسانے پڑھ کر دب اکبر (ستاروں کا جھرمٹ) کا سا گماں ہوا مجھے۔ ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک افسانہ۔ تینوں ناولٹ بھی بے حد شاندار تھے۔ نازیہ کنول نازی کے ناولٹ "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" کی دوسری قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ "میرے ہم نفس" میرے ہم نوا بھی خوب جا رہا ہے۔ ارسلہ بی بی تم خوش رہو اپنی مادہ پرست دنیا میں کیونکہ اب نادیہ شاہ لوٹ آئی ہے آبص کی زندگی میں ...... تم جھولتی رہو اپنی ذات کے پنڈولوں میں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں ثانیہ مراد سے ملاقات ہوئی۔ جوابات پسند آئے۔ واہ۔ فہمیدہ جی اس بار تو آپ تھیں کچن میں لطف ہی آ گیا آپ کے جوابات پڑھ کے۔ آپ کو میرا نام پسند ہے، جان کر اچھا لگا مطلب نہیں پوچھیں گی میرے نام کا؟ "نامے میرے نام" میں سب پیاری پیاری بہنوں کے خطوط پڑھے مانو کہ سب سے آدھی ملاقات کر لی۔ ڈیئر عاصمہ ملک تمہارا اتنا کہنا ہی بہت ہے۔ پیاری بہنا سمجھ لو تم نے سب بھیج دیا اور میں نے کھا لیا۔ لیکن تمہارا خط پڑھ کے میں نے میاں سے اور بچوں سے پوچھا کسی نے السی کے لڈو ...... گڑ کے چاول ...... دال کا حلوہ اور کھجریلا کھانا ہے؟ میری ایک فرینڈ نے آفر کی ہے مجھے...... سب کو حیرت ہوئی سن کے۔ خوش رہو پیاری عاصمہ (آمین) جناب بشریٰ ملک آپ کتنا فنی خط لکھتی ہو۔ مزا آتا ہے پڑھ کے ایسے ہی لکھتی رہو شاباش۔ نئے گھر میں شفٹ ہوئی ہوں۔ ازحد مصروفیت ہے۔ لیکن کرن کو خط نہ لکھوں یہ ممکن نہ تھا۔

ج: زرتاشیہ! نئے گھر کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ گھر آپ کے لیے خوش قسمت ثابت ہو آمین۔ ڈھیروں مصروفیات کے باوجود خط لکھنے کا بہت شکریہ۔

بشریٰ یامین ملک ...... دریا خان ضلع بھکر

خالدہ جیلانی کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ فروری کا ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ زرتاشیہ نعمان! بہت اچھی نعت لکھی آپ نے، مبارک ہو بھئی، بیسٹ آف لک، اتنی اچھی نعت لکھنے پر میرے لیے۔ ملتان کے مشہور گول گپے تو پکے ہیں ناں؟ "مقابل ہے آئینہ" ثانیہ مرید کے جواب اچھے لگے "دامن سحاب" کی تیسری قسط بھی اچھی رہی۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے نازیہ کنول نازی کا ناولٹ بہت اچھا لگا خاص طور پر ناولٹ کا اسٹارٹ دل کو چھو گیا۔ افسانوں میں فائزہ بھٹی کا نام دیکھ کر

بہت اچھا لگا افسانہ بھی اچھا تھا بیسٹ وشز فاریو، "من شرالوسواس الخناس" بہت عمدہ افسانہ یار عائشہ! بہت اچھا ٹاپک چنا آپ نے۔ "خالہ امی" اچھا افسانہ تھا، جبیرا نوشین! آپ نے "ڈھال" لکھ کر ایک یاد تازہ کردی میں نے سیونتھ کلاس میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا نیل بڑھایا میں بھی اس نیل کی بہت کیئر کرتی تھی جب وہ نیل بہت پیارا سا لمبا سا ہوگیا تو ایک رات سوتے میں محمد علی نے کاٹ ڈالا صبح اٹھ کر دیکھا تو میں بڑی پریشان ہوگئی اور وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ، کارروائی جو اسی کی تھی۔ اس دن کے بعد میں نے آج تک نیل نہیں بڑھائے ہاہاہا۔ "کرن کرن خوشبو" میں ثناء شہزاد نے دلچسپ معلومات بھیجی ہوئی تھیں۔ میری مختلف (شش، میاؤں اور کتے کی آواز نکالنے سے) آوازیں سن کر تو نہ بھاگتی اگر بلی واقعی بہری ہوتی ہے تو۔ "کچھ موتی چنے ہیں" قاضی صبا ایوب کا موتی بہترین تھا "نامے میرے نام" اقصیٰ امان اینڈ شائستہ نصراللہ ویلکم اینڈ تسی چھا گئے ہوجی تہاڈی دوستی سانوں دل و جان توں قبول اے، اے بات تہاڈی بالکل ٹھیک اے "گوانڈیاں دا بڑا حق ہوندا اے" اقصیٰ شہزاد! آپ کے بھائی کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ماریہ نذیر! آپ کی والدہ کے لیے بھی دعا گو ہوں اور آپ کا پی پی ایس سی ٹیسٹ میں ناکام ہونا بہت دکھی کر گیا۔ لیکن یہ مت بھولنا کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انشراح اعمان، حورالعین اقبال، صبا راجپوت، اقراء گل نازش اور زاہدہ راجپوت! کرن کی محفل میں خوش آمدید، سحر وقاص راجپوت! آپ کی صحت یابی کے لیے دعائیں۔ "کچن اور آپ" فہمیدہ جاوید صاحبہ! آپ کے جواب بہت پسند آئے آپ کی کنٹرولنگ آف مائنڈ والی بات دل کو چھوگئی۔ سردیوں کی سوغات السی کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا زبردست ٹاپک ثمینہ اکرم اور ثناء شہزاد! یار میری فرمائشیں پڑھ کر آپ لوگ غائب ہوگئیں ہاہاہا مرضی ہے یار آپ کی......

ج: بشریٰ جی! غلطی کے لیے معذرت۔ بلی نہیں "دکھی" ہوتی ہے بہری۔

عاصمہ یامین ملک...... دریا خان ضلع بھکر

اپنی بہن آمنہ ملک کے خط سے نظریں چرا کر بھاگے دوسری جانب (کہیں خط سے گولا باری نہ شروع ہوجائے یہ بہن سخت جو بہت ہے) ہاہاہا۔ اقصیٰ اور شائستہ دیکھ لیں ہماری پاور گھر بیٹھے ہی لوگوں کو مجبور کر دیا ہاہاہا۔ ہائے داوے تھینک یو! مسکان نور فائزہ بھٹی، اقراء سرور، اقراء ممتاز اب کی بار بھی غیر حاضر یار کوئی غلطی ہوگئی ہو تو ایڈوانس سوری پر آ تو جایئے ویسے سب خیر ہے نا؟ ماریہ نذیر، بہت شدید دکھ ہوا (امی جان کا) اللہ رب العزت ان کی بخشش فرما کر ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) میں آپ کا اور اقصیٰ شہزاد کا خط پڑھ کر بہت رنجیدہ اور آزردہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین...... ہانیہ اور فوزیہ ثمر بٹ بھی شریک محفل نہ تھیں اور ماہا تبسم سسٹرز اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ صفیہ مہر! خواتین میں "ہمارا کچن" پڑھنے کو ملا مگر آپ ندارد! کیوں بھئی وجہ؟ گڑیا راجپوت بھی منظر نامے سے غائب ہوگئیں بھئی کیا ہوگیا سب کو۔ انشراح جی اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت والی عمر دراز عطا فرمائے۔ اور زری آپی نعت تو ماشاء اللہ پرفیکٹ اور زبردست تھی۔ اللہ آپ کے علم میں اضافہ فرمائے اور خوشیوں میں بھی آمین۔ سحر وقاص وعلیکم السلام! اور بشریٰ کی بچی سب کچھ تھام کر جب پڑھنا شروع ہوئی تو دو لفظی تعریف منہ چڑا رہی تھی۔ صبا راجپوت! میں صدقے جاواں کیا خوب تبصرہ کیا آپ نے ارسلہ پر دل چاہا آپ کا منہ چوم لوں (ارے مذاق ہے بھئی ہاہاہا) خالدہ جیلانی آہ! وہ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔ فہمیدہ جاوید! دل تھام لیجیے۔ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے میں متاثر ہوئی۔ اقصیٰ امان اور نمرہ اقراء کی غزلیں بے حد پسند آئیں۔ "کرن کرن خوشبو" میں موجود افشاں سمیع، شیخ سعدی کا تعویذ اور قاضی صبا کے انتخابات دل کو چھو گئے۔ "کچھ موتی چنے" میں سب کے موتی لش پش تھے مگر سب سے زیادہ جو بے خود کر گیا وہ تھا قاضی صبا ایوب کا (مبارکاں)۔ "کرن کتاب" تو کرن کی جان ہے اف اف (دیکھیں دل نے

شور مچا دیا تو میں کون ہوں؟ اب آپ خود جواب دیں ہاہاہا) ثانیہ مرید کے جوابات اچھے لگے۔ "دامن سحاب" نام کی طرح زبردست جارہا ہے۔ "میرے ہم نفس" بھی بہت اچھے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ "کنار خواب" تو ہے ہی میرا فیورٹ۔ "محبت فروری کی دھوپ" شمائلہ بھی زبردست تحریر لائیں۔ نازیہ کنول نازی تو ہیں ہی بیسٹ۔ ان سے زیادہ زیادہ لکھوایا کریں۔ "انتقام" نادیہ امین نے چونکا دیا اچھا لکھا بہت۔ "مجھے تیری ضرورت" انعم خان کیا لکھ ڈالا یار۔ ماہر نفسیات عمدہ تحریر تھی "ڈھال" بہت خوب لکھا حمیرا نے عائشہ تنویر کے تو کیا کہنے بہت اچھا لکھا "محبت سب سے بہتر" فائزہ جی "تا ے میرے نام" کی غیر حاضری معاف ہوگئی۔ ہاہاہا افسانہ اچھا تھا بہت اور باقی چاروں افسانے بھی زبردست اب کی بار افسانے 9 تھے۔ واہ بھئی عیش ہوگئے سب سے آخر میں بشریٰ یامین ملک، منی منی پپی برتھ ڈے اینڈ منی منی پپی ریٹرنز آف دا ڈے۔ گفٹ بھی لے لینا۔

ج: عاصمہ جی! کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

شہرین اسلم ...... چوک شاہدرہ بہاولپور

ٹائٹل سو سو تھا۔ اس کے بعد مزید صبر نہیں ہوا اور سیدھا جا پہنچے "کنار خواب جو" پر، مائی فیوریٹ ناول۔ عبدل ہی سوار ہے سوچا بھی نہیں تھا میں نے۔ ثمامہ پر بہت غصہ آیا اب کیا نئی چال چلنی ہے اس نے پہلے ہی بہت غلط ہو چکا ہے۔ ہمارے عبدل کے ساتھ پلیز مزید برامت کیجیے گا رائٹر جی۔ "میرے ہم نفس ہم نوا" ارسلہ پر جی بھر غصہ آیا آگے انجام کے لیے ریڈی رہنا (ارسلہ جی)۔ بیا کی معصوم محبت اچھی لگی۔ شکر ہے ہمارے سکندر بھائی کو بھی سمجھ میں آنے لگی ہے۔ حمزہ کو بدگمان مت کیجیے گا نادیہ سے۔ مکمل ناول "سیماب" پڑھ کر بہت ہی رونا آیا کیا بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں میرے بھائی تو بہت اچھے ہیں اچھا میسج تھا اسٹوری میں "دامن سحاب" ابھی اسٹارٹ ہے آئی ہوپ آگے چل کر ریکارڈ توڑنے والا ہے۔ مہوش جی بہت امیدیں ہیں آپ سے۔ افسانے تو ہوتے ہی بہترین ہیں کوئی نہ کوئی اچھا میسج ہوتا ہے ہر افسانے میں (مگر پڑھنے والا میری طرح سمجھ دار ہو) مذاق تھا جی سب ہی قارئین ہٹ ہیں۔ "کرن کتاب" میں اپنے نام کے اسٹارٹ ورڈ کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی پر کشش اور میں (ویری فنی) ہاں باقی باتیں ٹھیک تھیں پورے نام کے معنی تو آج تک معلوم نہیں ہو سکے فرسٹ ورڈ ہی سہی۔

☆ شہرین جی! صرف بہاولپور ہی نہیں سارا پاکستان خوب صورت ہے۔

اقصیٰ شہزاد ...... ڈھوک اعوان سکھر

ٹائٹل گرل بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن سردی کی مناسبت سے نہیں تھا۔ خالدہ جیلانی، میں اس نام سے اتنی واقف نہیں ہوں۔ اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔ زرتاشیہ نعمان نعت لاجواب تھی۔ "مقابل ہے آئینہ" کی طرف ثانیہ مرید اللہ آپ کے تمام خواب پورے کرے (آمین)۔ جب سے بھائی فوت ہوا ہے رسالے نہیں پڑھے۔ ویسے منگواتی ہوں ہر مہینے کہ پھر بعد میں ملیں گے نہیں۔ فروری کا رسالہ تھوڑا سا پڑھا ہے اسی پر تبصرہ کر رہی ہوں (مات) کوثر ناز، افسانہ حقیقت کے قریب تر تھا۔ (بازی مات نہیں) صدف سمیع کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ اطہر کو اپنی محبت مل گئی۔ (من شر الوسواس الخناس) عائشہ تنویر کا افسانہ ٹاپ آف دی لسٹ تھا، یہ تعویذ دھاگے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اللہ پہ یقین ہونا چاہیے۔ ناولٹ (انتقام) نادیہ امین کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ (ماہر نفسیات) فرح ریاض چیمہ، واقعی ماں سے بڑھ کر اولاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ (کرن کرن خوشبو لاجواب، یادوں کے دریچے سے) اقصیٰ امان اور نمرہ، اقراء کی غزل اچھی تھی۔ (کچھ موتی چنے ہیں) سارے موتی ہی اچھے تھے۔ (تا ے میرے نام) اس بار نئے چہرے بھی تھے ماریہ نذیر میرے الفاظ آپ کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتے۔ یقیناً یہ آپ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اللہ آپ کے والدین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ بہن بھائیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) چھ نومبر کو آپ کی امی آپ کو چھوڑ گئیں اور چھ دسمبر کو میرا بھائی ہمیں چھوڑ گیا۔ "کرن کتاب" بہت معلوماتی تھی۔ اس بار پورا کرن بیسٹ تھا۔ ثنا شہزاد، کہاں مصروف ہو بھئی۔ آجاؤ جلدی

سے۔ تبسم بشیر اور بابا بشیر آپ لوگ کہاں غائب ہو۔ اور ایک گزارش کرنی تھی آپ سے۔ کیا میں اپنے بھائی کے نام سے لکھ سکتی ہوں، پلیز۔

☆ اقصیٰ جی۔ ہم آپ کے بھائی کے لیے جذبات کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بہنوں کی محفل ہے۔

اقصیٰ امان......کوٹلہ جام بھکر

اس مرتبہ کرن کافی طویل انتظار کے بعد ملا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ خالدہ جیلانی کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا اللہ پاک مغفرت فرمائے ”حمد و نعت“ بہترین تھے۔ اس کے بعد ملاقات اسامہ سے زبردست رہی۔ ارے بھئی سحر خان! تم اتنی منت نہ بھی کرو تو میں تمہیں سن لیتی۔ ثانیہ مرید کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ ”دامن سحاب“ بہترین جا رہا ہے۔ ”کنار خواب جو“ مدتوں یاد رہنے والی اسٹوری ہے بس اب ہیپی اینڈ کے منتظر ہیں ”میرے ہم نفس میرے ہم نوا“ کی یہ قسط بہت بہترین تھی پلیز، عابص کی جان ارسلہ سے چھڑوا دیں غالب کا شعر مسکرانے پر مجبور کر گیا کیونکہ میری کزن جب بھی ہمارے گھر آتی ہے تو اس کا ہسبنڈ لازمی یہ میسج کرتا ہے۔ سب سے زیادہ انتظار تھا۔ ”جنہیں راستے میں خبر ہوئی“ وہ نازی آپی کے ناول کا تھا فیس بک پر دیکھ کر ہم تو خوشی سے بے حال کہ نازیہ آپی کا ناول کرن میں آرہا ہے، بہت زبردست تھا۔ نازی آپی آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ آپ کا ناول پتھروں کی لکیروں پر مجھے بہت پسند ہے۔ اللہ پاک آپ کو خوشیاں دے اور آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے۔ شائلہ دلعباد کا ناول بہترین تھا ناولٹ بھی زبردست رہے۔ ”انتقام“ زیادہ اچھا لگا فائزہ بھٹی کی آمد خوش کر گئی ہے، فائزہ بھٹی اپنے منگیتر کے بارے میں بتاؤ۔ ”مات“ اور ”من شر الوسواس الخناس“ بہترین افسانے تھے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ اقصیٰ شہزاد آپ کے بھائی کی اللہ پاک مغفرت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ پہلے دو اب تین ماشاءاللہ۔ بھئی آمنہ باجی بھی میدان میں آ گئی ہیں زبردست۔ عاصمہ اور بشریٰ کا تبصرہ شاندار تھا زرتاشیہ نعمان آپ مجھے اچھی لگتی ہیں آپ اور فائزہ بھٹی سے دوستی کی ریکویسٹ ہے۔

☆ اقصیٰ جی: خط ہمیں وقت پر مل جائے تو ضرور شائع ہوتا ہے طوالت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بے شک ہے کہ کسی ماہ ہمارے پاس صفحات کم پڑھ رہے ہوں تو کانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں ہم۔

انجشل خان انجی......چونیا

میں اگست 2020 سے ”کرن“ باقاعدہ خرید کر پڑھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو ”حمد و نعت“ نے قلب و ذہن کو منور کیا......اور ”خالدہ جیلانی صاحبہ“ کے لیے بھی میں دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں جنت معلیٰ میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ ”ثانیہ مرید“ سے آئینہ کچھ خاص نہیں کہتا۔ ”مہوش افتخار صاحبہ“ کا ”دامن سحاب“ اچھا چل رہا ہے اور فرح ریاض جی نے بھی درست لکھا کہ ماں سے بڑھ کر کوئی ماہر نفسیات نہیں ہوتا کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے کہ کب بچے کو پیار کی ضرورت ہے اور کب مار کی، ہاہاہاہا۔ ”شائلہ دلعباد صاحبہ“ نے بھی آخر میں رافیہ کے سارے کس بل نکال دیے......اور جہاں سوشل میڈیا نے اپنوں کو اپنوں کے قریب کیا ہے وہاں ہی ہماری چند کوتاہیوں سے کبھی کبھی ہم بہت بھاری نقصان بھی اٹھاتے ہیں اسی لیے ہی کہا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنی حد میں ہی اچھی لگتی ہے حد سے زیادہ تو ”محبت“ بھی ہو جائے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ عمدہ تحریر تھی۔ ”ذرا سی روشنی زندگی ہے“ یہ تحریر بس ٹھیک ہی تھی۔ ”نازیہ کنول نازی جی“ نے بھی دل جیت لیا ”جنہیں راستے میں خبر ہوئی“ پہلی قسط تو اعلا تھی آگے بھی ان شاء اللہ بیسٹ ہی ہو گا سب کچھ۔ آگے چل کے ”ان ظرنا فاطمہ“ جی کے ”نسخہ عشق“ نے بھی ”نسخہ“ دیا کہ ہر معاملہ شور و غل سے حل نہیں ہوتا کچھ معاملات ہماری دانشوری کا ثبوت بھی مانگتے ہیں اور مسلسل چلنے والا کبھی نہ کبھی تو منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ اب باری آتی ہے اس تحریر کی جو میری پسندیدہ ہے جس نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا۔ جی ہاں! ”فرح بخاری جی“ کا ”کنار خواب جو“ اب میں کیا لکھوں یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوں کے اگلے ماہ میں اس کی آخری قسط پڑھوں گی۔

میرے پاس الفاظ کم پڑ رہے ہیں اس تحریر نے تو دل باغ باغ کر دیا بس "فرح جی" ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ہمیں ایسے ہی نایاب تحفوں سے نوازتی رہیں گی۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔ "حمیرا نوشین" کا "ڈھال" بھی اچھا تھا لیکن "نادیہ امین" کے "انتقام" نے تو کمال کر دیا۔ کبھی کبھی ہم برا کرتے کرتے بھی اپنے حق میں کچھ بہتر فیصلے کر جاتے ہیں یوسف نے بھی وہی کیا! "فائزہ بھٹی" کی تحریر "محبت سب سے بہتر ہے" اچھی لگی لیکن حقیقت سے قدرے دور تھی۔ آسیہ مرزا کا ناول "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" بھی اچھا جا رہا ہے لیکن زیادہ طویل نہ کریں بس بات کو سمیٹ دیں۔ مینال بادی کا "خالہ امی" بھی ٹھیک تھا۔ انعم خان کا "مجھے تیری ضرورت ہے" عمدہ ولاجواب تھا، باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ "کرن کرن خوشبو" بھی سب فنٹاسٹک تھا۔ "یادوں کے دریچے" میں سب کچھ ہی اعلیٰ تھا۔ "نام میرے نام" میں سب کے تبصرے ہی شاندار تھے۔ ماریہ نذیر......! آپ کی والدہ کو اللہ جنت معلیٰ میں مقام عطا فرمائے، آمین۔ ہم آپ کے غم میں شریک ہیں۔ زرتاشیہ نعمان آپ کا نام بہت ہی منفرد ہے۔ کیا آپ مجھ سے دوستی جیسا عظیم تعلق استوار کر کے مجھے ایک خوشی دینا پسند کریں گی؟ کیونکہ مجھے دوست اور دوستی دونوں سے ہی محبت ہے۔ میں جواب کی منتظر رہوں گی، اللہ آپ کو سلامت رکھے (آمین)۔ اقصیٰ شہزاد اللہ آپ کے بھائی کے درجات بلند فرمائے۔ انشراح اعمان آپ نے دھواں دار انٹری ماری...... اور آپ کے لیٹر نے آخر کار کرن میں آٹھ چاند لگا ہی دیے...... پھر میرے نام سے تو سولہ چاند لگنے کے امکانات ہیں ہاہاہاہا...... میں آپ سے بھی دوستی کی درخواست گزار رہوں۔

☆ انجشل جی! کرن میں خوش آمدید۔ امید ہے آئندہ بھی ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔ آپ نے خط میں اپنی تحریر کے بارے میں لکھا ہے اگر وہ کوئی افسانہ ہے تو معذرت چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں موصول نہیں ہوا۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

کرینہ کپور سے ملتی جلتی ماڈل سرورق پر براجمان تھی۔ دل کو بہت بھائی۔ آگے بڑھے اسامہ اور سحر خان سے ملاقات کی۔ "مقابل ہے آئینہ" ثانیہ مرید جواب دے رہی تھیں۔ جب کتا پیچھے لگتا ہے تو مزا آتا ہے آپ اس منظر کو انجوائے کرتی ہیں۔ پھر تو آپ روز ہی یہ مزے لے کر انجوائے فرماتی ہوں گی۔ لیکن بہنا ڈرتی رہو کسی خوں خوار کتے سے پالا نہ پڑ جائے جو آپ کی ٹانگ کی بوٹی لے اڑے "دامن سحاب" اٹھان پکڑے گا، شروع سے ہی بہترین ہے۔ "ماہر نفسیات ہر ماں تو ہوتی ہی ماہر نفسیات ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے دل کا حال جان لیتی ہیں۔ "ذرا سی روشنی زندگی ہے" ظالم بیگمات کی حقیقی کہانی لگتی ہے۔ واقعی بیگمات غریب محنت کش خواتین کا استحصال کرتی ہیں۔ کاش ہر محنت کرنے والی کو کوئی سکندر مل جائے۔ "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" ہمیں کہانی کے آخر میں خبر ہوئی کہ باقی آئندہ۔ یہ باقی آئندہ بدمزا کر دیتا ہے۔ "نسخہ عشق" لاجواب تھا۔ سعد غوری نے آغا غوری کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی من کی مراد پالی۔ "ڈھال" بھائی واقعی بہنوں کی ڈھال ہوتے ہیں۔ سرد گرم سے ان کو بچانے کے لیے کچھ سختیاں کرتے ہیں۔ "انتقام" اچھی کہانی تھی۔ سفاکیت بھی انتہا پر تھی۔ بچیوں کے لیے سبق آموز تھی۔ "محبت سب سے بہتر" حقیقت میں میاں بیوی کی آپس میں بنی ہو تو وہ سائیکل کی سواری پر بھی خوش ہوتے ہیں۔ "میرے ہم نفس ہم نوا" آسیہ مرزا نے بہت اچھا کیا آبص اور نادیہ کا آمنا سامنا اور رابطہ کروا دیا۔ "خالہ امی" یہ خالہ پھپھو بھتیجی بھانجی والے رشتے کیوں بھلا دیتی ہیں۔ "مجھے تیری ضرورت ہے" کچھ خاص نہیں تھی بچپن سے ہر بات سہنے والا میچور عمر میں آ کر کیوں گستاخ ہو جاتا ہے اور اپنا غصہ بے چاری بے گناہ ارفع پر نکالتا ہے۔ "من شر الوسواس الخناس" بدگمانی کی کہانی تھی۔ کسی کے پاس فالتو وقت نہیں ہے کہ دوسروں پر جادو ٹونے کرتا پھرے۔ یہ صرف وہم اور بدگمانیاں ہوتی ہیں۔ "بازی مات نہیں" یہ مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں انہیں بیٹا بیٹی کی پسند سے خواہ مخواہ چڑ ہو جاتی ہے لیکن شکر ہے اطہر کی والدہ سمجھدار تھیں سائرہ کو بہو بنا کر اپنا اور اپنے بیٹے

کا دل خوش کر دیا۔ "مات" حورین غریب حذیفہ سے
بدگمان رہی لیکن اسے مات دینے والے اس کے والدین
تھے۔ کچھ موتی چنے میں اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔

☆ زرینہ جی۔ مرد کا بس کسی اور پر نہیں چلے تو وہ اپنا
غصہ بیوی پر ہی نکالتا ہے۔

عائشہ کیانی...... میرا موہڑہ

فروری کا شمارہ ہاتھ لگا۔ پہلے تو حال احوال پوچھا
(کہتا میں بہت پیارا ہوں آپ کی طرح) ہاہاہا۔ پھر سیدھا
بھاگی "نامے میرے نام" سلسلے کی طرف کیونکہ مجھے یہ
جاننے کی بے چینی تھی کہ میری قارئین کو میرا انٹرویو کیسا
لگا۔ ان بہنوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میرے
انٹرویو کو پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں ان سب کو
نام کے ساتھ شکریہ بولنا چاہتی ہوں۔ زاہدہ راجپوت،
فہمیدہ جاوید، صبا راجپوت (صبا جی! بہت شکریہ جناب،
بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا)۔ اقصیٰ شہزاد (بہت دکھ ہوا
آپ کے بھائی کا جان کر۔ اللہ ان کے درجات بلند
کرے، آمین)۔ ماریہ نذیر (ماریہ جی! آپ کا خط پڑھتے
ہوئے آنکھیں بھیگ گئیں، اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو
جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا کرے، آمین)۔ بشریٰ
یامین (میں تو ٹافی نہیں لیتی، مجھے کچھ اور چاہیے، تب ہی
راضی ہوں گی۔ اب سوچو سوچو...... مجھے کیا چاہیے، ہی ہی
ہی)۔ عاصمہ یامین (آپ کا بھی بہت شکریہ۔ آخر میں
زرتاشیہ نعمان (زرتاشیہ جی! میں آپ کو امیچور کہاں سے
لگی (جاؤ میری کٹی آپ سے ناج ہوں میں) ہاہاہا۔ شکریہ
زرتاشیہ جی! اچھا لگا آپ نے جو محسوس کیا کہہ دیا لیکن میرا
یقین کریں، میں اچھی بھلی سمجھدار لڑکی ہوں، ہاہاہا۔

☆ عائشہ جی! معذرت سالگرہ نمبر کی وجہ سے
صفحات کم تھے، آپ کی دوستوں کو جگہ نہیں دے سکے اس
محفل میں۔

قدسیہ رشید...... نامعلوم

کرن ڈائجسٹ کی ہر کہانی، ہر ناول بیسٹ ہوتا
ہے۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں اور قاری بہنوں کی
رائے بھی لیکن میں کسی ناول، کہانی کے بارے میں رائے
نہیں دوں گی کیونکہ میں ایک گاؤں میں رہتی ہوں اور
ڈائجسٹ لینے کے لیے بازار جانا پڑتا ہے۔ اب بھائی
جائے گا تو خط بھی پوسٹ کر دے گا اور ڈائجسٹ بھی لے
آئے گا لیکن میں جانتی ہوں سپر ہوگا کرن۔

☆ قدسیہ جی! آپ اپنی کہانی بھیج سکتی ہیں۔

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

ٹائٹل کو دیکھ کر مجھ سے پہلے امی بول پڑیں۔ ہائے
ہائے فیشن کو پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے، اتنا پیلا رنگ (میک
اپ) دیکھ کر ہمارے زمانے میں بندے کو اسپتال جمع
کروا دیتے تھے، ہاہاہا۔ بائی داوے مجھے تو پسند آئی ماڈل
گرل۔ "دامن سحاب" مہوش افتخار اسٹارٹ سے لگ رہا
ہے کہ آپ قلم کے ذریعے دل میں راہ بنانے والی ہیں لیکن
طیبہ کی طلاق، خلیل کی بہن سے محبت اور میمونہ بھابھی کا
خیال رکھنے کا انداز یہ سب ذہن کو "نند" ڈرامے کی طرف
لے جاتا ہے اور اگر خلیل مرجائے بس پھر تو...... "میرے
ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا افف...... ارسلہ کیسی لڑکی
ہے۔ کیا حقیقت میں ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ مکمل ناول
میں پہلا قرعہ "کنار خواب جو" کا نکلا۔ میرے سارے
تکے غلط ثابت ہوئے کیونکہ میں شازمہ کو ماہین سمجھی تھی اور
میرے ذہن میں ایک بار بھی یہ بات نہیں آئی کہ عبدل ہی
سوار ہوگا۔ اس معاملے میں ایگزیکٹ اندازے اقراء
سرور کے رہے۔ انسان کیا کرے محبت دل پر قابو کب
رہنے دیتی ہے۔ میمونہ صدف کی تحریریں سنجیدہ اور دل کو
چونکانے والی ہوتی ہیں اور یاد آیا مجھے لگ رہا ہے، اچھوتا
لکھنے والی ام ہانی محبت کے منتر سے، بہت جلد قارئین کو اپنا
گرویدہ بنانے والی ہیں۔ اب تھوڑا سا تبصرہ جنوری کے
شمارے پر بھی ہو جائے۔ "کانچ سے سائبان" قسمے آخری
قسط پڑھ کر دل خراب ہو گیا۔ میں جانتی ہوں بے جا تنقید
دکھ دیتی ہے لیکن مجھے فنی لحاظ سے یہ ناول کمزور لگا۔
معذرت خواہ ہوں مصباح علی سید نے اب کی بار کافی
مایوس کیا۔ اژدھے کے بعد "کردار" ام اقصیٰ ہر موضوع پر
بہترین لکھنے والی ہیں۔ مستقل سلسلے بھی زیر عتاب آئے۔
لیکن ماحول کو خوش گوار بنانے والا سلسلہ "نامے میرے
نام" میں پھنس ہی گئی۔ میرا "مقابل ہے آئینہ" اس قدر
پسند کیا جائے گا، مجھے امید نہیں تھی خوشی سے آنکھیں بھیگ

سی گئیں۔ ساجدہ جاوید سندیلو، فائزہ بھٹی، بشریٰ یامین، زرتاشیہ نعمان، اقصیٰ شہزاد اور شہرین اسلم دعاؤں کے لیے بہت شکریہ۔ زرینہ خانم آپ کا "ہماری گڑیا" کہنا قسم سے سرشار کر گیا۔ مزاج کے بدلتے انداز کی ترجمان اقراء سرور دعا کے لیے شکریہ۔ میری تحریریں تمہاری آنکھیں ان شاء اللہ ضرور پڑھیں گی اور آپ کی میری آنکھیں......بس دوبارہ غائب ہونے کی بات مت کرنا، خوش رہو۔ (اور ہاں میں مسکرا بھی دی ہوں بلکہ بار بار پڑھنے پر مسکرا رہی ہوں) مسکان نور ڈائجسٹ کے قارئین ایک فیملی کی طرح ہیں۔ ہاں ایک بات جو میں نے سب سے آخر کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ "مقابل ہے آئینہ" عائشہ کیانی کے جنوری کے شمارے میں کچھ سوالوں کے جواب بالکل پسند نہیں آئے۔ جیسے حکومت والا سوال کہ اکاؤنٹس بھرنا شروع کردوں گی۔ باقی خیر سب کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔

☆ گڑیا جی! کہانیاں ایک دوسرے سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتی ہیں لیکن لکھنے کا انداز انہیں دلچسپ اور نئے رنگ دیتا ہے۔ مہوش جی کی یہ اسٹوری ہمارے پاس "تند" ڈرامے سے کافی پہلے سے رکھی تھی۔

مریم خان...... پھلروان سرگودھا

سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ سروے میں حصہ لینے کا سوچا مگر پھر خیال آیا اپنی سالگرہ کبھی مناتی نہیں تو سروے میں کیا لکھوں؟ ہاں پچھلے سال میرے بیٹوں نے اپنی پاکٹ منی سے مجھے گفٹ دیے تھے۔ ہاں ہر بچے کی باقاعدگی سے ہر سال مناتے ہیں۔ عائشہ کیانی سے "لکڑ چھو" کے بارے میں پوچھنا تھا کہ یہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔ ہم تو نام بھی کبھی نہیں سنا۔ "دامن سحاب" میں مجھے لگتا ہے کہ طیبہ گردیزی ہاؤس کی سب سے چھوٹی بہو ہوگی، کیا خیال ہے بہنوں کا اس بارے میں۔ آگے بڑھے، میمونہ صدف نے "آدم وحوا" میں ایک سنگین مسئلہ لے کر آئیں اور مجھے لگتا ہے کہ پوسٹ پریگننسی ڈپریشن میں تقریباً سب ہی عورتیں مبتلا ہوتی ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ کیونکہ میں خود بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی پیدائش کے بعد کافی عجیب ہوگئی تھی نہ نیند آتی اور نہ بھوک لگتی جو کہ ڈپریشن کی ابتدائی علامات ہیں۔ مگر کسی نے سمجھا تو کیا تھا، بس سب کا رویہ میرے ساتھ بہت برا تھا۔ تین چار سال بعد میں خود اس فیز سے نکلی تھی، کچھ وردو وغیرہ پڑھ کر۔ اگر بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ہر روز ساٹھ بار پڑھ کر اپنے اوپر اور پانی پر دم کرلیا جائے اور وہ پانی وقتاً فوقتاً پی لیا جائے تو بھی کافی افاقہ ہوتا ہے ڈپریشن میں۔ "تم میرے لیے کافی نہیں ہو" کبھی نہ کبھی تو ہر شوہر اس طرح کا برتاؤ کرتا ہی ہے۔ "کنارے خواب جو" میں فرح بخاری نے سوار اور کنعان کو اتنے قریب کرنے کے بعد ایک دم سے اتنے دور کردیا جبکہ ایسے لگ رہا تھا کہ ایک دو اقساط کے بعد شاید کہانی اختتام پذیر ہوجائے لیکن ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے بھئی۔ "کانچ سے سائبان" کا اختتام اچھی نصیحتوں کے ساتھ اچھا ہوا۔ "انسان صفت" میں کنیز زہرہ نے اچھا پیغام دے دیا۔ "سیماب" میں ام ہانی نے جس بھائی کی کہانی دکھائی ایسے بھائی شاید خال خال ہی ہوتے ہوں۔ کوئی بھائی اتنا کٹھور، اتنا حاسد بھی ہوسکتا ہے؟ باقی زارا امجد کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" میں سب کی ہجر کہانی چل رہی ہے، دیکھتے ہیں ملن کب ہوتا ہے۔ "سدرہ آن ڈائٹ" اور "نیلم پری" بھی اچھے تھے۔ تمام سلسلے اور تمام خطوط اچھے تھے۔ میرا خط بھی شامل سلسلہ کیا، شکریہ اس کے لیے۔ نام کے پہلے حروف کے ذریعے تجزیات کافی حد تک صحیح ثابت ہوئے۔ انیلا طالب صاحبہ یہ بھی بھی کا پکانا شادی سے پہلے کا ہوتا ہے، دعا کریں کہ شادی کے بعد بھی ایسا ہی ماحول ملے ورنہ سسرال میں پذیرائی کم اور تنقید زیادہ ہوتی ہے۔

☆ مریم جی! کہانی میں تاثر پیدا کرنے کے لیے ذرا سے زیادہ دکھایا جاتا ہے۔ ویسے تو کاروکاری، جائداد کے جھگڑے وغیرہ میں ہمارے ہاں اکثر بھائی ایسا ہی ظلم کررہے ہیں۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

عائشہ کیانی "مقابل ہے آئینہ" عائشہ آپ تو لڑکی سے محبت کرتی ہو۔ میں نے لڑکے کو لڑکے کے لیے روتے دیکھا ہے، ہے ناں عجیب تر؟ ہوتا ہے ایسا بھی۔ اللہ تعالیٰ

کی مرضی جس کا دل جس طرف مرضی موڑ دے۔ آپ سے ملاقات اچھی لگی۔ ''دامن سحاب'' مہوش افتخار آ گئیں اور چھا گئیں۔ دوسری قسط بہت اچھی لگی۔ زمین داروں کی کہانیاں ہی تو مزا دیتی ہیں۔ ''کردار'' ام اقصیٰ کا سبق آموز افسانہ اچھا لگا۔ ''آدم اور حوا'' میمونہ صدف کا ناولٹ اچھا تھا۔ ہر رشتے میں توازن ضروری ہوتا ہے۔ مرد بھی مجبور نہیں ہوتا۔ پسند کی شادی میں ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہم لڑکیوں کو سبق سیکھ لینا چاہیے کہ پسند سے شادی نہیں کرنی کبھی بھی۔ ''تم میرے لیے کافی نہیں ہو'' حوریہ بتول کا افسانہ اچھا تھا۔ ہر چیز کی زیادتی بری ہوتی ہے، چاہے وہ محبت ہی کیوں نہ ہو۔ ''کنار خواب جو'' ماضی کھول دیا۔ جلدی سے آخری قسط لکھ دیں اب۔ بے تابی سے انتظار ہے۔ آپ کا ناول مدتوں ذہن پر نقش رہے گا۔ بہت خوب فرخ بخاری۔ ''کانچ کے سائبان'' چھ اقساط پر مشتمل مصباح کا ناول اختتام کو پہنچا۔ پہلی قسط سے آخری قسط تک دلچسپی ہنوز برقرار رہی۔ ''انسان صفت'' کنیز زہرا کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ انسان کا کام اور خوبیاں ہی اس کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ ''سیماب'' ام ہانی کا ناول سبق آموز تھا۔ زندگی میں کی گئی غلطیوں کی سزا ایک دن ضرور ملتی ہے۔ ام ہانی سو نائس، مبارک باد۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا ارسلہ کو کوئی عقل دے دیں اب۔ دوسروں کی زندگیاں تباہ کر رہی ہے۔ نادیہ اور آبص کو ہی ملنا چاہیے۔ ''سدرہ آن ڈائٹ'' خوش بخت کا ہلکا پھلکا افسانہ اچھا لگا۔ سدرہ تم اتنا کیسے کھالیتی ہو یار۔ دعا کرو سب میں بھی موٹی ہو جاؤں۔ ''تیلم پری'' لبنیٰ جمشید کا سبق آموز افسانہ بہت اچھا تھا۔ ''کرن کرن خوشبو'' ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ یہ سلسلہ میرا فیورٹ ہے۔ ''یادوں کے دریچے'' میرا انتخاب پسند کرنے کا بہت شکریہ اور شامل کرنے کا بھی۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' سارے موتی بیش قیمتی تھے۔ شیطان اور حکومت پڑھ کر ہنسی آئی۔ ''نامے میرے نام'' زرتاشیہ، شہرین اسلم، فہمیدہ جاوید، زرینہ خانم، سحر وقاص، ساجدہ جاوید، اقراء سرور، مسکان نور، آمنہ عاصمہ، گڑیا راجپوت، گل رخ اور مریم خان کا تبصرہ اچھا تھا۔ گڑیا راجپوت بھی میں لکھ ہی لوں گی افسانہ۔ ویسے مجھے بڑا شوق ہے مگر لکھنا نہیں آتا ذہن میں خیالات بھی لاتعداد ہیں۔ بس دعا کرنا لکھ لوں بھی اور خط لمبا ہونے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ مجھے خود بھی پتا نہیں چلتا کیسے قلم آگے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، ہاہاہا۔ اور کرن پر تبصرہ تو لمبا ہی بنتا ہے ناں۔ رائٹرز کا بھی حق ہے ان کی تحریروں پر تعریف و تنقید کی جائے۔

☆ ماریہ جی! جس طرح خط لکھتی اس طرح لکھنے بیٹھیں۔ یقیناً لکھ لیں گی، بعض اوقات انسان کو خود اپنی صلاحیتوں کا علم نہیں ہوتا۔

سحر وقاص راجپوت...... لاہور

فہرست دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ نو افسانے تین ناولٹ دو مکمل ناول۔ واہ جی واہ۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف تو جناب سب سے پہلے نازیہ کنول نازی صاحبہ کو خوش آمدید ان کا نام پڑھ کر ہی ناولٹ کی جانب دوڑ لگائی۔ ''جنہیں راستے میں خبر ہوئی'' ہیرو اور ہیروئن کے یونیک نام بہت ہی خوب صورت لگے۔ سوزان اور انجشاء۔ دونوں کی کھٹی میٹھی لڑائی اور دل میں چھپا ایک دوسرے کے لیے پیار بہت پسند آیا۔ ''کنار خواب جو'' اگر سوار کنعان کو پہلے ہی اپنا ماضی بتا دیتا تو رفیق سر کو قائل کرنا آسان ہوتا۔ آخری قسط میں کنعان اور سوار کو ہی ملائیے گا۔ ''انتقام'' کیا کوئی انتقام میں اتنا اندھا ہوتا ہے کہ سگی بہن کو قتل کر دے اور زینب کی دفعہ بھی وہی کچھ دہرائے۔ خیر یوسف کا کردار اچھا لگا۔ ''مجھے تیری ضرورت ہے'' حارث جن حالات میں پلا بڑھا جہاں دوسروں کے طنز اور تنقید کا سامنا کرنا پڑے وہاں ایسے ہی کمزور شخصیت کے مالک انسان جنم لیتے ہیں۔ ''محبت فروری کی دھوپ'' شائلہ دلعباد نے بڑے نازک موضوع پر لکھا، سوہا جو ماں کی آنکھوں سے دیکھتی اور ماں کے دماغ سے ہی کام لیتی تھی، کتنی بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' سکندر تمہارے ساتھ بیا جیسی مخلص اور بے ریا لڑکی ہی اچھی لگتی ہے۔ اب اپنا گھر بساؤ اور ارسلہ کو خوب جلاؤ۔ ''دامن سحاب'' کا تبصرہ آئندہ ماہ کے لیے محفوظ۔ اسامہ اعظم خان جو کہ میرے ننھیالی شہر سے تعلق رکھتے ہیں، کافی میچور طبیعت کے مالک لگے۔

بجز اس ڈرامہ کی ہیروئن درخشاں سلیم کا بھی انٹرویو کریں نا، اس بار آئینہ ثانیہ مرید کے مقابل تھا، پسند آیا۔ امیر مینائی کی حمد لاجواب زرتاشیہ کی نعت بے مثال، جزاک اللہ خیرا۔ اب ہو جائے بات افسانوں کی فائزہ بھٹی "محبت سب سے بہتر ہے" زوار اور زوبیہ کی محبت بھری کہانی اچھی لگی۔ "ماہر نفسیات" ہاں جی بالکل صحیح کہا کہ ماں سے بڑا ماہر نفسیات کوئی نہیں جو بچے کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر ہی دل کا حال جان لیتی ہے۔ "ڈھال" بالکل بن باپ کے زمانے کے تھپیڑے کیسے سہنے پڑتے ہیں یہ ہم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ جب باپ کا شفیق سایہ سر پر نہ رہے اور بھائی بھی چھوٹے ہوں، ننھیالی اور ددھیالی بھی کفالت سے ہاتھ اٹھالیں تو زندگی کیسے گزرتی ہے آہ...... پر صد شکر اللہ نے ساتھ دیا اور کامیابیاں نوازیں۔ "من شر الوسواس الخناس" عائشہ تنویر بہت اچھا سبق دیا۔ "نسخہ عشق" ہاں جی...... کبھی کبھار گھی سیدھی نہیں ٹیڑھی انگلی سے نکالنا بھی پڑ جاتا ہے، جیسے کہ سعد غوری نے کیا اور اپنی محبت پالی۔ "مات" کوثر ناز نے موضوع پرانا منتخب کیا، پر کہانی اچھی تھی۔ "بازی مات نہیں" بس ٹھیک ہی تھا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "خالہ امی" کا موضوع بھی پرانا تھا۔ "ذرا سی روشنی زندگی ہے" ہاں جی، حنا اصغر صاحبہ آپ نے بالکل صحیح کہا۔ "کرن کرن خوشبو" حریم سلمان کا انتخاب اچھا تھا اور "علم" گڑیا راجپوت کا بھی ٹھیک تھا۔ عائشہ کیانی انقلابی لوگ واقعی ایران کے امام خمینی جیسے ہی ہوتے ہیں۔ "کچھ موتی چنے ہیں" زبان کا گھاؤ زبردست بات۔ کرن کی تمام محفل میں شریک ہونے والی بہنوں کو سلام۔ ماریہ نذیر تمہاری والدہ کے بارے میں جان کر دلی افسوس ہوا، اللہ پاک انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور بلند پایہ مقام عطا کرے، آمین۔ مدیرہ جی آپ نے میرا خط بہت زیادہ ہی کٹنگ کر کے لگایا پھر بھی ہم ایک بار پھر تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ اقصیٰ شہزاد اللہ پاک آپ کے بھائی کو اچھے مقام پر رکھے اور اپنی خاص رحمت سے نوازے، آمین۔ عائشہ کیانی میرا خط پسند کرنے کا شکریہ۔

☆ سحر وقاص جی! آپ نے خط کی ایڈیٹنگ کی شکایت کی ہے۔ آپ کی شکایت اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ آپ سب قارئین اتنی محنت سے خط لکھتے ہیں۔ تو پھر سب کا دل چاہتا ہے کہ خط بغیر کانٹ چھانٹ کے لگے۔ لیکن مجبوری کہ ہمیں ایک ڈائجسٹ میں سب کچھ دینا ہوتا ہے۔ سب قارئین کو شامل کرنا ہوتا ہے تو مجبوراً خط کو ایڈٹ کرنا پڑتا ہے۔

گل رخ نوید...... کراچی

فروری کا رسالہ ملا، اقصیٰ شہزاد کا خط پڑھا اور چند لمحے کے لیے تو ذہن رک سا گیا۔ اقصیٰ جی! آپ کے بھائی کا سن کر بہت افسوس ہوا مگر اللہ کے کاموں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ انسان اس میں کچھ نہیں کر سکتا اور آپ کے بھائی کی زندگی بس اتنی ہی تھی اور آپ کا یہ کہنا کہ میں جلد ہی چلی جاتی تو یہ سب نہیں ہوتا۔ ایسا بالکل بھی نہیں، آپ کے بھائی کی موت ایسے ہی لکھی گئی تھی۔ اللہ آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر عطا فرمائے' آمین۔ اداریہ میں خالدہ جیلانی صاحبہ کو پڑھا، افسوس ہوا۔ اداریہ کے لیے ان کی کاوشوں کے بارے میں جانا۔ واقعی جو لوگ اچھے کام زندگی میں کر کے چلے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ ناول کی طرف "کنار خواب جو" پلیز فرح جی کہانی کا اتار چڑھاؤ اپنی جگہ مگر کنعان اور سوار کا اینڈ بھرپور انداز میں ہونا چاہیے۔ مطلب دونوں کو جدا مت کرنا۔ "محبت فروری کی دھوپ" ویل ڈن شمائلہ! آپ نے بہت ہی اچھے موضوع پر بہت ہی شاندار تحریر لکھی ہے۔ امید ہے آج کی نسل اس سے مستفید ہوگی۔ "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کی تحریر کافی عرصے بعد پڑھنے کو ملی اور اچھی لگ رہی ہے، مگر باقی آئندہ ماہ؟ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" اور "دامن سحاب" بھی اچھے جا رہے ہیں۔ "محبت سب سے بہتر ہے" فائزہ بھٹی اچھی کوشش...... آگے بھی لکھنا۔ باقی افسانے بھی زبردست ہیں مگر جس نے مجھے متاثر کیا وہ افسانہ ہے "من شر الوسواس الخناس" زبردست عائشہ! ابھی ناول بھی لکھنا اچھا اور بہترین لکھ سکتی ہو۔ "کرن کتاب"

میں سارے ہی سلسلے بہت اچھے تھے جو مجھے زیادہ پسند ہے وہ ''کرن کرن خوشبو'' اور ''کچھ موتی چنے ہیں'' ہیں۔ سب سے بہترین موتی شاہ شہزاد اور اقصیٰ شہزاد کے تھے۔

☆گل جی! بے شک آپ نے درست کہا کہ موت کا وقت تو اٹل ہے۔ انسان بس کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لیتا ہے۔

ثانیہ بلال...... عالی والا

رسالوں میں میری جان ہے۔ ''کانچ سے سائبان'' کا اختتام ہوا۔ ہمیشہ کی طرح مصباح سید نے لاجواب لکھا۔ ''دامن سحاب'' ایک مزا دینے والا ناول ثابت ہونے والا ہے۔ آسیہ مرزا نادیہ کی شادی حمزہ سے ہی ہو اور سکندر کی اریبہ سے۔ واہ رے سوار کا ماضی جان کر دل کھٹا ہو گیا سوار سے۔ اور کنعان بی بی اب کیا ہو گا تم دونوں کا۔ ماریہ نذیر آپ کی والدہ کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ایک سہل ملک اعوان خط لکھتی ہیں، میں ان کے خط شوق سے پڑھتی تھی، وہ کہاں چلی گئی ہیں اور ماہا۔ اور اس کی بہن وہ سب کہاں ہیں۔ آئی مس یو میری پیاری سی بہنوں۔ اور زینب نور سے تو مجھے ویسے ہی پیار ہے۔ وہ تو ہوں ہی میں۔ ساری باتیں میری والی اور واقعہ بھی چھپکلی والا ہمارے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ بشریٰ یامین ملک شکریہ میری بہن، میری امی کے لیے دعا کی آپ نے۔ ثریا انصاری، اقراء سرور، فائزہ بھٹی، ریحانہ چوہدری میں آپ کی چھوٹی سی دوست بننا چاہتی ہوں، کیا آپ کو قبول ہے میری دوستی۔

☆ثانیہ جی! خط لکھنے کا شکریہ۔

ساجدہ جاوید سندیلو...... ٹنڈو محمد خان

خالدہ جیلانی نہیں رہیں اور ہمارا دستر خوان خالی ہو گیا۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبر، آمین۔ نعت رسول مقبول ﷺ، زرتاشہ نعمان کیا یہ آپ نے خود لکھی ہے۔ اگر ہاں تو...... ماشاء اللہ۔ ''نامے میرے نام'' کی محفل میں بہت ساری فرینڈز کے جوابات کافی خوب صورت تھے مجھ سمیت، ہاہاہا۔ اتنے دنوں سے اکیلی معصوم پیاری کرن کی شہزادی ماریہ نذیر اتنا بڑا دکھ اپنے اندر چھپا کر بیٹھی تھی اور ہم ان کی انٹری نا پا کر ان سے خفا تھے۔ ماریہ امی کی ڈیتھ کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ کاش اس لمحے ہم آپ کے ساتھ ہوتے، آپ کو دلاسا دیتے۔ میں بھی اپنے ابو کی لاڈلی بیٹی تھی، ان کے جانے کے بعد جیسے جینے کی آرزو نہ رہی مگر یہ زندگی بڑے امتحان لیتی ہے۔ ماریہ، یقین ملیے میرے بھائی کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی ہیں، ہر روز شاپنگ کرنے جاتے ہیں مگر آج سر درد کا بہانا کر کے خط لکھ رہی ہوں تو صرف آپ کی خاطر...... آخر کار آپ میری بیسٹ فرینڈ ہو۔ میں آپ کا دکھ کم تو نہیں کر سکتی مگر بانٹ تو سکتی ہوں نا۔ ''فیس بک'' ماہی خان سے ملاقات کافی زبردست لگی۔ آپ کا میسج پڑھ کر بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اچھا اب ذرا بشریٰ یامین اور عاصمہ یامین کی بھی خبر لوں۔ یار بشریٰ! بھائی کی شادی میں بہت سارے کپڑے لیے ہیں تو مائنڈ اٹ پلیز۔ اور دوپٹا بھیج رہی ہوں...... آمنہ یامین! آپ کو کرن میں ویلکم (آمنہ، ثوبیہ) ہم بھی آپ کی طرح دو بہنیں (سلمیٰ) ایک ساتھ (دو بھائی) سے شادی ہوئی ہے اور آج سلمیٰ ہم سے لڑ پڑی دیکھو ان بہنوں میں کتنا پیار ہے۔ تم بھی آج ہمارا نام لکھ دو۔ آخر کار ہم بھی تو کرن پڑھتے ہیں۔ تو سلمیٰ جانو دل تھام لو، کرن میں تمہارا بھی نام جگمگا رہا ہے۔ ایک بار پھر شکوہ شاہین آپی پلیز ابرار الحق سے ملاقات کرائیں نا پلیز۔ ''کنار خواب جو'' یہ سوار اتنا کم عقل کیوں ہے، پہلے شازمہ اب ثمامہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ سوار بھاؤ کچھ تو عقل کے ناخن لو۔ یار ارسلہ، تم ہم کو بہت پیاری لگتی ہو اور تمہارا، انجام بہت برا ہو گا، یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ آہ...... تم نے تو کہا تھا کہ سر درد ہے، اس لیے شاپنگ نہیں چلیں اور یہ (کتاب) کرن لے کر خط لکھ رہی ہو۔ یہ امی اچانک کیسے آ گئیں۔

☆ساجدہ جی! بھائی کی شادی مبارک ہو۔

☆☆

سروے

خواتین کا عالمی دن...... شاہین رشید
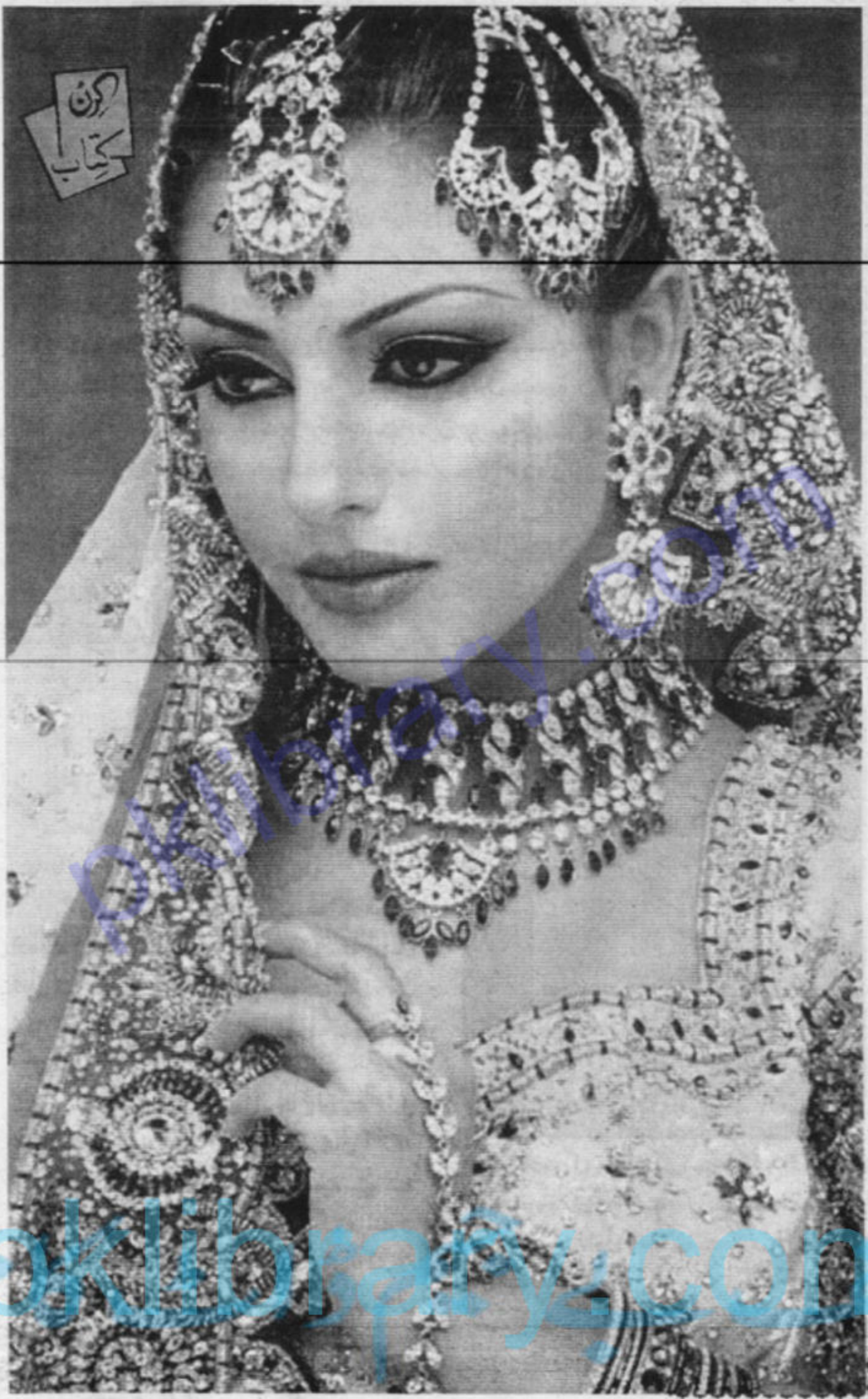
شہر کا تبدیل ہونا، شاد رہنا اور اداس
رونقیں جتنی یہاں ہیں عورتوں کے دم سے ہیں

8مارچ خواتین کا عالمی دن...... خواتین ہر میدان میں نمایاں ہیں۔ مرد کے شانہ بشانہ چلنے والی عورت کو کیا ایک مرد نے تمام حقوق دیے۔ حقوق دینے کی ذمہ داری صرف شوہر پر نہیں ہوتی۔ باپ، بیٹے اور بھائی پر بھی ہوتی ہے۔ شہری عورت جاب کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی ہے اور گاؤں دیہات کی عورت کھیتوں میں اور گھر میں بیٹھ کر سلائی کڑھائی اور دیگر کاموں سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔ بچوں کی تربیت سے لے کر کھانا پکانے اور گھر کے تمام کاموں کو خوش اسلوبی سے نبھانے والی عورت کو کیا وہ مقام حاصل ہے۔ جس کی وہ مستحق ہے......

8مارچ کے حوالے سے ایک سروے حاضر خدمت ہے اور اس سروے میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی ہے اور وہ یہ کہ عورت کتنی ہی خودمختار کیوں نہ ہو جائے، مرد سے مقابلہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔

سوال:۔

1۔آپ نے اپنی زندگی میں باپ، بھائی، بیٹے اور شوہر...... کس کو اپنے حقوق کے لیے سب سے زیادہ ڈنڈی مارتے ہوئے دیکھا؟

2۔کوئی ایک گلہ، کوئی شکایت جو آپ کو اپنے ان رشتوں میں سے کسی کے ساتھ ہو؟

عمرانہ مقصود......رائٹر

1۔کسی کی خاطر انہوں نے (انور مقصود صاحب) میرے حقوق نہیں مارے۔ کبھی مجھے کم نہیں سمجھا...... اور اگر کسی کے ساتھ زیادہ کیا ہے تو وہ اس وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس بات کو میں کبھی بھی نگیٹیو نہیں لوں گی۔

2۔کوئی رشتہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے شکایت نہ ہو اور مجھے کسی سے شکایت ہوتی ہے تو پہلے میں اسے تول لیتی ہوں کہ جس سے مجھے شکایت ہے اس میں اچھی باتیں زیادہ ہیں یا بری باتیں...... اگر دو چار بری باتیں ہیں تو پھر اچھی باتیں بری باتوں پر حاوی ہو جاتی ہیں...... تو اس لیے میں کسی ایک کا نام نہیں لوں گی۔ بھائیوں سے تھوڑی بہت شکایت ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ بھائی آخر کار ایک اور گھر بنا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے بیٹے سے شکایت اس لیے نہیں ہے کہ بیٹا گھر بنا کے بھی میرے ہی گھر میں ساتھ رہتا ہے اور جو حقوق اس کے ہیں، انہیں وہ پورے کرتا ہے اور بیٹی اپنے حقوق پورے کرتی ہے۔ اول

تو مجھے شکایت کسی سے بھی نہیں ہے...... مگر تھوڑی دوری میں کچھ نہ کچھ فرق آ جاتا ہے، اس لیے اسے شکایت نہیں بنانا چاہیے، یہ تو زندگی کا اسٹائل ہے۔ اگر میرا بھائی اپنی بیوی سے زیادہ اپنی بہن سے پیار کرے گا تو بیوی خوش نہیں رہے گی۔ اسی طرح اگر کوئی بیٹا اپنی ماں سے زیادہ

پیار کرے گا تو بیوی خوش نہیں رہے گی۔ ہر رشتے کے ساتھ ایک ایسا رشتہ بندھا ہوتا ہے، جس کو سب سے زیادہ توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ اگر میرا بیٹا یا میرا بھائی اپنی بیوی کو ٹائم نہیں دے رہا تو میں شکایت کروں گی۔ میرا بیٹا، میرا شوہر مجھے وقت دے رہے ہیں تو میں کیوں کچھ کہوں گی۔ اور جتنا جس کے پاس ہوتا ہے وہ بانٹ ہی دیتا ہے...... اور جو اگر کسی کو ٹائم نہیں دیتے، تو پھر وہ کسی کو بھی ٹائم نہیں دیتے۔

شگفتہ بھٹی...... رائٹر

1۔ الحمد للہ مجھے باپ، بھائی، بیٹے اور شوہر کے جو رشتے ملے وہ سچے اور کھرے ملے ہیں۔ میرے والد بھی میرے بہترین دوست اور خیر خواہ تھے۔ میرے شوہر بھی ہر کام میں میرے معاون رہے۔ ہر رستے پر، ہر جگہ میرا ساتھ دیا اور اگرچہ میں بیمار ہوں مگر میرے بیٹے مصروفیات کے باوجود میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میرا احساس کرتے ہیں۔ میرے ساتھ رہتے ہیں بیٹیوں کی طرح...... اللہ تعالیٰ ان رشتوں کو سلامت رکھے۔ میرے بھائیوں کو سلامت رکھے۔ کیونکہ وہ دنیا کے بہترین بھائی ہیں۔ ایسے بھائی ہیں جو اپنی بہنوں کے لیے بہت براڈ مائنڈڈ ہوتے ہیں۔ عزت مند ہوتے ہیں، ان کے ہمدرد ہوتے ہیں اور وہ اگر زندگی کی رفتار میں آگے بڑھنا چاہتی ہیں تو ان کے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

2۔ ہاں...... مجھے گلہ ہے تو اپنے شوہر بابر سے ہے۔ اگرچہ انہوں نے حقوق ادا کرنے میں کوئی ڈنڈی نہیں ماری، مگر...... گلہ یہ ہے کہ تعلیم کے لحاظ سے بابر کیمیکل انجینئر ہیں...... لیکن یہ اپنے شعبے میں نہیں گئے۔ بزنس کا شوق تھا۔ کاروبار کیا مگر کاروبار کرنا نہیں آیا اور میں انہیں سمجھاتی رہی کہ کاروبار چھوڑ دیں، آپ سے یہ کام نہیں ہوگا۔ اگر وہ اپنی تعلیم کے حساب سے جاب کر رہے ہوتے تو شاید آج ہمارے حالات بہت مختلف ہوتے اور میں اس حوالے سے سب سے کہنا چاہوں گی کہ ہمارے بھائی جن کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو انہیں چاہیے کہ ان پر خاندان کی جو مالی ذمہ داری ہوتی ہے، اس کا خیال رکھتے ہوئے اپنی فیملی کے ساتھ، اپنے دوستوں کی خاطر یا دوسروں کا فائدہ کرنے کے لیے، دوسروں کا بھلا کرنے کے لیے ان کے ساتھ ڈنڈی نہ مارا کریں۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ فیملی کو اور بڑا نقصان ہوتا ہے۔ بڑے خلاء آ جاتے ہیں زندگی میں، بڑی پریشانیاں آ جاتی ہیں۔ بابر بہت اچھے ہیں اور ان میں اتنی زیادہ اچھائیاں ہیں کہ ان کی چھوٹی سی کوتاہی یا "بھول پن" اس کو میں ہمیشہ معاف کر دیتی ہوں۔ باقی اللہ کا شکر ہے۔

شازیہ انور...... ایڈیٹر، کالم نگار، ہم ٹی وی

1۔ کسی کو بھی نہیں...... ہم چھ بہنیں ہیں۔ بھائی نہیں ہے۔ اس لیے گھر میں اپنے والد کو دیکھا جنہوں نے بہ حیثیت باپ اپنی بیٹیوں کے لیے اپنے حقوق بھی فراموش کر دیے۔ ہمارے والد نے اپنی ساری بیٹیوں کو یکساں عزت و محبت دی، خیال رکھا...... اور ہمیں وہ بھی دیا جس کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں لگتا ہے کہ ابو نے فلاں کے لیے تو "یہ" کیا...... اور ہمارے لیے نہیں کیا۔ لیکن بہت ہی جلد پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ہمارے لیے اس سے بھی اچھا سوچ رکھا ہے...... تو کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ شوہر الحمد للہ ہر قدم پر ساتھ ہیں۔ میاں بیوی کے رشتے میں اونچ نیچ ہوتی رہتی

ہے۔ لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ سامنے والا آپ کا ساتھ دے۔ ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ شوہر حضرات کے پلڑے میں جب بیوی اور ماں آتے ہیں تو جھکاؤ ''ماں'' کی طرف ہوتا ہے۔ خواہ بیوی حق پر ہو یا نہ ہو۔ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا کیونکہ یہ ہمارا مائنڈ سیٹ ہے کہ اگر ماں کو کچھ کہیں گے تو اللہ کے ہاں پکڑ ہو گی...... کیونکہ ماں کے بے حد حقوق ہیں۔ جبکہ حق تلفی کسی کی بھی ہو اللہ کے ہاں جواب دہی تو کرنی ہی پڑے گی۔ اور یہ مائنڈ سیٹ عام طور پر ازدواجی زندگی میں الجھنوں کا سبب بنتا ہے۔ انصاف سے کام لیں تو نہ بیوی کی دل شکنی ہو گی اور نہ ہی ماں کے احترام میں کوئی کمی آئے گی۔ اب بات کرتے ہیں بیٹے کی تو وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ دس سال کی عمر میں اس کے بہت سارے حقوق ہیں اور میرے فرائض...... تو ابھی تو ادائیگی فرض کا سلسلہ جاری ہے جب حقوق کی باری آئے گی تو دیکھیں گے۔ تاہم مجھے اس سے کوئی توقع نہیں ہے۔ توقعات پوری نہ ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے اور میں اپنی اولاد کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں اٹھانا چاہتی۔ اگر وہ فرائض سمجھے گا تو حقوق بھی ادا کر ہی دے گا اور دیکھیے کہ میری تربیت کیا رنگ دکھاتی ہے۔

2۔ مجھے اپنے والد، اپنے شوہر اور اپنے بیٹے تینوں سے ایک ہی گلہ ہے...... اور وہ یہ کہ تینوں کو اظہار کرنا نہیں آتا۔ میرے والد نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، میری خوشیوں کو مقدم رکھا۔ لیکن کبھی زبان سے اظہار نہیں کیا۔ ان کا ہر عمل چیخ چیخ کر ان کی محبت کا ثبوت دیتا ہے لیکن زبان سے کبھی اظہار نہیں کرتے، بس پسند ناپسند کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جبکہ میرے شوہر ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ انتہائی محنت سے پکایا گیا کھانا انہیں پسند آیا ہے یا نہیں، اس بات کا اندازہ ان کی کھائی گئی روٹیوں کی تعداد سے لگانا پڑتا ہے۔ میرا بیٹا مجھے بے حد پیار کرتا ہے۔ میری چھوٹی سی تکلیف میں مجھ سے پہلے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ لیکن اظہار محبت ندارد......

صاحبو! پیار کے اظہار سے رشتوں کی ڈور مزید مضبوط ہو جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مسکراہٹ، ایک چھوٹا سا جملہ زندگی میں رنگ بھر دیتا ہے۔

ربیعہ اکرم...... پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن

1۔ کسی بھی رشتے کو حقوق میں ڈنڈی مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ الحمدللہ بلکہ حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے ہی پایا۔

2۔ کوئی شکوہ...... کوئی گلہ...... نہیں بس دعا ہے کہ میرے ان تمام رستوں کو حقوق العباد کی ادائیگی میں توازن قائم کرنے میں ہمیشہ اللہ کی مدد حاصل رہے، آمین۔

صدف آشان......فنکارہ + پروڈیوسر

1۔ جو جواب میں آپ کو دوں گی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے...... کیونکہ میں، میں تو مکمل طور پر انڈی پینڈنٹ ہوں۔ میں نے آج تک نہ اپنے والد پر انحصار کیا، نہ اپنے بھائی پر اور نہ ہی اپنے شوہر پر۔ جو کچھ بتاؤں گی اپنے مشاہدات پر بتاؤں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ سب سے زیادہ حقوق میں ڈنڈی بھائی مارتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سرور جوان سے کنیکٹڈ ہوتا ہے وہ آپ کی "بھابھی" ہوتی ہیں۔ جو آپ کے لیے ذمہ دار نہیں ہوتیں۔ وہ احساس نہیں دلاتیں اور ان میں احساس ذمہ داری سب سے کم ہوتا ہے۔ کوئی بہت ہی اچھا بھائی ہو تو وہ تمام حقوق ادا کر دیتا ہے۔ ورنہ عید پر ایک جوڑا دلانا یا مہینوں بعد ایک فون کر لینا، وہ اسی کو سمجھتا ہے کہ میں نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ والد کے بعد اور بہن کی شادی سے پہلے بھائی کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ بھائی کے بعد میں نے دیکھا ہے شوہر کو کیونکہ آپ جتنا پریشر کسی پر ڈال سکتے ہیں یا احساس دلا سکتے ہیں، وہ آپ ہی ہوتے ہیں اور اس کے لیے انتہائی چالاک ہونا ضروری ہے...... اور تھوڑا سا بے شرم ہونا بھی ضروری ہے کہ آپ ہر بات پر ہاتھ پھیلا سکیں اور بول سکیں تو جو خواتین اس کام میں اچھی ہوتی ہیں وہ اپنے حق وصول کر لیتی ہیں ورنہ زیادہ تر خود کام کرنے نکلتی ہیں یا صبر کا گھونٹ پی کر آخرت میں اچھے صلے کی امید کرتی ہیں۔ میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو اپنا "حق مہر" بھی معاف کر رہی ہوتی ہیں۔ شوہر حقوق کیا ادا کرے گا وہ تو بروقت حق مہر بھی ادا نہیں کرتا۔ اور اب آئیے باپ پر...... باپ بھی غیر ذمہ دار ہوتا اگر اس کے ساتھ اس کی بیوی یعنی بچوں کی ماں کنیکٹڈ نہ ہوتی...... اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں باپ ہی وہ شخصیت ہے جو آپ کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔ بہت کم کیسز ایسے ہوتے ہیں جہاں باپ اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتا۔ لیکن وہ سب سے زیادہ غیر ذمہ داری کا ثبوت اس وقت دیتا ہے، جب اس کی بیٹی بڑی ہوتی ہے اور وہ یہ جانے بغیر کہ میری بیٹی اس شخص کے ساتھ مالی طور پر، جذباتی طور پر یا ذہنی طور پر اس کے ساتھ خوش رہے گی یا نہیں۔ صرف اس لیے بیٹی کی شادی کر دیتا ہے کہ ایک تو اس کی شادی کی عمر ہو گئی ہے اور دنیا پریشر کری ایٹ کر رہی ہے تو اس کی شادی کر دو۔ نصیب اچھے ہوں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ بیٹا اب اس گھر سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے اور ایک باپ کی یہ سب سے بڑی غیر ذمہ داری ہے۔ جو کہ نہیں ہونی چاہیے۔ باپ کو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ یہ میری بیٹی ہے اور تا قیامت میری ہی بیٹی رہے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوتا...... صرف صبر کی تلقین کی جاتی ہے۔ جبکہ صبر یہ ہے کہ اگر خدانا خواستہ آپ کا شوہر بیمار ہے اور اچانک بیمار ہوا ہے جبکہ وہ پہلے اچھا کما رہا تھا، آپ کے حقوق پورے کر رہا تھا تو اس عورت کو لازمی صبر کی تلقین کریں۔ لیکن اگر وہ آپ کو مار رہا ہے، کوٹ رہا ہے، آپ کی ضروریات زندگی پوری نہیں کر رہا اس پر صبر کی تلقین کرنا یہ غیر ذمہ داری ہے...... اور چونکہ مرد کا معاشرہ ہے تو غیر ذمہ داری بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اگر مرد کی کوئی بھی صورت حال انتہائی ذمہ دار ہوتی تو آج آپ اتنی خواتین کے گھر سے باہر کام کرتے ہوئے نہ دیکھ رہی ہوتیں۔

2۔ اب تک جو باتیں کیں وہ سب میرا تجزیہ ہے۔ کیونکہ میں نے تو آج تک کسی سے امید ہی نہیں رکھی اور میری دعا ہے کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں اس وقت بھی لوگوں کو میری ذات سے فائدہ ہو رہا ہو۔ میرا

کام کسی کو نہ کرنا پڑے بلکہ میں ہی لوگوں کے کام کرتی ہوئی جاؤں۔ میرا کرنے والا کوئی نہ ہو، حتیٰ کہ میری اولاد بھی...... میں ذرا باغی قسم کی ہوں، میری سوچ ہی الگ ہے۔

عفت سحر طاہر......رائٹر

1۔میں کیا لکھوں...... میرے ابو کی وفات ہو چکی تھی، جب میں صرف دس سال کی تھی۔ دادا ابو نے ہم سب کو بہت لاڈوں سے پالا اور بھائی باپ بن گئے الحمدللہ۔ شوہر ملا تو اللہ کی مہربانی سے نرم خو، محبت کرنے والا۔ ڈنڈی تو کسی نے نہیں ماری، حقوق و فرائض کی ادائیگی میں...... اس لیے دوسرے سوال کا جواب ہی نہیں میرے پاس۔ الحمدللہ کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔

شبنم ثانی......رائٹر+فنکارہ

1۔سب ہی کو ڈنڈی مارتے ہوئے دیکھا۔ کوئی بھی رشتہ ایسا نہیں ہے جو عورت کو اس کے پورے حقوق

دے سکے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت بہت زیادہ ڈیمانڈنگ ہوتی ہے۔ بس جو عورت کمپرومائز کرتی رہتی ہے، مرد اسے سراہنے کے بجائے اسے "دباتا" چلا جاتا ہے۔ وہ چاہے کوئی بھی رشتہ ہو، مرد کو کبھی بھی خود سے احساس نہیں ہوتا کہ وہ غلطی پر ہے۔ اگر اسے احساس دلایا جائے تو وہ خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش میں سارے رشتے تباہ کر دیتا ہے۔ حقیقت یہی ہے، باقی سب کا اپنا تجربہ ہوتا ہے۔ کچھ مرد تو مثالی ہوتے ہیں یا بظاہر نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ جیسے دور سے چمکنے والی ہر چیز سونا دکھائی دیتی ہے۔ آج کا مرد حضورﷺ کے پیروں کی دھول بھی نہیں ہے...... مگر عورت کو اگر اپنے رب کو راضی رکھنا ہے تو پھر اسے ہر بات کو درگزر کر کے رشتوں کو پامال ہونے سے بچانا ہے۔ انا اور خود پسندی مردوں کا ہتھیار ہے۔ انہی پر جچتا بھی ہے اور اس کا احساس بھی انہی کو دینا ہے۔ عورت اپنی سیلف ریسپیکٹ رکھتے ہوئے ان رشتوں کو نبھاتی ہے اور اسی میں اس کی کامیابی اور بھلائی ہے۔

2۔ دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں ہی ہے۔

ہما ارسلان......اینکر سچ ٹی وی

1۔ابو میرے حیات نہیں ہیں۔ لیکن شکر الحمدللہ ان کے ساتھ جتنا بھی ٹائم گزرا، انہوں نے ہمیشہ میری بہن کو اور مجھے بھائیوں پر فوقیت دی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیٹی ہونے کی وجہ سے ہمیں لیٹ ڈاؤن کیا گیا ہو۔ جیسا کہ عموماً دیگر گھروں میں ہوتا ہے اور دیکھا بھی گیا ہے۔ ہمیشہ ہم بیٹیوں کے حقوق پورے ہوئے۔ ہماری ہر آرزو، ہماری ہر خواہش، ہمارے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری

ہوئی اور بہت اعتماد دیا۔ اسی طرح میرے بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں اور...... تینوں بھائی میری بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمیشہ میری بات مانتے ہیں۔ مجھے مشورہ اور رائے بھی دیتے ہیں...... اور اگر شوہر کی بات کروں تو پھر وہی بات کروں گی کہ الحمدللہ...... الحمدللہ...... میں خوش قسمت ہوں کہ شوہر بھی ان سب سے آگے نکلے۔ بہت اچھے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ جو بات میں کہوں وہ پوری کریں۔ اور ماشاءاللہ بہت خیال رکھتے ہیں۔

2۔ کسی سے کوئی شکوہ...... کوئی گلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے ان رشتوں کو خوش رکھے۔ زندگی دے، صحت دے، آمین۔ اور میرے والد جنہوں نے محبت کا بیج بویا ان کی وفات کو گیارہ سال ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔

فضیلہ قیصر...... پروڈیوسر + فنکارہ

1۔ گلے شکوے...... حقوق کی پاسداری نہ

کرنا۔ یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ کوئی فرشتہ نہیں ہوتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت...... تو زندگی میں یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ گھر کی باتیں گھر میں رہیں تو بہتر ہے اور رشتوں کی کشش بھی اسی میں ہے کہ کبھی روٹھوں کو منائیں تو کبھی کوئی ہمیں منائے۔

ہما کاشف...... آر جے ”آواز کی دنیا“

1۔ نہیں...... کسی کو بھی حقوق میں ڈنڈی مارتے

ہوئے نہیں دیکھا۔ گھر میں سب سے زیادہ بھائی سپورٹیو ہیں ماشاءاللہ سے۔ اور ”یہ“ بات کو دیر سے سمجھتے ہیں۔

صدف آصف...... رائٹر + ہوسٹ

1۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے کئی روپ ہیں۔ بلکہ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو خوب صورت رتبوں سے نوازا ہے۔ ماں،

بہن، بیٹی اور بیوی...... اور ہر روپ میں عورت نے مردوں کے مقابلے میں اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔ ماں کے روپ میں اپنے بچوں کی جنت...... بیٹی کے روپ میں رحمت...... بہن کے روپ میں محبت کی بہترین مثال اور بیوی کے روپ میں زندگی بھر شوہر کا ساتھ نبھانے والی۔ غرض یہ کہ عورت کا ہر روپ مثالی ہے...... تو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر میں اپنی تمام ساتھی بہنوں کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتی ہوں۔ میں پاکستان کی ان چند خوش قسمت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی میں سے ہوں جسے ہر مقام پر اپنے گھر کے مردوں کی حوصلہ افزائی حاصل ہوئی۔ اور اگر ان سب رشتوں سے ایسی شفقت، محبت اور عزت نہ ملتی تو شاید میں آج اتنی پرسکون، کامیاب اور خوش گوار زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔ رشتوں نے میری حیثیت سے بڑھ کر پیار و محبت سے نوازا۔ اس لیے کوئی شکایت نہیں۔ مگر مردوں کے اس معاشرے میں خواتین کو اب بھی بہت سے مسائل اور صنفی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی کاروکاری، وٹہ سٹہ، ونی اور ستی جیسے جاہلانہ رواج عروج پر ہیں۔ لڑکیوں پر فقرے کسنا، مذاق اڑانا، سوشل میڈیا پر ان کی تصاویر جاری کرنا، انہیں بلیک میل کرنا اور غیر اخلاقی الفاظ کا استعمال کرنا روز کا معمول بن چکا ہے۔ یہاں بھی دور جہالت کے پیروکار موجود ہیں۔ ان کی درندگی سے معصوم بچیاں محفوظ نہیں۔ 8 مارچ کا بنیادی پیغام دینا چاہوں گی۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان خاندان، برداری اور ریاست کے یکساں سلوک سے ہی خواتین کی پسماندگی دور ہو سکتی ہے۔

نزہت سمن...... رائٹر، فطرت + دیگر

1۔ شکر الحمدللہ۔ میرے لیے یہ تینوں ہی رشتے اللہ کی رحمت ثابت ہوئے۔ باپ نے میری ہر خواہش پوری کی، مجھے زندگی کا سامنا کرنا اور ہر محاذ پر لڑنا سکھایا۔ میری صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے ہمیشہ سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور ہر ممکن

تعاون کیا۔ ان کے بعد میرے شوہر نے باپ کے عطا کیے گئے اعتماد کو اپنی محبت سے اور مضبوط کیا اور میرے ہر شوق کی پذیرائی کی۔ میری کامیابیوں سے ہمیشہ خوش ہوئے۔ والدین کی جلدی وفات کی وجہ سے میرے بھائی بہنوں کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے ہمیشہ ہمارے ساتھ کھڑے رہے اور مجھ سے زیادہ ان کا خیال رکھا۔ میرا اکلوتا، ہم سب بہنوں کا ہر دم خیال رکھنے والا اور ایک آواز پر بھاگا چلا آنے والا ایک مثالی بھائی ثابت ہوا اور میرے اس بھائی نے ہمیشہ ہمیں ہمارے حق سے زیادہ دیا۔

2۔ والد مرحوم سے تو نہ کبھی شکایت تھی اور نہ ہی کوئی گلہ اللہ انہیں اس جہاں میں بلند مقام عطا کرے، آمین۔ میاں صاحب سے صرف ایک شکایت ہے اور رہے گی کہ میرے لیے ان کے پاس وقت بہت کم رہا۔ کاروباری مصروفیات میں ہمیشہ دلاسے دیتے رہے کہ اب سارا وقت تمہارا...... مگر وہ وقت کبھی نہیں آیا...... کہ ہم ساتھ مل کر شہر سے باہر کہیں جاتے اور بہت سا وقت ایک ساتھ گزارتے اور بھائی بے چارہ تو چار بہنوں سے چھوٹا اور ایک سے بڑا ہے تو چار کی تو ہمیشہ فرماں برداری کی اور کبھی شکایت کا موقع نہ دیا اور چھوٹی بہن کے ہمیشہ ناز اٹھائے۔

اقصیٰ شہزاد

س: "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟"

ج: "میں تو جی جینے کے لیے ہی کھاتی ہوں لیکن کچھ لوگوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ صرف کھانے کے لیے ہی جی رہے ہیں، ہاہاہا۔"

س: "گھر کا کام کاج خاص کر کچن میں آپ کو کسی حد تک دلچسپی ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟"

ج: "باقی تو میں سارا کام کر لیتی ہوں لیکن کچن کے...... خصوصاً کھانا پکانا مجھ سے نہیں ہوتا اور نہ کبھی امی کہتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جب میری شادی کا سوچ لیں تو پھر نصیحتیں کرتی رہتی ہیں اور غصہ ہوتی رہتی ہیں، ہاہاہا۔"

س: "ضروری نہیں کہ کھانا اچھا ہی بنے، کبھی نتائج برعکس ہوتے ہیں تو گھر والوں کا کیا تبصرہ ہوتا ہے؟"

ج: "میں نے لگاتار کبھی نہیں کھانا بنایا اور ویسے بھی جب غلطی سے (آہم) بنا بھی لوں تو اور کسی کو پسند آئے نہ آئے ہمارے ابا جی کو آجاتا ہے اور ہم اسی پر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ باقی سب کی خیر ہے، ہاہاہا۔"

س: "اگر کھانا آخری مراحل میں ہو اور پڑوسن ملنے آجائے تو ایسے میں کیا کرتی ہیں؟"

ج: "میں کون سا کھانا بناتی ہوں جو پڑوسن کے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں ملے گا، ہاہاہا۔ ویسے ہمارے پڑوسی اتنے فارغ نہیں ہیں، ہاہاہا۔ آگے سمجھ جائیں۔"

س: "عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "ان" کے دل میں اترنے کا راستہ معدہ سے ہو کر گزرتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

ج: "جناب ابھی تک تو "ان" کے ملنے کے دور دور تک کوئی چانس نہیں ہیں، اگر ملے تو پھر ضرور بتاؤں گی کہ "ان" کے دل تک پہنچنے کے لیے کیسے انٹری ماری، ہاہاہا۔"

س: "پہلی دفعہ کچن میں قدم کب رکھا اور کیا چیز بنائی؟"

ج: "کچھ یاد نہیں کب۔ ویسے امی تو زبردستی کچھ نہ کچھ پکواتی رہتی ہیں اور جب میں کچھ بنا رہی ہوں تو بھابھی آ کے اٹھا دیتی ہیں اور میں آرام سے اٹھ بھی جاتی ہوں، ہاہاہا۔ بقول امی کے، یہ تو شکر کر رہی تھی کہ کوئی آئے۔"

س: "لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟"

ج: "لوگوں کو پتا ہی نہیں کہ میں کیا کچھ بنا لیتی ہوں۔ ویسے آپ مجھے بالکل ہی اناڑی نہ سمجھیے گا۔ کچھ نہ کچھ تو بنا لیتی ہوں لیکن دل نہیں کرتا کچھ بنانے کو، ایک بار میں نے اکیلے میں سموسے بنائے تھے، اس کا طریقہ پھر کبھی بتاؤں گی، ہاہاہا۔"

س: "پہلی ڈش کون سی بنائی؟ اور گھر والوں نے کیا تبصرے تھے اس ڈش پر؟"

ج: "پہلی دفعہ تو یاد نہیں کہ کب...... ہاں ایک بار آلو بنائے تھے، پتا نہیں کیسے۔ وہ میرے ابا کو پسند آئے، بعد میں بھی کہتے تھے کہ اقصیٰ ویسے دوبارہ بناؤ اور مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ کیسے بنائے تھے۔ وہ تو بائی چانس بن گئے تھے۔"

س: "ایسے مہمان جن کی آمد ناگوار گزرتی ہو تو ان کی خاطر داری کیسے کرتی ہیں؟"

ج: "مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ سو بار آئیں، ست بسم اللہ۔ ویسے تو میں ان سے مل کر کمرے میں چلی جاتی ہوں لیکن اگر کوئی خاص مہمان (آہم) ہو تو ان کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہوں۔ امی کہتی رہتی ہیں کہ اقصیٰ! جاؤ چائے وغیرہ لے کر آؤ اور مہمان...... رہنے دو۔ اور میں خوش ہو جاتی ہوں کہ زحمت سے بچ گئے، ہاہاہا۔ لیکن امی بنوا کے ہی چھوڑتی ہیں۔"

س: "کون سی ڈش دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو غصہ آجاتا ہے؟"

ج: "جو ابا کو پسند وہ ہمیں نہیں اور جو ہمیں پسند وہ ابا جی کو نہیں۔ جس وجہ سے گھر میں بڑا رولا ہوتا ہے۔ ویسے پکی ابا کی پسند ہی ہے، تب ہماری شکلیں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔"

س: "گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش جسے پکانا ناگوار گزرتا ہے؟"

ج: "ہمیں تو آسان سے آسان ڈش بھی پکانا ناگوار گزرتی ہے۔ بھئی کون آگ جلائے، اگر گیس ہوتی تو پھر ہنسی خوشی سب کر لیتے۔"

س: "آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش؟"

ج: "کوئی ایک نہیں ہے۔ ہر گھر کی الگ الگ ڈشز ہیں۔ بس جو جس کو پسند وہ ہی اسپیشل۔"

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

جوجہ کباب ♦ دودھ جلیبی کسٹرڈ
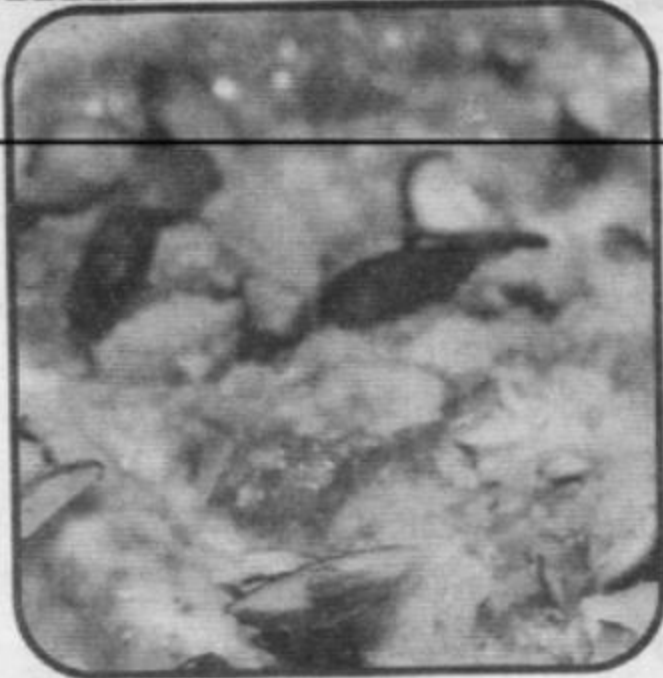
اجزاء:۔

چکن (بون لیس، چھوٹی بوٹیاں)	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
مایونیز	دو کھانے کے چمچے
پیپریکا	آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
زعفران	چند ریشے
لال شملہ مرچ	ایک کپ
سبز شملہ مرچ	ایک کپ
پیاز	ایک عدد

ترکیب:۔

یہ ایرانی ڈش ہے، اسے بنانے کے لیے ایک پیالے میں چکن، دہی، مایونیز، کریم، نمک، سرکہ، پیپریکا، کالی مرچ، ہلدی، زعفران ڈالیں۔ پھر اس میں پیاز اور تمام شملہ مرچوں کو سلائس میں کاٹ کر اچھی طرح مکس کریں۔ اب اسے رات بھر یا کم از کم پانچ سے چھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھیں۔ پھر میرینیٹ کیا ہوا چکن، شملہ مرچیں اور پیاز سیخ پر لگائیں۔ اب ایک پین میں کھانے کا تیل گرم کر کے اس پر سیخیں رکھیں۔ پھر درمیانی آنچ پر اس وقت تک پکنے دیں جب تک چکن گل نہ جائے۔ تب تک سیخوں کو وقتاً فوقتاً پلٹتی رہیں۔ ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔ اس ڈش کو ایرانی زعفرانی کباب بھی کہا جاتا ہے۔
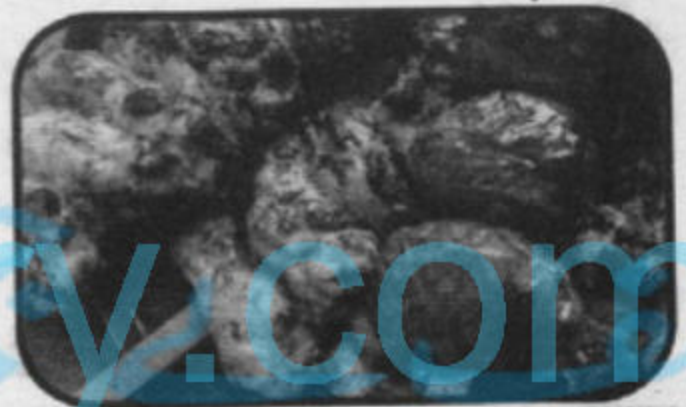
اجزاء:۔

دودھ	ایک لیٹر
جلیبی	ایک پاؤ
انڈے کی زردی	تین عدد
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
فریش کریم	ایک کپ
بھنے ہوئے بادام	چار کھانے کے چمچے
کسٹرڈ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے

اگر چاہیں تو اپنی پسند کے مزید میوہ جات بھی شامل کر سکتی ہیں۔

ترکیب:۔

دودھ کو ابال لیں۔ چند منٹ مزید پکانے کے بعد اس میں سے آدھا دودھ نکال لیں۔ اس کے بعد دودھ میں جلیبیاں شامل کر دیں۔ اب باقی دودھ میں انڈے کی زردی، فریش کریم، ونیلا ایسنس اور کسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر پھینٹ لیں۔ پھر اس میں جلیبی والا دودھ بھی شامل کریں اور گاڑھا ہونے تک پکا لیں۔ اس کے بعد ایک ڈش میں نکال کر اوپر سے بادام ڈالیں اور قدرے ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔